آئتماتوف . اناں
کوژیونیکوف . ریتھیو . کازاکوف
دروتس . شوکشین . دروزد . اسکندر
شیم . بیلوف . پلاتونوف

بادبان

جدید سوویت کہانیوں کا مجموعہ

بادبان

جدید سوویت کہانیوں کا مجموعہ

c/o FOUNDER

دارالاشاعت ترقی
ماسکو

پیش لفظ از چنگیز آئتماتوف

ترجمہ : حبیب الرحمن

ПАРУСА

СОВРЕМЕННЫЙ СОВЕТСКИЙ РАССКАЗ

На языке урду

سوویت یونین میں شائع شدہ

П $\frac{70302-154}{014(01)-77}$ 626—76

فہرست

صفحہ

پیش لفظ

ادب — کیا ہے اور کیوں ہے ؟ تمام قوموں میں ہر زمانے میں ایک بات مشترک رہی ہے یعنی دوسروں کو دلچسپ اور خیالات کے لحاظ سے پرمغز اور گہرے واقعات و افکار کے بارے میں بتانا۔ اگر واقعات یا معلومات کے بارے میں کہا نہ جائے تو وہ اپنی اقدار کھو بیٹھتے ہیں۔ ان کا ہونا نہ ہونا یکساں ہے۔ دلی خیالات کا ایک انسان سے دوسرے کی طرف منتقل ہونا یہی معنی رکھتا ہے۔ وہ لفظ جو بروقت نہ کہا جائے اپنے مقصد سے محروم ہوجاتا ہے اور اپنے منصب کو پورا نہیں کرتا۔ اسی لئے ادب کا مقصد یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان واقعات، خیالات اور انسانوں کے بارے میں بروقت جانیں جو ادیب کو متاثر کرتے ہیں۔

لفظ ''بروقت،، میں متعلقہ زمانے کو سمجھنا بھی شامل ہے۔ توئن بی نے تلخی کے ساتھ کہا ہے کہ ہم ایک ہی زمانے میں رہتے ہیں لیکن ہم‌عصر نہیں

هیں ۔ اس کا تصور کرنا تلخ ہے کہ ہم‌عصر بغل در بغل رہ کر بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتے ۔

اس معنی میں ادب ایک دوسرے کو زندگی کے بارے میں بتانے کا کام کرتا ہے ۔

ہمارے کثیر قومی اور رنگارنگ ملک کا ادب اس طرح کے تجربات سے مالامال ہے ۔ ہمارے ادب میں کہانیوں کا رول بہت اہم ہے اور میں بڑے فخر کے ساتھ کہتا ہوں کہ ان کا معیار بہت بلند ہے ۔

کہانیاں ہر طرح کے افسانوی ادب کی ابتدائی صنف اور ادب کی ترقی کی سطح کی آئینہ‌دار ہوتی ہیں ۔ کہانیوں سے ہمیشہ یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی معینہ ماحول میں فنکارانہ عوامل کس تیزی کے ساتھ ہو رہے ہیں ۔

اچھی حقیقت‌پسندانہ کہانی عام طور پر ٹھوس سماجی مواد اور زمانے کے فوری مسائل سے بھرپور ہوتی ہے ۔ اسی لئے ہر ادب میں کہانی ادبی رجحانات کی نقیب خیال کی جاتی ہے ۔

میرے خیال میں کہانی ابتدا میں ہر نثر نگار کا لازمی اسکول ہوتی ہے ۔ کہانی کا فن کچھ نقاشی سے مشابہہ ہوتا ہے اور یہاں ادیب کی تخلیق اور نقاش کے فن کی سرحدیں ملتی ہیں ۔ ان دونوں میں ایک ہی جانفشانی اور اختراعی ذرائع کی کفایت کرنی پڑتی ہے اور کردارنگاری میں درستی اور صحت کا خیال رکھنا پڑتا ہے ۔ یہ طلاکاری کا فن ہے ۔ فنون کی دوسری اصناف کے مقابلے میں کہانی کی امتیازی خصوصیت اس کا محدود میدان ہے ۔

ماضی بعید سے لیکر ہمارے زمانے تک اس بات کی نشان دہی ممکن ہے کہ اس صنف نے کیسے ترقی کی، اس کے فنکارانہ خیالات اور ذرائع اظہار نے کیسے فروغ پایا۔

یہ تمام باتیں عام طور پر کہانی سے متعلق ہیں، لیکن سب سے بڑی بات کہانی اور ہر ادبی تخلیق میں وہ ہوتی ہے جو انسان کی تقدیر اور اس کے کردار کی عکاسی کرتی ہے، یعنی کہانی کا مواد۔ جو کچھ بھی میں نے ابھی تک کہا ہے ان ساری باتوں کا وجود صرف اسی لئے ہے۔ اور یہیں سے قاری کے ساتھ سب سے ضروری گفتگو شروع ہوتی ہے جو اس کی اپنی تقدیر اور اس کے اقربا اور ہم‌عصروں کی قسمت سے وابستہ ہے۔

اس مجموعے میں یہ کہانیاں جمع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری زندگی اور ہمارے لوگوں کے بارے میں ہندستان، پاکستان اور سارے اردوداں قاریوں تک معلومات پہنچیں، ان کو ہماری زندگی کے فنکارانہ پہلوؤں کا تصور کرنے میں مدد ملے۔ اس مجموعے میں بہت ہی نوع بنوع مصنفوں کی تخلیقات جمع کی گئی ہیں۔ وہ زندگی کو مختلف طور سے دیکھتے، سمجھتے اور اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔ لیکن ان میں کچھ مشترک بھی ہے جو ان کو متحد کرتا ہے — یہ ہے انسان سے محبت۔ کہانی میں چاہے کچھ بھی کہا جائے، زندگی کا چاہے جو پہلو مصنف پیش کرے، چاہے اس میں مسکراہٹیں ہوں یا تلخیاں، سوویت ادب ایک لمحے کےلئے بھی انسان کی اعلی قدر و قیمت کو فراموش نہیں کرتا۔

اور اس کے بارے میں مختلف ملکوں کے طرح طرح کے ادیب چاہے جتنا کہہ اور لکھ چکے ہوں یہ موضوع لامحدود اور لافانی ہے۔ انسان میں بھی جو بہترین صفات ہیں — اس کی نیکی، خلوص، محبت، حسن کی طرف کشش، انصاف کی پیاس، حصول علم کا شوق — یہ سب ایسی سدابہار نوعیت رکھتی ہیں کہ ان کی جستجو، مطالعہ اور تصویر کشی کی ہمیشہ ضرورت ہے۔ یہی فنکارانہ تخلیقات کو لامتناہی بناتا ہے۔

زندگی کے تقدس اور اس کے لافانی ہونے کے بارے میں دروزد کی کہانی، کازاکوف کی شفاف کہانی ''وہ اور وہ،، اور آندرئی پلاتونوف کے ہیروؤں کی اندوھگیں تقدیر چاہے جتنی جداجدا کیوں نہ ہوں اپنے مافیہ کے لحاظ سے ایک ہیں۔ اس مجموعے میں نہ‌جانے اور کتنی کہانیوں کا اضافہ کیا جا سکتا تھا!

لیکن یہی کہانیاں ہماری طرززندگی کی خصوصیات کا، خواہ وہ سماجی ہوں یا ذاتی، اندازہ لگانے کے لئے کافی ہیں۔ ہم اپنے کو ادب میں ایسا دیکھنا چاہتے ہیں جیسے ہم ہیں اور جیسے ہم ہونا چاہتے ہیں۔ ہمیں ادب کی طاقت اور اثر پر یقین ہے اسی لئے ہمارا ادب سپاٹ اور فرسودہ باتوں کی تقلید نہیں کرتا بلکہ اس میں ایسا نصب‌العین دیکھنا ممکن ہے جس کی آرزو کی جاسکتی ہے۔

ہمارے ادب کے ہیرو ہمارے ہم عصر یعنی ہم خود ہیں۔ ہمیں اپنے ہم‌عصر پر، نئی منصفانہ زندگی کی تعمیر کے لئے اس کے امکانات پر، اس کے ذہن و شعور کی ثروت مندی اور حسن پر اعتماد ہے۔

ادب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہمارے دور کی مجموعی تصویر پیش کرتے ہوئے اپنے لاجواب ذرائع سے ان لوگوں کو تعلیم دیگا جو اس دور کے خالق ہیں ، ان کو تعلیم دیگا لیکن لکچربازی نہیں کریگا۔

مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ ایک بار پھر ہندستان، پاکستان اور سارے اردوداں قارئین پر ہمارے قول و فعل کے اتحاد کو ثابت کریگا۔

چنگیز آئتماتوف

چنگیز آئتماتوف

یہ بلند قد، مضبوط اور خوبصورت انسان جس کے بہت بڑے سر کے بال کچھ کچھ سفید ہو چلے ہیں بہت ہی قدرتی معلوم ہوتا ہے، وہ پرتپاک اور پرکشش شخصیت کا مالک ہے۔ وہ معلومات کی تو انسائیکلوپیڈیا ہے اور اس کا حافظہ لاجواب ہے۔ کام کے معاملے میں وہ بےحد جوشیلا ہے۔ جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا وہ ہمیشہ ایسے ہی جوش و خروش سے کام کرتا ہے تو وہ ہنسکر جواب دیتا ہے: ''ہمیشہ، جب میں ''سونے کی کان،، پر دھاوا بولتا ہوں تو مجھ پر ایک بخار اور بےچینی سی طاری ہوجاتی ہے اور اس وقت تک رہتی ہے جب تک میں سب کچھ کاغذ پر انڈیل نہیں دیتا۔،،

لینن انعام اور ریاستی انعام‌یافتہ، قرغیزیہ کے ممتاز نثرنگار چنگیز آئتماتوف (سال پیدائش ۱۹۲۸ء) کی شہرت مدتوں ہوئے سوویت یونین کی سرحدیں پار

کر چکی ہے۔ ان کی حکایات ''جمیلہ،،، ''پہلا استاد،،، ''ماں کا کھیت،،، ''الوداع، گلسرا! ،،، ''سفید اسٹیمر،،، وغیرہ سوویت یونین اور دنیا کی قوموں کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہیں۔

آج کل چنگیز آئتماتوف کی تخلیقی صلاحیتیں پورے شباب پر ہیں۔ وہ بہت سی ایسی ادبی اصناف کو لیتے اور بخوبی نباھتے ہیں جو ان کے لئے نئی ہیں۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا آئتماتوف نے اپنا ڈرامہ '' کوہ فوجی یاما پر چڑھائی،، ختم کیا ہے جو ادیب کی تخلیقات، اس کے فن، فرض اور مقام کے بارے میں ہے۔ اس کے بعد انہوں نے پھر نئی کتاب شروع کردی۔ اس کتاب کے ٹکڑے ''لیتیراتورنیا گازیتا،، (''ادبی اخبار،،) میں اشاعت کے لئے دیتے ہوئے ادیب نے کہا: ''ابھی تک مجھے پتہ نہیں کہ میں کیا لکھ رہا ہوں۔ یہ تاریخی ناول ہے یا کہانی۔ بہرحال اس کتاب کے خاص کردار خود عام لوگ ہی ہیں۔ امید ہے کہ میری سخت محنت ثمرآور ہوگی۔،،

سپاہی کا بیٹا

پہلی بار اس نے باپ کو فلم میں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ کوئی پانچ سال کا ہوگا۔

یہ بھیڑوں کے اس بڑے سفید باڑے کی بات ھے جہاں اون اتارنے کے لئے ھر سال بھیڑوں کے گلے لائے جاتے ھیں۔ یہ سلیٹ کی چھت والا بھیڑوں کا باڑہ آج بھی اسی طرح ریاستی فارم کی بستی سے ذرا باھر، سڑک کے کنارے، پہاڑی کے دامن میں کھڑا ھے۔

یہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ آگیا تھا۔ جیئن گل ریاستی فارم کے ڈاکخانے میں ٹیلی فون آپریٹر تھی۔ گرمیوں کے موسم میں جب اون کترنے کا سیزن آتا تو جیئن گل مددگار کی حیثیت سے اون کترنے کے مرکز پر آجاتی۔ اس کے لئے وہ اپنی سالانہ چھٹیاں اور فاضل کام کے دن استعمال کرلیتی تھی جو وہ بوائی اور میمنوں کی پیدائش کے زمانے میں ڈاکخانے میں کرتی تھی۔ وہ یہاں اون کی کترائی کے آخری دن تک کام کرتی رھتی۔ یہاں اجرت کام کے حساب سے ملتی تھی،

اس لئے کمائی بری نہ تھی اور سپاہی کی بیوہ کے لئے
ایک ایک فاضل کوپک بڑا قیمتی تھا۔ اگرچہ خاندان
بڑا نہ تھا — وہ خود اور بیٹا۔ بہرحال کچھ بھی ہو
خاندان تو خاندان ہی ہے۔ جاڑوں کے لئے ایندھن
جمع کرنے کی ضرورت ہوتی تھی، گراں ہونے سے قبل
آٹا خریدنا پڑتا تھا۔ پھر کپڑوں، جوتوں اور اسی طرح
ساری چھوٹی موٹی چیزوں کی بھی ضرورت تھی ہی۔

بیٹے کی گھر پر کوئی دیکھبھال کرنےوالا نہ
تھا اس لئے وہ اس کو اپنے ساتھ کام پر لاتی تھی۔
یہاں وہ سارے دن میلا کچیلا لیکن خوش‌خرم دوڑتا
دھوپتا رہتا۔ کبھی اون کترنےوالوں میں ہے تو کبھی
گلہ‌بانوں اور جھبرے پاسبان کتوں کے درمیان دوڑ
رہا ہے۔

اس دن بیٹے ہی نے سب سے پہلے فلمی ٹرک کو
باڑے کے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا اور سب سے پہلے
تمام لوگوں کو یہ خوش‌خبری سنائی تھی کہ ”سینما
آگیا، سینما!“

کام کے بعد جب ذرا اندھیرا ہو چلا تو فلم
دکھانا شروع کیا گیا۔ اس وقت تک لڑکا بےتاب رہا۔
لیکن اس بےچینی کا اسے انعام مل گیا۔ یہ فلم دوسری
عالمی جنگ کے بارے میں تھا۔ باڑے میں ایک سمت
دو بلیوں کے سہارے پھیلی ہوئی سفید اسکرین پر جنگ
شروع ہو گئی، بندوقیں اور توپیں گرجنے لگیں،
راکٹوں کے چمکتے شعلے سیٹیاں بجاتے اور تاریکی کے سینے
کو چیرتے گزر رہے تھے جس سے دیکھ بھال کرنےوالے
دستے کے سپاہی زمین سے چپکے رہنے پر مجبور تھے۔

لیکن جب یہ شعلے ٹھنڈے پڑتے تو سپاہی پھر آگے کی طرف جھپٹتے۔ اور رات کے اندھیرے میں مشین گنیں تو ایسی تڑتڑ چل رہی تھیں کہ لڑکے کےلئے سانس لینا مشکل ہوگیا۔ یہ رہی جنگ !

وہ اپنی ماں کے ساتھ پیچھے ایک، دوسرے پر چنی ہوئی اون کی گانٹھوں پر چڑھ گیا تھا۔ وہاں سے زیادہ اچھا دکھائی دیتا تھا۔ دراصل وہ تو پہلی ہی قطار میں بیٹھنا چاہتا تھا جہاں اسکرین کے قریب ہی فرش پر ریاستی فارم کے بچے بیٹھے تھے۔ وہ ان کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن ماں نے روک دیا۔

''بس ہو چکا، صبح سے شام تک دوڑنا۔ بیٹھ میرے پاس،، یہ کہکر ماں نے اس کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔

سینما پروجکٹر کھڑکھڑاتا رہا، جنگ چلتی رہی۔ لوگ اس کو ذرا ہیجانی حالت میں دیکھ رہے تھے۔ ماں گھرے گھرے سانس لیتی رہی اور جب کوئی ٹینک ان کی طرف آتا معلوم ہوتا تو وہ خوف زدہ ہوکر بیٹے کو دبوچ کر زور سے لپٹا لیتی۔ ایک اور عورت جو ان کے قریب گانٹھوں پر بیٹھی تھی اپنی زبان سے بار بار ٹخ ٹخ کرتی اور بڑبڑاتی :

''میرے خدا، کیا ہورہا ہے، میرے خدا!،،

لیکن لڑکے کو زیادہ ڈر نہیں لگ رہا تھا بلکہ اس کے برعکس وہ بہت خوش ہوتا جب نازی سپاہی گرتے تھے اور جب اپنے سپاہیوں کے ساتھ یہ ہوتا تو وہ یہی سوچتا کہ یہ تو بعد کو اٹھ کھڑے ہوں گے۔

یوں تو جنگ میں لوگوں کا گرنا کچھ مضحکہ انگیز سا لگتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے لڑکے جنگ کا کھیل کھیلتے وقت کرتے ہیں۔ وہ بھی دوڑتے دوڑتے اسی طرح گر سکتا تھا جیسے کسی نے لنگڑی مار دی ہو۔ چوٹ تو ضرور لگتی ہے لیکن کیا ہوا۔ منٹ بھر میں اٹھ کر پھر دھاوا بول دیا اور ساری چوٹ ووٹ بھول گئی۔ لیکن فلم میں لوگ دوبارہ نہیں اٹھ کھڑے ہوئے بلکہ پڑے ہی رہے، چھوٹے چھوٹے سیاہ ڈھیروں کی طرح۔ وہ گرنے کا ایک اور انداز بھی جانتا تھا، اس طرح جب کسی کے پیٹ میں گولی لگتی ہے۔ وہ فوراً نہیں گرجاتے۔ پہلے وہ اپنا پیٹ پکڑتے ہیں، پھر دوہرے ہو کر آہستہ سے زمین پر ڈھیر ہوجاتے ہیں اور اپنی بندوق گرا دیتے ہیں۔ کھیل میں اس طرح گرنے کے بعد وہ اعلان کر دیتا تھا کہ وہ مرا نہیں اور پھر لڑائی میں حصہ لینے لگتا تھا۔ لیکن یہ لوگ تو اٹھ ہی نہیں رہے تھے۔

لڑائی جاری رہی۔ پروجکٹر کھڑکھڑاتا رہا۔ اب اسکرین پر توپچی آ گئے۔ آگ کی بارش، دھماکوں اور دھوئیں کے درمیان وہ ایک ٹینک شکن توپ میدان میں لا رہے تھے اور اس کو گھاٹی کی ڈھال پر دھکیل کر پہاڑی کی چڑھائی پر لے جانا چاہتے تھے۔ یہ ڈھال بڑی لمبی چوڑی تھی، بس آسمان کو چھوتی معلوم ہوتی تھی۔ اور اس لمبی چوڑی ڈھال پر گولوں سے چھلنی زمین کی سیاہ مٹی سے نہائے ہوئے کچھ توپچی آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی حرکت اور خط وخال میں کوئی ایسی بات تھی جس سے سینے کے اندر دل

پھڑک اٹھے اور فخر، درد اور کسی ایسی بات کی توقع سے سینہ پھول جائے جس میں خوف اور عظمت ہو ۔ وہ سات تھے ۔ ان کے لباس جل رہے تھے ۔ ان میں سے ایک توپچی صاف طور پر روسی نہیں تھا ۔ لڑکے نے اس کی طرف شاید توجہ بھی نہ کی ہوتی اگر اس کی ماں چپکے سے یہ نہ کہتی :

”دیکھ، یہ تیرا باپ...“

اور اسی منٹ سے یہ توپچی اس کا باپ ہو گیا ۔ سارا فلم بعد کو اسی کے بارے میں، اس کے باپ کے بارے میں ہو گیا ۔ باپ بہت ہی نوجوان تھا، ریاستی فارم کے نوجوانوں کی طرح ۔ قد تو اس کا زیادہ لمبا نہ تھا، گول چہرہ اور تیز آنکھیں ۔ کیچڑ اور دھوئیں سے سیاہ چہرے میں اس کی آنکھیں غصے سے چمک رہی تھیں ۔ وہ بلی کی طرح مضبوط اور تندخو لگتا تھا ۔ توپ کے پہئیے میں اپنا کندھا لگاتے ہوئے وہ مڑا اور نیچے کی طرف کسی سے چلا کر کہا : ”گولے! دیر مت کرو !“ اور اس کی آواز گولوں کی ایک باڑ میں ڈوب گئی ۔

”ماں، یہی میرے ابا ہیں؟“ آول بیک نے ماں سے پوچھا ۔

”کیا کہا؟“ ماں نے پوچھا ”چپکے بیٹھ کر دیکھ!“

”تمہیں نے تو کہا تھا کہ وہ میرے ابا ہیں ۔“

”ہاں، سچ مچ وہ تیرے ابا ہیں ۔ مگر چپ رہ ۔ دوسروں کے سننے میں گڑبڑ نہ کر ۔“

جیئن گل نے یہ کیوں کہا؟ کیا وجہ تھی؟ شاید

ویسے ہی، اس وقت بے ساختہ کہہ دیا یا شاید شوہر کی یاد آگئی - لیکن لڑکے نے اس کی بات کا یقین کرلیا - وہ بہت خوش تھا - وہ اس خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا جو اس کے لئے غیرمتوقع اور انجانی تھی، اس کو اپنے سپاہی باپ پر طفلانہ فخر تھا - یہ رہا اس کا حقیقی باپ، اس کا باپ تو ہے اور بچے اس کو چڑھاتے تھے کہ اس کا باپ نہیں ہے - اب وہ دیکھلیں میرے باپ کو اور سارے گلہ بان بھی - یہ پہاڑوں پہاڑوں گھومنے والے گلہ بان بچوں کو جانتے پہچانتے تو ہیں نہیں - وہ اون کترنے کے لئے ان کی بھیڑوں کو ہنکا کر باڑے میں لاتا ہے، ان کے کتوں کو آپس میں لڑنے بھڑنے سے روکتا ہے اور گلہ بان ہیں کہ اس پر سوالوں کی بوچھار کردیتے ہیں - دنیا کا ہر گلہ بان یہ ضرور پوچھ لیگا -

"ہاں، بچے، تیرا نام کیا ہے؟"

"آول بیک -"

"اور کس کے بیٹے ہو تم؟"

"توکتوسون کا بیٹا ہوں میں!"

گلہ بانوں کو فوراً نہیں یاد آتا کہ لڑکا کس کے بارے میں کہہ رہا ہے -

"توکتوسون؟" گھوڑے کی زین سے جھکتے ہوئے پھر وہ پوچھتا "کون توکتوسون؟"

"میں توکتوسون کا بیٹا ہوں" وہ پھر زور دیکر کہتا -

ماں نے اسی طرح اس سے جواب دینے کو کہا تھا اور نابینا دادی نے بھی اس کو ہدایت کی تھی کہ

باپ کا نام نہ بھولے۔ اس کے لئے وہ آول بیک کے کان کھینچتی تھی۔ وہ غصہ‌ور تھی۔

"آہ، ٹھہرو، ٹھہرو، تو تم ڈاکخانے میں ٹیلی‌فون پر کام کرنے‌والی کے لڑکے ہو، ٹھیک ہے نا؟"

"نہیں، میں توکتوسون کا بیٹا ہوں"، وہ اپنی بات پر اڑا رہتا۔

تب جا کر کہیں گلہ‌بان ساری بات سمجھتا۔

"ہاں، تم توکتوسون کے بیٹے ہو! شاباش، ہم تو تمہارا امتحان لے رہے تھے بچے! خفا نہ ہونا، ہم تو پورے سال پہاڑوں پر رہتے ہیں اور تم یہاں ککڑیوں کی طرح بڑھتے رہتے ہو، بچوں کو پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔"

اور پھر گلہ‌بان آپس میں اس کے باپ کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں اور چپکے چپکے کہتے ہیں کہ وہ بالکل نوجوان تھا جب میدان جنگ کو چلا گیا اور اب بہت سے لوگوں کو وہ یاد بھی نہیں ہے۔ یہ اچھا ہے کہ بیٹا تو رہ گیا۔ بہت سے نوجوان تو بن بیاہے گئے تھے اور اب ان کا نام‌لیوا کوئی نہیں ہے۔

اور اب اس لمحے سے ہی جب ماں نے اس سے چپکے سے کہا تھا "دیکھ، یہ تیرا باپ ہے"، — وہ اسکرین‌والا توپچی اس کا باپ بن گیا اور لڑکا اس کے بارے میں اپنے باپ کی طرح سوچنے لگا۔ واقعی وہ باپ کے اس فوجی فوٹو سے بہت مشابہہ تھا جو وردی میں لیا گیا تھا۔ اس فوٹو سے جس کو ماں نے بڑا کروا کر شیشے کے فریم میں لگایا تھا۔

اب آول بیک باپ کو بیٹے کی نگاھوں سے دیکھ رھا تھا اور اس کے چھوٹے سے دل میں فرزندانہ محبت اور نرمی کی ایک انجانی اور پرخلوص لہر اٹھ رھی تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے اسکرین سے اس کا باپ اپنے بیٹے کو برابر دیکھ رھا ھے، اور چاھتا ھے کہ پردۂ سیمین کی اس لمحاتی زندگی میں اپنے کو ایسا دکھائے کہ بیٹا اس کو ھمیشہ یاد رکھے اور ھمیشہ اس پر، پچھلی جنگ کے سپاھی پر فخر کرے۔ اس لمحے سے لڑکے کے لئے جنگ تفریح اور کھیل نہیں رہ گئی اور جنگ میں لوگوں کا گرنا اب اس کے لئے ھنسی کی بات نہیں رھی۔ جنگ اس کے لئے سنگین، تشویش ناک اور ڈراؤنی بن گئی، اور اس نے پہلی بار کسی عزیز و قریب شخص کے لئے، اس شخص کے لئے ڈر محسوس کیا جس کی کمی وہ ھمیشہ محسوس کرتا تھا۔

پروجکٹر کھڑکھڑاتا رھا۔ جنگ چلتی رھی۔ حملہ آور ٹینک آگے بڑھ رھے تھے۔ ان کی پیش قدمی خوفناک تھی، ان کی پیٹیاں زمین کو گوندھتی اپنا راستہ بنا رھی تھیں۔ ان کے گنبد گھوم رھے تھے اور توپیں آگ اگل رھی تھیں اور ھمارے توپچی پوری قوت لگا کر اپنی توپ کو اوپر دھکیل رھے تھے۔ ”جلدی، جلدی کرو، ابا! ٹینک آرھے ھیں، ٹینک!“، بیٹے نے باپ کو شہ دی۔ بالآخر توپ پہاڑی کے اوپر پہنچ گئی اور اس نے میوے کی جھاڑی کی آڑ لیکر ٹینکوں پر گولہ باری شروع کر دی۔ ٹینکوں نے جوابی گولہ باری کی۔ وہ تو بہت سے تھے۔ حالت کافی خراب تھی۔ بیٹے کو ایسا لگا جیسے وہ بھی باپ کے ساتھ وھاں

ہے، جنگ کے شعلوں اور ہنگامے میں۔ جب ٹینکوں میں آگ لگ گئی اور وہ سیاہ دھواں دینے لگے، جب ان کی پیٹیاں پہیوں سے نکل گیئں اور جب وہ اندھوں کی طرح غصے میں ایک جگہ پر ناچنے لگے تو لڑکا مارے خوشی کے ماں کی گود میں کودنے لگا۔ لیکن جب ہمارے سپاہی توپ کے قریب گرنے لگے تو وہ چپکا دبک کر بیٹھ گیا۔ ہمارے سپاہی کم ہوتے گئے... ماں رو رہی تھی۔ اس کا چہرہ تر تھا اور جلنے لگا تھا۔

پروجکٹر کھڑکھڑاتا رہا۔ جنگ چلتی رہی۔ لڑائی اب اور زوروں کے ساتھ بھڑک اٹھی۔ ٹینک زیادہ قریب آرہے تھے۔ توپ گاڑی کے پہلو میں جھک کر باپ نے میدانی ٹیلی‌فون کے ذریعہ چلا کر کچھ کہا لیکن لڑائی کے ہنگامے میں کچھ سنائی نہ دیا۔ اب توپ کے پاس ایک اور سپاہی گرگیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن نہ اٹھ سکا۔ وہ زمین پر گرگیا اور زمین اس کے خون سے سیاہ پڑگئی۔ اب صرف دو رہ گئے، باپ اور ایک سپاہی۔ انھوں نے پہلے ایک گولہ اور پھر دو یکے بعد دیگرے داغے۔ لیکن ٹینک آگے بڑھتے رہے۔ پھر ایک اور گولہ توپ کے قریب پھٹا۔ زور کا دھماکا ہوا، شعلہ بھڑکا اور دھواں بلند ہوا۔ اب زمین سے صرف ایک ہی سپاہی اٹھا۔ یہ لڑکے کا باپ تھا۔ وہ پھر توپ کی طرف جھپٹا۔ اس میں گولہ ڈالا، نشانہ باندھا اور داغ دیا۔ یہ اس کا آخری گولہ تھا۔ دشمن کا ایک گولہ پھر پھٹا اور سب کچھ

دھوئیں میں غائب ہوگیا۔ اس نے توپ کو خراب کرکے الٹ دیا۔ لیکن توپچی تو ابھی زندہ تھا۔ وہ زمین سے آھستگی کے ساتھ اٹھا۔ وہ جابجا جل گیا تھا، اس کے کپڑے بھی پھٹ گئے تھے اور جل رہے تھے۔ وہ ٹینکوں کی طرف چل پڑا۔ اس کے ھاتھ میں ایک دستی بم تھا۔ وہ نہ تو کچھ دیکھ رہا تھا اور نہ سن رہا تھا۔ اس نے اپنی آخری قوت جمع کی اور چلایا۔

''ٹھہرو، آگے نہیں بڑھ سکتے،، اس نے دستی بم کو ھاتھ میں تان لیا اور ایک سکنڈ تک اسی انداز میں کھڑا رہا، اس کا چہرہ نفرت اور درد سے بگڑ گیا تھا۔

ماں نے بیٹے کا ھاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ ھاتھ چھڑا کر باپ کی مدد کے لئے جھپٹنا چاھتا تھا۔ لیکن ٹینک سے مشین گن کی ایک باڑ چلی اور باپ کاٹے ہوئے پیڑ کی طرح گر گیا۔ وہ زمین پر لڑھک گیا، اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور پھر گر گیا، منہہ کے بل اور اس کے ھاتھ باھر کی طرف پھیل گئے ...

پروجکٹر کی کھڑکھڑاھٹ بند ہوگئی۔ لڑائی اچانک بند ہو گئی۔ ریل ختم ہوگئی تھی۔ آپریٹر نے دوسری ریل لگانے کے لئے روشنی کردی۔

جب باڑے میں روشنی ہوئی تو سبھی آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ وہ فلم کی دنیا، جنگ کی دنیا سے پھر اپنی حقیقی زندگی کی طرف لوٹ آئے تھے۔ اس لمحے لڑکا اون کی گانٹھوں پر سے لڑھک کر نیچے گیا اور بڑے جوش کے ساتھ چلا کر کہنے لگا:

''ارے لڑکو، یہ میرا باپ تھا ! دیکھا نا تم نے؟ میرے باپ کو مار دیا...''

یہ بات بالکل غیرمتوقع تھی اور کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بات ہے۔ لڑکا جوش میں چلاتا ہوا آگے کی طرف بھاگا جہاں اس کے دوست بچے بیٹھے تھے اور جن کی رائے اس کے لئے بہت اہم تھی۔ باڑے میں ذرا دیر کے لئے سناٹا چھا گیا، ایک عجیب سا سناٹا۔ ابھی تک وہ اس چھوٹے بچے کی خوشی کے انوکھے خیال کو نہیں سمجھے تھے جس نے اس سے پہلے اپنے باپ کو نہیں دیکھا تھا۔ کوئی کچھ نہیں سمجھا، سب پر گھبراہٹ اور خاموشی طاری تھی، وہ اپنے شانے جھٹک رہے تھے۔ آپریٹر کے ہاتھ سے ریل کا ایک کیس چھوٹ کر دو حصوں میں فرش پر لڑھکنے لگا۔ اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں گئی اور خود آپریٹر نے بھی اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ اور وہ، مقتول سپاہی کا بیٹا، اپنی بات ثابت کرنے میں لگا تھا:

''تم نے دیکھا نا، وہ میرے ابا تھے!.. ان کو مار ڈالا گیا۔'' لوگ جتنا ہی خاموش تھے، اتنا ہی زیادہ اس کو جوش آرہا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ لوگ آخر خوش کیوں نہیں ہیں اور اس طرح اس کے باپ پر فخر کیوں نہیں کررہے ہیں جیسے کہ اس کو ہے۔

بزرگوں میں سے کسی نے ناراضگی سے کہا:

''چہ، چہ، چپ رہو، ایسے مت بولو۔''

لیکن کسی نے اس کو ٹوکا:

''کیوں کیا ہوا؟ اس کا باپ محاذ پر مارا گیا تھا۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟،،
تب اسکول میں پڑھنےوالے پڑوسی لڑکے نے سب سے پہلے اس سے سچ کہنے کا فیصلہ کیا :
''ارے یہ تمہارا باپ نہیں ہے، شور کیوں کررہے ہو؟ یہ تمہارا باپ نہیں، یہ تو ایکٹر ہے۔ تم چاچا آپریٹر سے پوچھ سکتے ہو۔ ،،
بڑے لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ بچے کو اس تلخ لیکن حسین دھوکے سے محروم کردیں۔ اس لئے انھوں نے یہ توقع کی کہ باہر سے آنےوالا آپریٹر ہی بچے کو سچی بات بتائے اور سب اس کی طرف مڑ گئے۔ لیکن وہ خاموشی کے ساتھ پروجکٹر پر جھک گیا جیسے وہ مصروف ہو۔
''نہیں، میرا باپ تھا، میرا!،، لڑکا اپنی رٹ لگائے تھا۔
''کون تھا تمہارا باپ؟ کون؟،، پھر پڑوسی لڑکے نے پوچھا۔
''وہی جو ٹینک پر دستی بم لیکر جھپٹا تھا، تم نے نہیں دیکھا؟ وہ اس طرح گر گیا!،،
لڑکے نے اپنے کو زمین پر گرادیا اور لڑھک گیا — وہ دکھا رہاتھا کہ اس کا باپ کیسے گرا تھا۔ اس نے بالکل ٹھیک نقل اتاردی۔ وہ منہہ کے بل اسکرین کے سامنے پڑا تھا اور اس کے ہاتھ باہر کی طرف پھیلے تھے۔
دیکھنےوالے بےساختہ ہنس پڑے۔ لڑکا مردے کی طرح زمین پر گر پڑا اور ہنسا بھی نہیں۔ پھر ایک عجیب سا سناٹا ہوگیا۔

''ارے کیا ہوا، تم کدھر دیکھ رہی ہو، جیئن گل؟،، ایک بوڑھی گلہ‌بان عورت نے جھنجھلا کر کہا اور سب نے دیکھا کہ کس طرح ماں بیٹے کے پاس گئی۔ وہ غم میں بھری اور سنجیدہ تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اس نے بیٹے کو زمین سے اٹھایا اور بولی:

''بیٹا، آؤچلیں۔ وہ تیرا باپ تھا،، اس نے آہستہ سے بیٹے سے کہا اور باڑے سے اس کو لیکر چلی گئی۔

چاند بلند ہو چکا تھا، رات کے گھرے نیلے آسمان کے پس‌منظر میں پہاڑی چوٹیاں سفید چمک رہی تھیں اور نیچے استیپ میں زبردست اور بے کنار تاریکی پھیلی ہوئی تھی...

اب، اپنی زندگی میں پہلی بار لڑکے کو اپنے شدید نقصان کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کو جنگ میں اپنے باپ کے مارے جانے پر انتہائی غصہ، تکلیف اور درد تھا۔ اس کے دل میں اچانک یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اپنی ماں سے لپٹ کر خوب روئے اور ماں بھی اس کے ساتھ روئے۔ لیکن وہ خاموش تھی۔ وہ بھی خاموش رہا، اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور اپنے آنسو نگل لئے۔

اس کو یہ پتہ نہیں چلا کہ اس گھڑی سے اس کا باپ جو مدتوں ہوئے لڑائی میں مارا گیا تھا اس کے اندر آن بسا ہے۔

انار

انار جنگ کے بعدوالی نسل کے باجوھر آذربائجانی مصنفوں کے نمائندوں میں سے ھیں - وہ ۱۹۳۸ء میں شہر باکو میں پیدا ھوئے - انھوں نے آذربائجان کی ریاستی یونیورسٹی میں شعبۂ لسانیات کی تعلیم پوری کی - اور منظر نگاری کا اعلی کورس ختم کیا -

۱۹۶۰ء سے ان کی تصانیف شائع ھونے لگیں اور جلدی ھی سارے سوویت یونین کی توجہ ان کی کہانیوں اور ناولوں نے اپنی طرف مبذول کرلی - ان کی تخلیقات کے بنیادی موضوع اخلاقی مطالب و معانی سے بھرپور ھوتے ھیں اور ان سے موجودہ زمانے کے لوگوں کے جذبات، خیالات اور میلان طبع کا اظہار ھوتا ھے -

کچھ عرصے سے انار تنقید اور صحافت کی طرف بھی توجہ کررھے ھیں - وہ آجکل آذربائجانی ریپبلک کے رسالے ''فن،، کے سربراہ ھیں -

میں، تم، وہ اور ٹیلیفون

ٹیلیفون کے نمبر
ملتے نہیں ایک دوسرے سے
مگر سب میں گونجتی ہے آواز انسانی۔
خراب دن
ملتے نہیں ایک دوسرے سے —
کبھی تم نہیں دیتے جواب
کبھی تم نہیں پاتے جواب

واتیف ویکیلوف

کل تمہارا ٹیلیفون مر گیا۔ صرف انسان ہی نہیں مرا کرتے، ٹیلیفونوں کے نمبر بھی مرجاتے ہیں۔ زندگی میں بہت سے نمبر یاد نہیں رہتے جیسے پاسپورٹ کا نمبر، پچھلے کام کی اجرت، دوست کی موٹر کا نمبر، اپنے شہر کی آبادی، چاند کی دوری، پر ان پانچ ہندسوں کو کبھی نہیں بھلایا جا سکتا جو تیرے لئے اپنے ساتھ اس کی آواز کا قیمتی تحفہ لائے ہوں اور اس کی

پھولوں جیسی بھینی بھینی خوشبو رسیور میں بس گئی ہو۔

کبھی تو میں نے کالے رسیور کو پیانو کے ڈھکن کی طرح اٹھایا ہے اور کبھی تابوت کے ڈھکن کی طرح اسے رکھا ہے۔

لیجئے اب وہ نہیں رہا، وہ نمبر — اس کا وجود ہے، لیکن میری پہنچ کی حدوں سے باہر۔ میرے ہاتھ کے نیچے ٹیلیفون ڈسک پر ان پانچ ہندسوں کا فاصلہ ناقابل‌عبور ہوگیا ہے — یہ دوری میلوں، کلومیٹروں اور خلا تک پھیل گئی ہے۔ چار ہندسوں کا فاصلہ تو طے کرسکتا ہوں پر پانچواں ہندسہ کبھی بھی نہ گھما پاؤں‌گا۔ کیونکہ یہ تمہارا نمبر ہے۔ اور یہ وہ کالا بند دروازہ ہے جس کی چابی کھو گئی ہے۔

میرے لئے تم سے ملنا ضروری نہیں تھا۔ میں نے تمہیں فون کیا، تمہاری آواز سنی اور کہا: ''تمہاری نازک انگلیاں کتنی سرد ہیں، جان من، کیوں؟،، اور تم نے مجھے بتایا کہ کیوں۔

میں تمہیں دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن میں تمہیں اس دوری سے محسوس کررہا تھا، اسی طرح جیسے سمندر کے کنارے بسنےوالے سمندر کو محسوس کر لیتے ہیں بھلے ہی وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو۔

اور اچانک سمندر نہ رہا۔

بالکل سادہ سا قصہ ہے: میں، تم اور ... بیشک وہ بھی۔ لیکن ایک اور ٹیلیفون بھی تو ہے۔ اور اس کی شروعات رسیم کی شادی کی تقریب سے ہوئی۔

''ہم پانچ تھے،، فیروز جام صحت تجویز کررہا تھا ''ویسے ہی جیسے فلم میں ہوتا ہے، یاد ہے نا، وہ فلم جس کا نام تھا ''وہ پانچ تھے؟،، میں، کمال، مراد، رسیم اور سیئی‌سور۔ ہم قلعوں کی طرح یکے بعد دیگرے فتح ہوتے گئے اور یہ رہیں ہماری فاتح — ہماری بیویاں!،، زوروں کا قہقہہ گونجا۔ ''اور گھر پر بچے بھی ہیں۔ تو بھائیو، آج ہم رسیم کو کھو رہے ہیں۔ خیر یہ تو مذاق کر رہا تھا میں۔ دعا کرتا ہوں زندگی کی ساری خوشیاں تم دونوں کو، نصیب ہوں پیارے رسیم اور فریدہ، خوش‌نصیبی، شادمانی تمہارے قدم چومے۔ بیٹے بیٹیوں سے گھر بھرا رہے۔ ہم نے تمہارے لئے تو جام پئے ہیں اور ابھی اور پیئں گے۔ اب اپنی ٹولی کے آخری نام لیوا، پیارے سیئی‌سور کے لئے جام صحت اٹھانے کو میرا دل مچل رہا ہے۔ ہمارا یہ جوان کنوارا، بن بیوی‌والا دوست ہے، آفتاب کی طرح درخشاں، ہمارے لئے آخری آرام جان، گم کردہ جنت کا نشان۔،،

سب میری طرف مڑ گئے، قہقہوں اور جاموں کی جھنکار کے درمیان میں نے مسکراہٹ اور حیرت کے ایک عام اظہار سے چھلکتے چہرے دیکھے۔

جب مہمان رخصت ہونے لگے تو ہم سب کمال، فیروز، مراد اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ اور میں تنہا شہر کی اندھیری گلیوں میں نکل پڑے اور اچانک میں نے محسوس کیا کہ فیروز کی بیوی نے آگے بڑھکر میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ ڈال دیا ہے۔

”ہاں بھئی، سیئی‌مور، تمہاری شادی کی تقریب میں گلگشت کب ہوگی؟“
”جلدی نہیں۔“
”کیوں؟ کیا تم نے گپی کی بات کو سنجیدگی سے لیا؟“ وہ پیار سے اپنے شوہر کے قریب ہوگئی اور بولی ”کیا سوچتے ہو کہ خاندان دوزخ ہوتا ہے؟“
”اسے اچھی لڑکی نہیں مل رہی ہے“ فیروز نے کہا۔
”اچھا یہی سہی، آؤ دوستو، ہم سیئی‌مور کے لئے منگیتر ڈھونڈھتے ہیں۔ اگر ہمارے شہر باکو کی سب سے اچھی دوشیزہ مل گئی، توشادی کرلوگے تم؟“
”ضرور“ میں نے کہا ”لیکن صرف ایک شرط پر، تمہیں ابھی فوراً ہی تلاش کرنی ہوگی، جب تک میرا موڈ اور مزاج اچھا ہے، کل ہو سکتا ہے میرا خیال بدل جائے۔“
”میرے عزیز“ کمال نے کہا ”اس وقت ہم اسے کہاں پائیں گے، ان گلیوں میں؟ میں تو یہ نہیں سمجھتا کہ تم ایسی لڑکی سے شادی کرلوگے جو اس وقت گلیوں میں اکیلی ماری ماری پھر رہی ہوگی۔“
”اچھا، یہ بات ہے“ میں نے فوراً کہا ”اس کا مطلب ہے سوال ختم ہوا۔“
”میری تجویز ہے کہ اس کے لئے منگیتر ٹیلیفون پر ڈھونڈی جائے۔ دیکھو اتفاق سے ٹیلیفون بوتھ بھی قریب ہی ہے۔“
”بےمثل خیال ہے“ میں نے کہا ”مگر میرے پاس ٹیلیفون میں ڈالنے کے لئے سکہ نہیں ہے۔“

فوراً ھی میرے سامنے کئی سکے حاضر کر دئے گئے۔ میں ٹیلیفون بوتھ میں چلا گیا۔

''فرمائیے نمبر۔''

''ھاں، ھاں۔ کوئی بھی گھما دو،'' فیروز نے کہا ''لو مثال کے طور پر...'' اور اچانک وہ خاموش ھوگیا ''ارے، بھائی، یہ نہیں چلے گا، تم تو جانتے ھو، یہ بڑی ذمےداری کا کام ھے۔ اگر ساس کے ساتھ نہ پٹی تو ساری عمر مجھے گالیاں دوگے۔''

''افوہ تم، ڈرپوک کہیں کے، یہی تو ساری بات ھے ذمےداری،'' میں نے کہا ''کمال اب تم بولو۔''

''میری ایک تجویز ھے،'' فیروز کی بیوی نے کہا۔ اس کے پاس ھمیشہ کوئی نہ کوئی تجویز تیار رھتی تھی۔ ''چلو ایسا کرتے ھیں کہ ھر شخص ایک ایک ھندسہ بولے، اس سے کسی کی ذاتی ذمےداری نہ رھےگی۔''

''بہت خوب،'' فیروز نے کہا۔ وہ ھمیشہ اپنی بیوی کی تجویزوں سے محظوظ ھوتا تھا۔ ''۲۔''

میں نے ۲ کا ھندسہ گھمادیا۔

''۹،'' فیروز کی بیوی نے کہا۔

''صفر،'' کمال بولا اور مڑکر اپنی بیوی سے کہنے لگا ''اب تمہاری باری ھے۔''

''ارے، بھئی، میں نہیں جانتی،'' وہ زور سے ھنس پڑی ''اچھا اچھا، ٹھیک ھے۔ چار۔''

''پانچ،'' مراد چلایا۔

ابھی مراد کی بیوی کچھ کہہ نہیں پائی تھی کہ ٹیلیفون کی لمبی گھنٹی بج اٹھی۔

فیروز نے میری طرف رومال بڑھا دیا:

''یہ لو، رسیور کو ڈھک لو، جس سے کوئی آواز پہچانی نہ جائے، ایسی ویسی بات ہو تو بچ کر نکلا جا سکے۔''

سب نے زور کا قہقہہ مارا اور میں نے رسیور جلدی سے رکھدیا۔

''میری منگیتر محوخواب ہے۔''

ہم آگے بڑھ گئے۔

سب اپنے اپنے گھروں کو چلدئے۔ میں نہ جانے کیوں بہت ہی اکیلاپن اور تنہائی محسوس کررہا تھا۔ اندھیرے سمندر اور اس میں جابجا نشان دہی کے لئے لگے ہوئے رنگ برنگی روشنیوں کے تیرتے پیپوں کو تکتا اور دیر تک سنسان سایہ دار روش پر گھومتا رہا۔ یکایک مجھے وہ نمبر یاد آگیا جس پر کوئی گھنٹہ بھر پہلے فون کیا تھا۔ رات کے دو بجے تھے۔ میں سڑک پر لگے ہوئے قریب کے ٹیلیفون کے بوتھ میں گھس گیا۔ اور جب سکہ نکالنے کے لئے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو سکہ کے ساتھ ہی فیروز کا دیا ہوا رومال ہاتھ میں آ گیا۔ مسکراتے ہوئے میں نے رسیور کو ڈھک دیا اور نمبر گھمایا۔ دو، نو، صفر، چار، پانچ۔

زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ رسیور سے صنف نازک کی مترنم آواز آئی۔ اس آواز کو خمارآلود نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں، کچھ تھکی اور حیرت انگیز ضرور لگی۔

''میں سن رہی ہوں۔''

"آداب عرض۔"

"تسلیم، کون صاحب ہیں؟"

"میں ہوں، چلئے ہم اپنا تعارف کرلیں۔"

میں نے سخت گالیوں سے اپنے کو بچانے کے لئے اس طرح بے ساختہ تیار کرلیا جیسے کوئی اپنے کو طمانچے سے بچانا چاہتا ہے یا کسی ایسے حادثے کے باوجود ڈٹے رہنے کا تہیہ کرلیتا ہے جو ٹھیک ناک کے سامنے آدمی پر دروازہ بند ہونے کی وجہ سے پیش آتا ہے۔ لیکن میں متحیر رہ گیا جب نہ تو پہلا واقعہ ہوا اور نہ دوسرا حادثہ پیش آیا بلکہ ایک پرسکون آواز نے کہا:

"آپ کے خیال میں کیا اس کے لئے کافی رات نہیں گزر چکی ہے؟"

"بالکل نہیں، میں تو بس ابھی آرہا ہوں اپنے سب سے عزیز دوست کی شادی کی تقریب سے۔ یہ میرے دوستوں میں سے آخری کنوارا تھا۔ مجھے تو محسوس ہورہا ہے جیسے کہ میں اسے ابھی دفن کرکے آرہا ہوں۔"

"ہائے، آپ یوں کیوں کہہ رہے ہیں؟ اور کیا آپ خود شادی شدہ نہیں ہیں؟"

"نہیں، اور آپ؟"

وہ ہنس پڑی۔

"کیا آپ تعارف کے پہلے لمحوں میں ہی کافی سے زیادہ جاننے کی کوشش نہیں کررہے ہیں؟"

"مہربانی فرماکر، معاف کیجئے۔ میں ٹیلیفون کرکے لوگوں کو پریشان کرنے والے غنڈوں میں سے

نہیں ہوں۔ دراصل میں بڑی تنہائی محسوس کررہا تھا اس لئے میں نے فون کرنے کا فیصلہ کیا کہ کسی کے ساتھ بات چیت کی جائے۔''

''اور میرا نمبر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''بالکل اتفاق ہے۔ بس... میں نے اپنے دماغ میں آنے والے ہندسے گھما دئے۔''

''بہت خوب۔''

''بات یہ ہے کہ میں نے ذرا حلق تر کرلیا ہے۔ اور اب غضب کی تنہائی محسوس کررہا ہوں۔''

''ایسا ہوتا ہے۔''

''کیا میں آپ سے شرف ملاقات حاصل کرسکتا ہوں؟''

''یہی تو کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ چلئے یوں طے کرتے ہیں کہ ابھی تو آپ جا کر سوجائیے، بہت دیر ہوگئی ہے۔ اور کل جب آپ بیدار ہوں تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوگا سمجھے نا؟''

''پر میں تو آپ سے ملنا چاہتا ہوں یا پھر اور کچھ نہیں تو صرف بات ہی کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ اب میرا ٹیلیفون تو جانتے ہی ہیں، یا اس کو بھول گئے؟ اچھا، اگر آپ کو ہوشمندی میں مجھسے بات کرنے کی خواہش پیدا ہو تو آپ مجھے فون کر سکتے ہیں۔''

''سچ؟''

''سچ، ہاں بس، شب بخیر۔''

''میں کل ہی آپ کو فون کروں گا۔''

حالانکہ یہ بات بالکل ہی فضول اور بیوقوفی کی لگتی ہے لیکن جب میں سنسان گلیوں سے ہوتا ہوا جا رہا تھا تو مجھے ایسا لگا کہ میرا بھی کوئی ہے۔

* * *

فطری طور پر دوسرے دن میں نے ٹیلیفون نہیں کیا۔ سارے دن اپنے کام میں لگا رہا اور اس بارے میں سب بھول ہی گیا۔ ان دنوں مصروفیت کچھ زیادہ ہی تھی۔ کام کے منصوبے پر بحث و مباحثے کے دوران لیباریٹری کے چیف سے، جو میرے تعلیمی کام کے سربراہ بھی ہیں، جھڑپ ہو گئی۔

اس جھگڑے کے بعد فیروز مجھے اپنے گھر لے گیا۔ ہم دونوں ایک ہی انسٹی ٹیوٹ میں کام کر رہے تھے۔ راستے میں اس نے مجھے دانائی کا سبق دیا اور کہا کہ کسی سے جھگڑا مول لینا نہیں چاہئے، چاہے تم حق پر ہی ہو۔ سچی بات کے اظہار اور سچائی کو ثابت کرنے کے ہزاروں طریقے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ سب کو اپنے خلاف بنا لینا ان میں سے بہترین طریقہ نہیں ہے۔

"حسن بیان جیسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے"، اس نے کہا "آدمی سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ غلط فہمی کا شکار ہے اور دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہ تم نرے بدھو ہو اور اس کام کے قابل نہیں ہو۔ سمجھتے ہو نا..."

"سمجھتے ہو نا؟ تمہارے وعظوں اور مصلحت بینی سے تو میرا دل بھر چکا ہے"، میں نے کہا۔

''اچھا، ٹھیک ہی ہے، میں دیکھتا ہوں، ابھی تم کو سمجھانا بجھانا بیکار ہے۔ آؤ، گھر چل کر چائے پیئں۔ ''

''تم جانتے ہو،، فیروز کی بیوی نے مجھ سے کہا، جب دوسرے کمرے میں فیروز آرام کے لئے نیلا لباس اور ملائم فر کی سلیپر پہن رہا تھا۔ ''بس حیرت ہوتی ہے۔ وہ خودبخود ''ما۔ ما، پا۔ پا،، کہنے لگا ہے۔ کسی نے اس کو سکھایا نہیں...،، وہ اپنے سال بھر کے بیٹے کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''ارے ہاں، یہ تو بڑی حیرت‌انگیز بات ہے،، فیروز نے گذرگاہ سے کہا ''میرے دماغ میں ابھی یہ بات آئی کہ ''زبان،، بڑوں نے نہیں، بچوں نے بنائی ہے، جب انسانیت کے بچپن کا دور تھا، ہاں بچوں نے ہی۔ اور جو الفاظ ہم بڑے استعمال کر رہے ہیں وہ بچوں ہی کے سوچے ہوئے ہیں۔ ارے، دیکھو تو کیسا پیارا ہے۔ چچا سیئی‌مور، کبھی دیکھا ہے ایسا بچہ؟،،

میں دماغ پر زور دے کر نمبر یاد کرنے کی کوشش کر رہاتھا۔ آخری دو ہندسے تو یاد آ گئے تھے، اور پہلا دو، تیسرا صفر اور یہ دوسرا کسی طرح یاد نہیں آرہا تھا۔

''ذرا سنو تو سیمیا، تمہیں یاد ہے کہ اس شام تم نے کونسا ہندسہ بولا تھا؟،،

''کونسی شام؟،،

بڑی دیر تک سمجھانا پڑا، اپنی ساری ذہانت، تجویزوں، اشاروں اور لطیفوں کا حوالہ دینا پڑا اور

جب میں اپنا اوورکوٹ پہن کر چوکھٹ پر پہنچ چکا تھا تو میں نے سیمیا کی آواز سنی :

''یاد آگیا — نو ! یہ میری ٹرالی بس کا نمبر ہے۔''

* * *

''ہلو ، آداب، یہ میں ہوں ۔ ''

''تسلیم، کون صاحب ہیں؟''

''آپ بھول بھی گئیں ۔ یاد ہے، میں نے تین دن پہلے فون کیا تھا ۔ قریب قریب اسی وقت ۔ ''

''پر آپ کی آواز تو بالکل دوسری تھی'' اس نے ہنستے ہوئے کہا ''کیا ایک شادی‌شدہ کے تنہا دوستوں کی کوئی پوری ٹولی ہے جو اپنی تنہائی کو ٹیلیفون کرکے بہلا لیتی ہے؟''

اسے سختی سے بھی بات کرنا آتا تھا لیکن خوش قسمتی سے مجھے فوراً خیال آگیا کہ بات کیا ہے، میں نے بڑی تیزی سے رومال رسیور پر ڈال دیا ۔

''قسم سے، یہ میں ہی ہوں ۔ ہوسکتا ہے پچھلی بار میری آواز بہت زیادہ شراب آلود رہی ہو ۔ ''

''نہیں، نہیں، بالکل ٹھیک ایسی تھی جیسی اب ہے ۔ پہلے مجھے یوں ہی لگا جیسے دوسری آواز ہے ''

اس کو ایک لطیف ہنسی کا احساس ہوا ''اچھا تو، آج آپ ہوش میں ہیں؟''

''شیشے کی طرح شفاف، پھربھی میرا دل بےحد چاہا آپ کو ٹیلیفون کرنے کےلئے ۔ میں نے اب تو آپ کا فون نمبر لکھ بھی لیا ہے کہ کہیں بھول نہ جاؤں ۔''

''اچھا ہی ہوا کہ آپ نے فون کرلیا، میں بھی آج دلگیر ہوں کیونکہ میرا ریڈیو خراب ہوگیا ہے۔ ''
''کیا آپ ہمیشہ دیر سے سوتی ہیں؟''
''جی ہاں، رات گئے تک میں ریڈیو سنتی ہوں، اور آج اس کا فیوز جل گیا، اور میں تو جیسے بےدست و پا ہوکر رہ گئی ہوں۔ اپنے آپ کی خبر نہیں، کھو سی گئی ہوں۔ ''
ریسور میں سے میں نے سنا جیسے دور کوئی پیانو بجا رہا ہو۔
''معاف کیجئے گا میری بدتمیزی، میں جانتا ہوں کہ آپ کو سوال‌وجواب پسند نہیں ہیں پھربھی بتائیے، اس وقت پیانو کون بجا رہا ہے؟''
''ایں ہاں...'' وہ ہنس پڑی ''یہ میرے یہاں نہیں، پڑوسی کے یہاں... ایسی دھن کی پکی لڑکی ہے کہ رات گئے تک ریاض کرتی ہے۔ دیواریں پتلی ہیں، اس کے سرگم سے پاگل ہوجانا بالکل ممکن ہے۔ جب میرا ریڈیو چلتا ہے تو میں اس ہنگامے کو کم سے کم محسوس کرتی ہوں''۔
''اور ریڈیو پر آپ کیا سنتی ہیں؟''
''اف، میں تو ان ریڈیو کے پروگراموں میں ایسی رچ بس گئی ہوں جیسے اپنے کمرے میں، یہ رات کا کنسرٹ ہے...'' اور میں نے جیسے اسے دیکھا کہ وہ ریڈیو کے پاس بیٹھی اپنی انگلیوں سے چینل بدل رہی ہے ''یہاں سمندر پار سے آنےوالی تیز موسیقی ہوتی ہے تو وہاں طوفانی شور۔ کہیں نہ سمجھ میں آنےوالی زبان میں تقریر تو کہیں پرشور جلسہ جہاں

اعلان کرنے والا چٹخارے دار باتیں کرتا ہے ۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا لیکن سب ہنستے ہیں، سیٹیاں اور تالیاں بجاتے ہیں جس سے میرے اندر بھی خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور یہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی محبت کا پروگرام ہوتا ہے ۔ مرد اور عورت بہت آہستہ بولتے ہیں، قریب قریب سرگوشی میں اور میں محسوس کرتی ہوں کہ وہ مائیکروفون میں سانس لے رہے ہیں ۔ عجیب حیرت انگیز چیز ہے یہ ریڈیو بھی، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اس کمرے میں موسیقی، ڈراموں اور ہوائی جہازوں سے بھری ہوئی رات کی ساری دنیا، سارا آسمان میرے ساتھ ہیں ۔ ''

''ہوائی جہاز ؟''، میں نے سوال کیا ۔

''سن رہے ہیں آپ؟''، اس نے کہا اور میں سمجھ گیا کہ وہ ہوائی جہاز کی آواز سننے کے لئے خاموش ہوگئی ہے ۔

اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد میں نے دور سے آئی ہوئی جہاز کی گونج سنی ۔ ''خوب، کیا یہ جہاز میرے گھر کے اوپر سے بھی اڑے گا؟''، میں نے سوچا ''پتہ نہیں اس کا گھر کہاں پر اور کتنی دور ہے، شہر کے کس علاقے میں ؟''

''ریڈیو اور ہوائی جہاز کا کچھ نہ کچھ بہت قریبی تعلق ہے''، اس نے کہا ''ٹھیک ہے نا؟''

''ممکن ہے کیونکہ آسمان تو ان کے درمیان مشترک ہے ؟''

''ممکن ہے''، اس نے کہا اور پھر خاموش ہوگئی ۔

اب رسیور سے ہوائی جہاز کی گونج نہیں آرہی تھی۔ صرف پیانو کی ہٹیلی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''میں سب کچھ آپ کو بتا رہی ہوں اور آپ خاموش ہیں، ارے، آپ بھی کچھ نہ کچھ کہیئے۔''

اور اس ساری مضحکہ انگیز صورت‌حال کو محسوس کرتے ہوئے بھی میں اپنی اچانک پیدا ہونے والی خواہش پر قابو نہ پا سکا۔ میں نے اس ناآشنا ہستی کے سامنے اپنی ساری پریشانیاں اگل دیں، اپنے کام کا بارے میں اور یہ بھی کہ مجھے اپنے قریب‌ترین دوست فیروز کا ہم‌زبان بننا روزبروز کتنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں اپنے تعلیمی سربراہ کو نہیں پسند کرتا اور وہ سب جو آج بحث کے دوران ہوا تھا اور بہت سی دوسری باتیں بھی۔ بعد میں اچانک جیسے مجھے کچھ یاد آگیا اور میں نے بڑی عجلت میں اس سے رخصت لے لی۔

اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ جو واقعہ ہوا ہے کیا اس پر کوئی یقین کرے گا۔ بہرحال یہ تو عجیب بات ہے کہ آدمی اپنے خیالات کا حصے دار کسی ایسے شخص کو بنالے جس کے بارے میں وہ کچھ نہ جانتا ہو، صرف یہ کہ وہ راتوں کو ریڈیو سننا پسند کرتی ہے اور اس کی پڑوسن رات گئے تک پیانو پر ریاض کرتی رہتی ہے۔

ٹیلیفون، اس کہانی کی شخصیتوں میں سے ایک ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس کے مجسمے کے کئی خطوخال پیش کروں۔

ابھی کچھ عرصے سے میں اکثر ٹیلیفون کے متعلق سوچتا رہا ہوں اور مجھے ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا چہرہ نظر آیا ہے۔ ہماری لیباریٹری کے رہنما کے کیبن میں کالے رنگ کا ٹیلیفون ہے، اور ہر بار جب میں اس کی طرف دیکھتا ہوں (ٹیلیفون کی طرف، رہنما کی طرف نہیں) تو مجھے لازمی طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی ڈوری سیفٹی فیوز کی ڈوری ہے۔ اور جب میں اپنے رہنما کی بےکل اور سہمی سہمی آنکھیں دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا کہ جیسے وہ اپنی کرسی میں سوئیوں کی نوک پر بیٹھا ہو اور اس کے لئے یہ کالا ٹیلیفون جو اس کے کیبن میں چھوٹی سی میز پر رکھا ہے ایک پھٹنےوالی سرنگ کی طرح ہے۔ یہ کسی بھی لمحے کوئی بھی بری خبر دے سکتا ہے۔ یہ خبر کہ اسے اس کے کام سے برطرف کیا جاتا ہے یا پھر یہ کہ اس کی بیوی اس کو چھوڑ کر چلی گئی۔

ہمارے دفتر کے ٹیلیفون میں ڈائل نہیں تھا۔ اس پر مہر لگا دی گئی تھی۔ وہ بغیر پہیوں کی گاڑی یا بغیر پتے کے خط کی طرح تھا، بے سہارا۔ مجھے وہ بےبس اور ماتحتی کی نشانی کی طرح لگتا تھا۔ اس سے تمہیں فون کرنا ممکن ہے لیکن تم خود فون نہیں کر سکتے۔ اور جب میں اس طرح کے ٹیلیفون کا پبلک ٹیلیفونوں سے مقابلہ کرتا ہوں تو مجھے موخرالذکر سزا کے خوف اور جواب‌دہی سے بری ہونے

کا مجسمہ نظر آتے ھیں — ان کے ذریعہ آپ جو چاہے کہہ سکتے ھیں لیکن کوئی آپ کو ٹیلیفون کرکے جواب نہیں دے سکتا۔

پہلے مجھے کبھی بھی اتنی شدت سے ٹیلیفون کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

اب تقریباً ھر رات ٹیلیفون کرتا اور وہ بھی ایک مقررہ دستور کے مطابق کافی رات گئے۔

ھماری بات‌چیت میں ھمیشہ پیانو کے سرگم کی اکتا دینےوالی آواز، ھوائی جہازوں کے شور سے بھرے ھوئے وقفے اور پس‌منظر میں مشکل سے سنائی دینےوالی ریڈیو کی سانسیں اور اس کی ذرا تھکی اور طنزآمیز آواز ھوتی۔ یہ باتیں میری زندگی کا معمول اور لازمی جز بن گئی تھیں۔ اور میں اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتا گیا۔ حالانکہ یہ سب ابھی نہیں کے برابر تھا۔

میں یہ جان گیا کہ اس کا نام مدینہ ھے اور وہ اکیلی رھتی ھے، اس کی آنکھیں بھوری ھیں اور اس کے جوتے کا نمبر ۳۵ ھے۔ بس میں اصل میں یہی اس کے بارے میں جان پایا تھا۔

''آپ کی عمر کیا ھے؟،، ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔

''او، میں تو بہت ضعیف ھوں، میرے تو پوتے اور پوتیاں بھی ھیں،، اس نے کہا۔

میں نے اس کی جوان آواز سے یہ اچھی طرح جان لیا کہ وہ مجھے بھلاوے میں ڈال رھی ھے۔ اور ساتھ ھی یہ بھی کہ وہ اپنی عمر، اپنے کام، خود اپنے یا

گھریلو معاملات کے بارے میں بات کرنا نہیں چاہتی اور ان باتوں کے متعلق اس نے مجھسے بھی سوال نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اب وہ جان گئی تھی کہ میں ۲۹ سال کا ہوں اور اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہوں۔ میں شادی‌شدہ بھی نہیں ہوں اور ایک سائنسی دفتر میں کام کرتا ہوں، صرف میرا اصلی نام وہ نہیں جانتی تھی۔ میں نے مذاق میں اس کو اپنا نام اور ھی یعنی رستم بتا دیا تھا۔ اور ہو سکتا ھے اس کا نام بھی مدینہ نہ ہو۔

''آخر ھماری ملاقات کب ہوگی؟''

''کس لئے؟'' اس نے کہا ''میں سوچتی ہوں اسی طرح ٹھیک ھے ھمارے لئے، میں نہیں جانتی آپ کا خیال کیا ھے، میری زندگی میں تو یہ ٹیلیفون کی گھنٹیاں کوئی بہت اہم بات لائی ھیں۔ میرے لئے یہ بات بہت پسندیدہ ھے کہ میں ایک خاص وقت پر ایسے شخص کے فون کا انتظار کرتی ہوں جس کو میں اپنے خیالات کا حصے دار بنا سکتی ہوں کیوں کہ میں اس کو بالکل نہیں جانتی، میں نے ایک دفعہ بھی اسے نہیں دیکھا ھے اور اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی اور وہ بھی مجھے اپنی فکروں میں شریک کر سکتا ھے لیکن میرے بارے میں ذرا بھی تصور نہیں کرسکتا۔ ملاقات ہوگی تو مایوس ہونگے ایک دوسرے سے، سب کچھ ختم ہوجائے گا، اور اگر مایوسی نہ بھی ہوئی تو بالکل ھی معمولی اور رسمی بات ہوگی۔ چلئے ھم اپنے تعلقات اسی صورت میں رکھیں۔ آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ یہ کہیں بہتر ہوگا۔ اچھا ہوگا، یہ بتائیے کہ آپ

کے کام کا کیا حال ہے۔ وہاں ٹھیک ٹھاک ہو گیا نا؟''
''میں نے وہاں سے استعفے کی درخواست دے دی ہے۔''
''تو آپ کا کہاں کام کرنے کا ارادہ ہے؟''
''ابھی پتہ نہیں۔ آپ کیا صلاح دیتی ہیں؟''
اس نے کوئی جواب نہیں دیا، مجھے ہوائی جہاز کی گونج سنائی دی۔

* * *

ہم نے نیا سال فیروز کے گھر پر منایا۔ اس کے یہاں نئے شادی شدہ رسیم اور فریدہ بھی آئے ہوئے تھے۔ ۱۲ بجنے میں ۱۰ منٹ پر ہم کھانے کی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ فیروز کی بیوی نے کھانا بڑی نفاست سے چنا تھا۔ دوسروں کی بیویوں نے اس کی مدد کی تھی۔ میں سب سے آخر میں پہنچا۔ بہت سخت سردی پڑ رہی تھی۔ اور برفیلی طوفانی گلیوں سے گزرنے کے بعد روشنی اور گھر کے آتش دان کی گرمی خاص طور سے راحت بخش تھی۔

گھڑی نے بارہ بجائے، ہم سب باہم گلے ملنے، ایک دوسرے کو چومنے اور ڈھیروں خوشیوں کی تمنائیں کرنے لگے۔ فیروز بولا، یہ سال سیئی‌مور کی شادی کا تاریخی سال ہوگا۔ اس کے بعد ہم نے ایک اور جام پیا اور فیروز مجھے ایک طرف لے گیا۔ ہم دونوں اپنے جام لئے بیٹھے تھے اور اس کو کافی نشہ ہوچکا تھا۔ اس نے میرے لئے جام تجویز کرتے ہوئے کہا:

''میں تمہارے لئے پیتا ہوں کہ تم ہمیشہ ایسے ہی سچے اور صاف گو، اور اصولوں کے پکے رہو، اس کے علاوہ تھوڑی سی ہوشمندی کے ساتھ حقیقت پسند بنو - ہو سکتا ہے کہ دل ہی دل میں تم مجھے حقیر سمجھنے لگے ہو - جیسے میں نے اپنے آپ کو ان لکڑی کے ٹکڑوں کے لئے بیچ دیا ہو ،، اس نے اپنے نئے پرانے فیشن کے فرنیچر کی طرف اشارہ کیا اور اپنی بات جاری رکھی ''یا سیمیا کے فر کے لئے- نہیں، میں اپنے ضمیر کے خلاف کبھی ایک لفظ نہیں کہوں گا- لیکن کہیں پیچھے ہٹنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے تا کہ کسی جگہ ڈٹ کر کھڑا ہونا ممکن ہو- ،،

''ہو سکتا ہے، تم سہی ہو، پر میرے لئے تو یہ بنیاپن، بہت مشکل ہے - ،،

''اوہ،، اس نے ہاتھ جھٹک کر کہا ''اچھا، چلو ہم اور پیئں - تم نئے سال میں کہاں کام کروگے؟،،

''اخبار میں،، میں نے کہا ''اور تعلیم بھی جاری رکھونگا، اپنی ذاتی تحریک پر میں اخبار کے عملے میں لے لیا گیا ہوں - ،،

''ٹھیک ہے، تم خود اسے زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہو - حالانکہ میں اس کے حق بالکل نہیں ہوں - ،،

وہ پیانو بجانے بیٹھ گیا اور اس کی بیوی نے ریڈیو پر آنےوالے گانوں میں سے سب سے نیا گانا سنایا- اچانک مجھے سرگم اور ریڈیو کے متعلق یاد آگیا-

''میں جام تجویز کرنا چاھتا ہوں - ،،

سب تعجب سے میری طرف مڑ کر دیکھنے لگے

کیونکہ سب ہی جانتے تھے کہ میں کبھی بھی جام نہیں تجویز کرتا تھا۔

''ہم سب یہاں ایک ساتھ ہیں، کئی ہیں اور سبھی یکجا ہونے سے خوش بھی ہیں۔ پر آؤ، ہم ان کے بارے میں سوچیں جو اس وقت تنہا ہیں، مثلاً سگنل دینے والے۔''

''کون، کون؟''، ایک ساتھ سب نے کورس میں مجھسے پوچھا۔

''سگنل دینے والے''، میں نے زور دے کر کہا ''ہاں سگنل والے، جو ریلوں کے آنے جانے کا وقت جانتے ہیں۔ رات کو وہ اپنی تنہا جھونپڑیوں سے برفانی طوفان میں نکل کر آتے ہیں۔ اس لئے کہ ٹرینوں کا استقبال کریں۔''

''تم لگتا ہے، ابھی تک کچھ نشے میں ہو؟..''، رسیم نے کہا ''اور کچھ تھوڑا زیادہ پی گئے ہو۔''

''ارے، نہیں، صرف سگنل دینے والا خطاوار ہے''، فیروز نے کہا۔ اور اس کی بیوی نے زور کا قہقہہ مارا۔ اس کے ساتھ ہی سب دوسرے بھی ہنس دئے۔ فیروز نے میری طرف دیکھا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ ''خاموش غالباً اس نے روٹھنے کی ٹھانی ہے۔ اب ہنسنا بند کیجئے۔ اچھا، یہ رہا۔ ہاں لو، سگنل دینے والوں کے لئے۔''

سب نے اپنے اپنے جام اونچے کرلئے۔

''نہیں''، میں نے کہا ''میں سگنل دینے والوں کے لئے نہیں پینا چاہتا تھا۔ میری بات تو بیچ ہی میں کاٹ دی گئی۔ میں کسی اور کے لئے پینا چاہتا ہوں اور

پہلے سے کہے دیتا ہوں کہ اگر کسی کو اس کا مذاق اڑانا ہے تو پھر وہ مجھسے ناراض نہ ہوگا۔ ،،

''ارے، تم! یہ بات ہے؟ اچھا اچھا، چلو آگے...،،

''میں ایک تنہا شخص کےلئے پیتا ہوں جو اپنے ریڈیو کے پاس بیٹھا ہوگا۔ وہ دنیا کے سارے ریڈیو اسٹیشنوں کے سارے پروگراموں کو جانتا ہے۔ وہ کنسرٹ کےلئے ویسے ہی نکلتا ہے جیسے سگنل دینےوالا ریل گاڑیوں کےلئے۔ اس کے کمرے میں ہی ساری دنیا ہے، اور وہ دنیا میں کتنا تنہا ہے!،،

میں نے ایک سانس میں ہی اپنا جام خالی کردیا۔

اس کے بعد سب نے بغیر سوچے اور قیاس آرائی کئے اپنے جام خالی کردئے اور دوسری باتوں میں مشغول ہوگئے۔

میں گزرگاہ میں نکل آیا اور نمبر گھما کر دیر تک انتظار کرتا رہا۔ رسیور خاموش تھا۔ ''یہ رہا، تمہارا سگنل دینےوالا،، میں نے سوچا ''وہ اپنا وقت ضائع نہیں کررہی ہے۔ کہیں نیا سال منا رہی ہوگی۔ بھلا اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ،،

میں اسے باربار فون کرتا رہا۔ رات کے ایک بجے ماسکو کے وقت کے مطابق میں اسے نئے سال کی مبارکباد دینا چاہتا تھا۔ ایک گھنٹے کے وقفے سے پھر فون کیا، پراگ کے وقت سے مبارک دینا چاہتا تھا۔ ایک بار پھر ایک گھنٹے کے وقفے سے، نہ معلوم اب کس وقت کے مطابق، شاید گرین وچ کے مطابق۔ صرف صبح کے ساڑھے پانچ بجے جب میں نے سڑک کے

کنارے بوتھ سے فون کیا، تب اس کی آواز سنائی دی۔

''اٹلانٹک کے وقت کے مطابق آپ کو نئے سال کی مبارک باد دیتا ہوں۔''

وہ شاید سمجھ نہیں پائی اور میں نے بھی اسے نہیں سمجھایا۔

''ہاں، تو یہ آپ ہیں؟ میں تو بس ابھی ابھی آئی ہوں۔''

''جانتا ہوں۔ میں آپ کو ساری رات فون کرتا رہا۔''

''میں اپنی سہیلی کے یہاں تھی۔''

''کوئی بات نہیں،'' میں نے کہا ''نئے سال پر آپ کے سامنے ایک اہم اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ میں دیوانگی کی حد تک آپ کو پیار کرتا ہوں۔''

''یہ بات ہے!،'' وہ ہنس دی ''نئے سال کے پہلے ہی گھنٹوں میں بڑا پیارا تحفہ ہے۔''

''آپ میری زندگی کا خزانہ ہیں، آفتاب ہیں، دولت ہیں، اف، میں نہیں جانتا کہ ایسے موقعوں پر کن الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس میں آپ کو پیار کرتا ہوں اتنا جتنا کبھی بھی نہیں کیا تھا۔ میں جانتا ہوں یہ سب لغو اور احمقانہ ہے، میں نے تو آپ کو ابھی دیکھا تک نہیں، پھر بھی ایسا ہے۔ میں آپ کے بغیر اپنی زندگی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''میرے ٹیلیفون کے بغیر،'' اس نے کہا ''آپ جانتے ہیں، اگر کسی کو یہ پتہ بھی ہو کہ یہ

لفظ محض من کی موج ہیں، پھر بھی ان کو سنکر بڑی خوشی ہوتی ہے۔،،

پہلی بار ہماری گفتگو کے دوران پیانو کے سرگم نے ساتھ نہیں دیا۔ صبح ہوگئی تھی۔ میں نے کسی زمانے میں موسیقی سیکھی تھی اس لئے میرے ذہن میں یہ موازنہ آیا کہ زندگی کے سرگم میں بھی کتنا اتار چڑھاؤ ہے، پیانو کے سفید اور سیاہ پردوں جیسا، دن اور رات کا، اچھے، روشن اور برے اور تاریک دنوں کا الٹ پھیر ہے۔

''آخر کب آپ کا دیدار ہوگا؟ بہرحال، آپ سچ ہی کہتی ہیں کہ محبت کا یہ بہت پیارا طریقہ ہے — ٹیلیفون کے ذریعے میل ملاپ، خوب رشتہ ہے۔،،

''یکطرفہ،، اس نے کہا ''میں اس خیال سے کہہ رہی ہوں کہ آپ تو مجھے فون کرسکتے ہیں اور میں اپ کو نہیں۔،،

''ہاں، اسی لئے تو مجھے آپ سے ملنا چاہئے، بتلائیے آپ کہاں رہتی ہیں؟ میں ابھی، اسی لمحے اڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤنگا۔،،

''آپ سے التجا کرتی ہوں،، اس نے کہا اور میں نے اس کی آواز کا درد محسوس کیا ''مجھے اس خوشی سے نہ محروم کیجئے نہ چھینئیے، اگر آپ بھی ویسی ہی پیش کش کریں گے جیسی کہ یقین کیجئے، مجھسے بہت سے لوگ کر چکے ہیں، تو ہم ایک دوسرے سے روابط بند کر دیں گے،، اور تھوڑے سے وقفے کے بعد اس نے اضافہ کیا ''میں آپ کے بہت قریب

آگئی ہوں ۔ آپ پہلے شخص ہیں، جس سے میں ایسے الفاظ کہہ رہی ہوں اپنے شوہر کی وفات کے بعد ۔،،

* * *

تین جنوری کو میں اپنے نئے کام پر گیا اور سارے دن میں کافی ایڈٹنگ کر ڈالی ۔ آخر میں ادارئے کے سکریٹری نے مجھسے کہا کہ میں ایک مسودہ ٹائپسٹ کے پاس پہنچا دوں، تا کہ وہ اس کو کل صبح کےلئے ضرور ٹائپ کردے ۔ دفتر میں داخلے کے دروازے کے پاس ہی ادارئے کے کارکنوں کے ٹیلیفونوں کی فہرست ٹنگی ہوئی تھی ۔ میں بلاارادہ سارے کارکنوں کے نمبر دیکھنے لگا اور اچانک اچھل پڑا ایک نمبر کو دیکھ کر، جیسے مجھے انجانے مجمع میں کوئی جانا پہچانا چہرہ نظر آ گیا ہو ۔

''یہ ویلی زادے کون ہے،، میں نے سکریٹری سے پوچھا ۔

''یہ ہماری ٹائپسٹ ہے ۔ ابھی ابھی اس کو ہی مسودہ دیکر آئے ہو، کیوں کیا ہوا؟،،

میں نے کھڑکی میں سے دیکھا : بھوری آنکھوں والی ٹائپسٹ سیڑھیوں سے اتر رہی تھی ۔ ٹھک، ٹھک، ٹھک، اس کی گورگابی کی ایڑیاں گونج رہی تھیں ۔ میں جانتا تھا کہ ان جوتوں کا سائز ۳۵ ہے ۔

* * *

یہ سب ایک کہانی کی طرح لگ رہا تھا۔ اتفاق ہم دونوں کو ایک ھی دفتر میں لے آیا تھا۔ اور ابھی تک وہ اس کے بارے میں بےخبر تھی۔ ابھی جب وہ اپنے ٹائپ رائیٹر پر ٹائپ کریگی اس کو پتہ نہ ہوگا کہ میں، کہ یہ میں ہوں؟..

مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ مجھے اس تک یہ خبر پہنچانے کی جلدی تھی۔ میں نے بوتھ سے اس کو شام کو پہلی بار اتنی جلدی فون کیا۔ لیکن فون خاموش رہا۔ ''کوئی بات نہیں،، میں نے سوچا ''مقررہ وقت پر ھی فون کرونگا۔ یہ بھی ایک انوکھی بات ہوگی۔ ،،

رات کو اسے فون کیا۔

''آداب‌عرض۔ میں نے دو گھنٹے پہلے آپ کو فون کیا تھا۔ ،،

''کیا بات ھے جو اتنی جلدی؟ میں اپنی سہیلی کے پاس تھی۔ میرے پاس بہت کام ھے۔ اس کے یہاں کام کرتی رہی۔ ،،

''یہ کیسا کام ھے؟،، میں نے ذرا شوخ آواز میں پوچھا۔

''جی ھاں، کام گھر پر لے آئی ہوں۔ ھمارے نئے افسر نے دیا ھے۔ ،،

''نیا افسر؟،،

''جی ھاں، آج ھمارے دفتر کے نئے منیجر آئے ھیں۔ ،،

''کیسا ھے وہ؟،، میں نے بڑی مشکل سے ھنسی کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

''بس یونہی، مجھے تو وہ پسند نہیں آیا۔ کچھ مغرور سا نظر آیا۔ پر سچ تو یہ ہے کہ پہلے تاثرات پر کچھ مشکل ہی ہے فیصلہ کرنا۔''

میں گڑ سا گیا۔ یہ صورت تو میرے ذہن میں بالکل تھی ہی نہیں۔

''کس وجہ سے آپ کو وہ پسند نہیں آیا؟''

''یہ فضول بات ہے۔ پہلا تاثر ہمیشہ دھوکے باز ہوتا ہے، ہو سکتا ہے، وہ اچھا آدمی ہو، بہرحال وہ خوبیوں والا آدمی لگتا ہے۔ ڈیل ڈول میں اونچا، لمبا تڑنگا ہے۔ چہرہ بھی خوبصورت ہے لیکن بہت مغرور اور افسرانہ لہجے میں بات کرتا ہے: 'صبح تک ٹائپ کردو'۔''

پہلی بار اس نے اپنے کام کے بارے میں بات کی تھی۔ لیکن میں نے اور آگے چھان بین نہیں کی۔ جتنا وہ بتا سکتی تھی میں اس سے کہیں زیادہ خود جانتا تھا۔

''اور اب آپ کہیئے، کیا حال چال ہے؟ ڈھونڈ لیا نیا کام کہیں؟''

میرے خیال میں بھی نہ تھا کہ اس کے ساتھ کوئی بھلاوے کا کھیل رچونگا۔ لیکن نہ جانے کس طاقت نے مجھے روک دیا اور میں نے کہا:

''نہیں، آپ جانئے، میں نے دوبار سوچ کر پرانی جگہ پر ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

* * *

اور صبح کو میں نے اپنی مدینہ کو پہلی بار دیکھا۔ میں نے اسے کل بھی دیکھا تھا۔ لیکن کل یہ

چہرہ بہتوں میں سے ایک تھا۔ اپنے طور پر دلکش اور پیارا، لیکن اس میں کوئی خاص امتیازی بات نہ تھی۔ عام چہرہ تھا۔ ہو سکتا ہے خوبصورت بھی ہو، پر عجیب مرجھائی اور بجھی بجھی سی خوبصورتی تھی۔

جب میں اس سے ٹائپ کئے ہوئے صفحے لینے گیا تو دزدیدہ نگاہوں سے مدینہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی صورت میں جو میرے لئے بالکل ناآشنا اور اجنبی تھی اور ٹیلیفون پر اس کی اتنی قریبی اور عزیز آواز کے درمیان ہم‌آہنگی تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

اب میں اس کے ساتھ شائستگی اور کسی حد تک خوش خلقی اور توجہ سے پیش آنے لگا۔ اور مجھ کو یہ کھوج ہوئی کہ آیا اس نے تبدیلی کو محسوس کیا ہے؟

اور یہ سب جاننے کےلئے مجھے اپنی ٹیلیفون‌والی ملاقات کے وقت کا انتظار کرنا تھا۔

* * *

''دیکھئے میں نے کہا تھا نا آپ سے کہ پہلی دفعہ کے تاثر پر ھی فیصلہ نہ کر لینا چاھئے۔ وہ ایسا مہربان اور نیک انسان لگتا ہے، بس سمجھئے مجسم نیکی...''

''فیصلہ کرنے میں ابھی جلدی سے کام نہ لیجئے۔ دوسرا تاثر بھی دھوکا دے سکتا ہے۔''

''نہیں نہیں، کل تو میں اس سے نظر بھی نہ ملاپائی تھی۔ پر آج موقع مل گیا اس کا۔ ،،

''کب اس نے یہ موقع نکال لیا، لگتا تو ایسا تھا کہ اس نے میری طرف دیکھا تک نہیں،، میں نے سوچا۔

''... اس کی آنکھیں صاف شفاف، گہری اور ذہین ھیں،، اس نے بات کا سلسلہ جاری رکھا۔

''اب تو میں رشک کرنے لگا ھوں آپ سے،، میں نے کہا۔

اس طرح اس کھیل کی شروعات ھوئی۔ اب تو میرے لئے اس کے سارے طور طریقے واضح ھو چکے تھے، اگرچہ وہ اس کے بارے میں نہیں جانتی تھی۔

* * *

میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ حالات اب میرے قابو سے باھر ھوگئے تھے، اس خط کی طرح جو لیٹر بکس میں ڈالا جاچکا ھو۔

* * *

اس کھیل کی اپنی پیچید گیاں تھیں۔ صرف یہی بات تو نہیں تھی کہ وہ مجھے جان نہ پائے، میں ابھی تک رومال کا استعمال کرتا تھا رسیور کو ڈھکنے کےلئے۔ اب مجھے سارا لغت، طریقۂ اظہار، لب ولہجہ اور برتاؤ بدلنا تھا اور سب سے مشکل تو اپنی نفسیات اور طرزفکر میں تبدیلی تھی۔

میں کام پر بالکل دوسرا شخص بننے کی کوشش کرنے لگا۔ نیک ارادے سے ہی سہی لیکن میں نے اپنے کو ناقابل رسائی بنا لیا تھا، ایسے فولادی خول میں جہاں کسی کا گزر نہ ہو سکے۔ اور وہ مجھ سے میرے ہی بارے میں فون پر باتیں کرتی۔ مجھے بڑی گہرائی تک کھنگالتی، میرے ایک ایک قدم کا انتہائی باریکی سے ٹھیک ٹھیک تجزیہ کرتی، اشارے کا، چہرے کے تاثر کا۔ یہ سہی ہے کہ اکثر میں ہی اس کو اس طرح کی گفتگو کےلئے اکساتا تھا۔ کچھ عرصے سے مجھے اکثر یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کو اکساوے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود ہی سیئیمور خلیلوویچ کے بارے میں گفتگو چھیڑتی ہے اور اس تذکرے کو رستم کے ساتھ فون پر نہ ختم ہونےوالی شبانہ گفتگو کے دوران دیر تک پسندیدگی سے جاری رکھتی ہے۔ لیکن سیئیمور خلیلوویچ سے رستم کے بارے میں اس نے کبھی ذکر نہیں کیا۔ اور یوں تو اس کی ٹیلیفون کی زندگی کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس پر مجھے خوش ہونا چاہئے یا غمگین: کبھی تو مجھے لگتا کہ رستم کے بارے میں وہ بات نہیں کرتی ہے کیونکہ وہ اس سے قطعی لاپرواہ ہے اور کبھی میں غمگین ہوجاتا یہ سوچکر کہ وہ رستم سے اپنے تعلقات کو چھپاتی ہے کیونکہ وہ گہرے، دلی اور اہم ہیں اس کے لئے۔ ایک عجیب سی بات، ایک مضحکہانگیز احساس پیدا ہو گیا۔ سیئیمور خلیلوویچ کی حیثیت سے میں مدینہ کی ٹیلیفونوالی شبانہ زندگی پر رشک کرتا۔

اور رات کو ٹیلیفون کی بات‌چیت کے دوران مجھے یعنی رستم کو، سیئی‌مور کے بارے میں نہ ختم ہونےوالی باتیں بےچین کر دیتیں۔

''چلئے، ہم دونوں ''آپ،، کے بجائے ''تم،، کہہ کر ایک دوسرے کو مخاطب کریں، دیکھئے نا اب تو ہم بہت عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں،، ایک بار میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، چلو،، میں نے رسیور سے سنا۔

''خداحافظ، شب بخیر،، میں نے بچے کی طرح خوش ہوکر کہا کیونکہ اب وہ مجھے ''تم،، کہہ کر مخاطب کریگی اور اس کو ''آپ،، کہہ کر۔

مجھے بڑی حیرانی ہوئی کہ پہلی بار میں نے اپنے بارے میں سوچا تھا۔ اپنے دوسرے ''میں،، کے بارے میں اور وہ بھی صیغۂ غائب میں۔

* * *

''میرے خیال میں، اب تم اس کی طرف سے بےتوجہ نہیں ہو۔،،

''تمہیں کیا پتہ؟،، اس نے ٹالتے ہوئے جواب دیا ''ہوسکتا ہے کہ اس کی توجہ بھی میری طرف ہو۔،،

میں نے غصے میں رسیور کو پٹک دیا اور کئی دن تک فون نہیں کیا۔ اس کی طرف میری زیادہ توجہ کو اس نے ہی نہیں دوسروں نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ ہم دونوں بڑی گرمجوشی سے کسی بات پر گزرگاہ میں باتیں کر رہے تھے کہ دفتر کا ایک پرانا کارکن ہمارے پاس آگیا۔

''کوشش کرنا بے سود ہے،، اس نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر مدینہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا ''کوشش کی گئی پر کامیابی نہیں ہوئی: ابھی تک تو کوئی بھی ہماری نوخیز ٹائپسٹ کے برف جیسے سرد دل کو پگھلا نہ سکا۔،،

ہم تینوں ہنسنے لگے اور وہ چلی گئی۔ بعد میں جب ہم دونوں رہ گئے تو اس آدمی نے کہا:

''بالکل اٹل۔ راہبہ کی طرح زندگی گزار رہی ہے۔ وہ ابھی تک اپنے متوفی شوہر کی وفادار ہے۔،،

تب مجھے معلوم ہوا کہ اس کا شوہر ہواباز تھا۔ اور کئی سال پہلے فضا میں ہی اس کی موت ہوئی تھی۔

* * *

اس شام، کام پھر ذرا دیر سے ختم ہوا، اور میں نے دیکھا کہ وہ ابھی تک ٹائپ رائیٹر پر ٹپ ٹپ کر رہی ہے۔ اس کی انگلیاں لامبی اور بہت نازک تھیں اور جب وہ ان سے ٹائپ کرتی تو ایسا لگتا کہ وہ پیانو بجا رہی ہے۔

رات کو پھر میں نے اس کو فون کیا۔ اس نے مجھ سے کہا:

''تم غصہ‌ور معلوم ہوتے ہو۔ تم نے رسیور کیوں پٹخ دیا تھا؟ اور ہاں یہ دیکھو، تمہیں جلانے کے لئے سیئی‌ہور خلیلوویچ مجھے گھر تک چھوڑنے آئے آج۔،،

''کیا، چھوڑنے آئے؟،، میں حیرت میں پڑ گیا۔ اور شاید آپ میری حیرت کی حقیقت پر شک نہیں کر سکتے۔

''بات یوں ہے کہ میں دیر تک بیٹھی کام کرتی رہی۔ اس لئے وہ مجھے گھر تک چھوڑنے آئے۔ سچ مچ وہ پرانے زمانے کے سرداروں جیسی ہمت اور دل والے انسان ہیں۔،،

''حقیقت میں وہ بیوقوف ہے،، میں نے سوچا۔ آج وہ واقعی دیر تک کام کرتی رہی تھی۔ اور میں نے یہ نہ سوچا کہ اسے گھر تک چھوڑ آؤں۔

پر میں بات کا دوسرا رخ بھی سمجھ گیا کہ وہ اپنی اصل خواھش کا اظہار کررھی ہے یعنی اگر سچ مچ سیئی‌مور اس کو گھر تک، چھوڑنے آتا تو اسے برا نہ لگتا۔ اور ہو سکتا ہے کہ وہ رسیور پٹکنے کے بدلے میں مجھے غصہ دلانا چاھتی ہو، رشک سے جلانا چاھتی ہو۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ مجھ سے ''ٹیلیفونی پرستار،، کی حیثیت سے کوئی خاص تعلق رکھتی تھی؟ میں قیاس آرائیوں میں کھو گیا۔ اور اسی وجہ سے جب دوسری بار کام پر اسے دیر تک رکنا پڑا تو پتہ تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

ہم شہر کی ویران گلیوں میں چلتے رہے۔ میں نے اس سے سوال کیا:

''ان شاموں کو آپ کیا کرتی ہیں، جب آپ کام نہیں کرتیں؟،،

''گھر پر ہی رہتی ہوں،، اس نے سادگی سے جواب دیا۔

''صرف ایسے ہی۔ اکیلی بیٹھی رہتی ہیں، تنہا؟،،

''جی ھاں، پر ایسے ھی کیوں، پڑھتی ہوں، ریڈیو سنتی ھوں۔ ''

کیا وہ سب بتائے گی جو اس نے ریڈیو کے بارے میں فون پر مجھ سے کہا ھے؟ لیکن اس نے بالکل ھی دوسری باتیں چھیڑدیں اور میں اس کا احسان‌مند ھوا۔

''یہ لیجئے، وہ رھی میری کھڑکی،'' اس نے تیسری منزل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ھم اس کے گھر کے قریب کھڑے تھے۔ اس نے دستانہ اتارا۔

''ھو سکتا ھے آپ کے یہاں گزرگاہ میں اندھیرا ھو۔ میں آپ کو اوپر تک چھوڑ آتا ھوں۔ ''

''نہیں،'' اس نے کہا۔

لیکن میں نے آخر تک جانے کا فیصلہ کیا۔

''اور ھو سکتا ھے، آپ مجھے اپنے یہاں آنے کے لئے مدعو کریں؟''

''بڑی خوشی سے۔ لیکن اب تو دیر ھو چکی ھے،'' اس نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ گھبرا رھی ھے۔

''دیر؟ کیا آپ اتنی جلدی سونے لگتی ھیں؟''

''جی نہیں...'' وہ ھنس دی۔

''اگر آپ میری خاطر ایک کپ کافی سے کرنا نہیں چاھتیں تو آئیے تھوڑی سی چھل‌قدمی ھی کرلیں میرے ساتھ۔ ''

وہ خاموشی سے میرے قریب چلتی رھی اور ھم نے کئی بار اس کے گھر کے چکر لگائے۔ میری بڑی خواھش تھی اس کے گھر جانے اور اس کو دیکھنے کی

جس کی دیوار کے پیچھے سے سرگم گونجتا رہتا ہے۔ اس کا ریڈیو اور رات کو جلنے والا لیمپ، ریڈیو کے پاس رکھا ہوا نرم سوفہ دیکھنا چاہتا تھا اور اگر اس نے مجھے اس شام اپنے یہاں بلا لیا ہوتا تو ممکن تھا کہ میں اپنے اس دورخے کھیل کے بارے میں بھی اسے بتا دیتا۔

لیکن جب ہم ایک بار اور اس کے دروازے کے پاس آئے، تو اس نے جلدی سے میرے سامنے ہاتھ بڑھا دیا۔

''اچھا، شکریہ، سیئی مور خلیلوویچ، شب بخیر۔''

''یاد رکھئے، پڑے ہوئے پتھر کے نیچے سے پانی بھی نہیں بہتا''، میں نے کہا۔

وہ مسکرا دی اور مڑ کر چلی گئی۔

میں اس کے گورگابیوں کی کھٹ پٹ سیڑھیوں پر سنتا رہا اور اچانک سمجھ گیا، وہ کیوں جلدی میں تھی، بیکل تھی اور گھڑی دیکھ رہی تھی۔ وہ میرے فون کے وقت تک گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اسے میرے فون کا انتظار تھا۔

* * *

اس کے کچھ دن کے بعد، جب ہمارا سکریٹری دفتر کے جلسے میں فضول باتیں کرنے لگا، تو میں نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی اور بولنے کی اجازت مانگ کر اس کی بخیہ ادھیڑ دی۔ اس نے مجھے جواب نہیں دیا۔ اچانک مجھے افسوس ہوا کہ کتنے سال

سے یہ آدمی اخبار میں کام کرتا ہے اور کسی ساتھی نے بظاہر اس لہجے میں اس سے بات نہیں کی۔

اس جھڑپ کے بعد مجھے کچھ بےکلی سی محسوس ہونے لگی۔ اول، تو میں شروع سے آخر تک حق پر نہیں تھا۔ دوسرے، فیروز کی نصیحت یاد آگئی۔ تیسرے، میرا دل یہ کام چھوڑنے کو نہیں چاہتا تھا۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ یہاں مدینہ بھی تھی۔ یہ سوچ کر میں سکریٹری کے کیبن میں داخل ہوا۔

اور رات کو جب میں نے مدینہ کو فون کیا تو جانتا تھا کہ گفتگو کس بارے میں ہوگی۔

''انو، جانتے ہو، رستم، ہمارا سیئی‌مور تو بڑا ہی ہمت‌والا ہے۔ کہتے ہیں، آج جلسے میں اس نے ہمارے سکریٹری کو خوب جھاڑا۔ تم جانتے ہو، یہ تو ناقابل‌یقین سی بات ہے۔ آج تک تو کسی کی ہمت نہیں پڑی تھی اس کے سامنے زبان تک کھولنے کی۔ اور یہاں وہ سب کے سامنے ہی...''

''میں اس قسم کے لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں'' میں نے کہا ''میٹنگ میں گرجنا، لوگوں کے سامنے بہادری کی باتیں بنانا۔ اور بعد میں تمہارا سیئی‌مور اکیلے میں جب کوئی دیکھنے‌والا نہ ہوگا معافی مانگنے گیا ہوگا اسی سکریٹری سے۔''

''تم کتنے خراب ہو'' اس نے رنج بھری آواز میں کہا ''تم کیوں اسے پسند نہیں کرتے؟''

''کیونکہ تم اسے پیار کرتی ہو۔ اور کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ اس طرح ہم سب ایک دوسرے سے محبت کریں گے۔''

''ہاں، تمہارے لئے تو یہ ہنسی مذاق کی بات ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ تم اس سے ملتی ہو، اس کے ساتھ سینما جاتی ہو...''

''تم کہاں سے جانتے ہو کہ میں اس کے ساتھ سینما جاتی ہوں؟''

''قیاس کرسکتا ہوں۔''

اس نے قہقہہ مارا۔ ظاہر ہے، اسے یہ خیال پسند آیا۔

''اور میرے ساتھ صرف ٹیلیفون پر وعدے۔''

''پر دیکھو نہ، ہم نے تو آپس میں یہ بات طے کرلی ہے!''

''اور تم نے میرے بارے میں اسے بتایا؟''

''کیا بات کہی! اس بارے میں کبھی کسی کو کچھ نہ بتاؤنگی۔ یہ میرے لئے تم جانتے ہو کہ کچھ...'' وہ خاموش ہوگئی، لفظ ڈھونڈنے کے لئے ''ہاں، کچھ مقدس ہے نا...''

* * *

دوسرے دن ہم دونوں سینما گئے۔ فلم آزمائش کرنے والے ہوابازوں کے بارے میں تھی۔ مدینہ بہت بےچین ہوگئی۔ ہو سکتا ہے اسی وجہ سے اس نے اس شام اپنا دل کھولدیا اور، جب ہم سایہ‌دار سڑک پر چلتے ہوئے واپس آرہے تھے،

اس نے اپنے شوہر کے بارے میں بتایا، اس بارے میں کہ اس کی ساری عمر فضا میں گزری۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے پہلی بار فضا میں ہی متعارف ہوئے۔ وہ معمولی مسافر تھی اور وہ ہواباز۔ اس کے بعد وہ میزبان فضا بن گئی تاکہ اس کے ساتھ رہ سکے۔ پھر دونوں نے شادی کرلی۔ باکو سے ماسکو اور پھر واپس، اس طرح وہ پرواز کرتے تھے۔ ہوائی جہاز کے سامان رکھنےوالے حصے میں وہ ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔ کچھ وقت ہوا اور وہ امید سے ہوگئی، ماں بننے کے لئے اس نے مقررہ چھٹی لےلی۔ آخری بار اس نے اپنے شوہر کو ہوائی جہاز کی سیڑھی تک رخصت کیا۔ ایک دوسرے کو چوما، پھر ان کے لب جدا ہوگئے۔ انھیں خبر نہ تھی کہ یہ جدائی زندگی اور موت کی جدائی ہوگی۔ اس لافانی آسمان (جہاں سے وہ کبھی لوٹےگا نہیں) اور اس لافانی زمین کے درمیان (جہاں پر وہ لاحاصل اس کا انتظار کرتی رہےگی)۔

جب جہاز اپنے سفر پر روانہ ہوا، تو اس نے عوامی رسم کے مطابق جانےوالے کے نشانوں پر پانی پھینکا، یہ شاید فضائیہ کی تاریخ میں پہلی بار ہوا تھا کہ ہوائی پٹی پر طوفانی رفتار سے بھاگتے اور اڑان بھرتے ہوئے ہوائی جہاز کے نشانوں پر پانی پھینکا گیا ہو جیسا کہ ہزاروں سال قبل جانےوالے کیلئے کیا جاتا تھا۔ پھر وہ ہوا میں بلند ہوگیا۔ اس کے بعد بارش شروع ہوگئی۔

وہ خاموش ہوگئی۔ کچھ سننے لگی اور صرف

کچھ لمحے کے بعد میں نے بھی گونج سنی اور میں سمجھ گیا کہ اس کو وہ سب لوگوں سے پہلے سن لیتی ھے۔ یہ اس کی لاجواب پیشہ ورانہ قوت سامعہ تھی۔ ھم رات کے آسمان میں رنگارنگ متحرک نقطے دیکھتے رھے۔ پھر اس نے کہا:

''وھاں اس کی قبر ھے۔ بیوہ عورتیں قبرستان جاتی ھیں اور میری نظریں آسمان کو تکتی رھتی ھیں۔''

پھر وہ مجھے بتاتی رھی کہ اکثر رات کو وہ ھوائی اڈے پر جاتی ھے اور ایک کنارے کھڑے ھوکر آنے جانے والے ھوائی جہازوں کو دیکھتی رھتی ھے۔ پھر اس نے بتایا کہ اس کا حمل ساقط ھوگیا اور شوھر کی نشانی اس کی اولاد تک نہ رھی اس کے پاس۔

میں نے اس کے چہرے پر ھاتھ پھیر کر اس کے آنسو پونچھے اور پھر بےخودی میں اسے چومنا شروع کردیا۔

''نہیں، نہیں، نہیں۔ یہ نہ کرو،'' وہ بولی اور میں نے محسوس کیا کہ کتنا مشکل سے مشکل تر ھوتا جا رھا ھے اس سے یہ کہنا۔

میں نے اسے رخصت کرتے ھی اسی وقت اس کو ٹیلیفون کیا۔

اس کی آواز میں ھیجان بلکہ خوشی بھی تھی اور مجھے برا لگا سارے رومانی لوگوں کی طرف سے، ان سب لوگوں کی طرف سے جو آسمان، زمین اور سمندر پر موت کا شکار ھوئے ھیں۔

* * *

''تم جانتی ہو،، میں نے اس سے کہا (اب ہم دونوں کام پر بھی ایک دوسرے کو 'تم، کہہ کر مخاطب کرتے تھے) ''کل تم سے جدا ہوتے ہی میں نے تمہیں فون کیا، اور سوچ سکتی ہو، تمہارا نمبر انگیج تھا۔ میں نے کئی بار فون کیا۔ دو بجے رات کو تم کس سے باتیں کرسکتی تھیں؟،،

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس بات کا اثر اتنا ہوگا۔ وہ زرد پڑ گئی اور کانپنے لگی پر جلدی ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔

''معلوم پڑتا ہے، تمہارا نمبر کسی اور سے مل گیا ہوگا۔ اس وقت تک تو میں سو بھی گئی تھی۔،،

شاید مجھے کبھی بھی معلوم نہ ہوگا ٹیلیفون پر بات کرنےوالے آدمی سے اس کا اصلی تعلق کیا ہے؟

* * *

''میں نے کل تمہیں خواب میں دیکھا۔،،

''تعجب کی بات ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اس کو تم خواب میں دیکھو جس کو ساری زندگی دیکھا نہ ہو۔،،

''میں نے خواب میں تمہاری آواز اور تمہارا ریڈیو 'نیرینگا، دیکھا۔،،

''ہوں 'نیرینگا، یہ تو سمجھ میں آنے والی بات

4—190

ہے۔ اچھا، میری آواز خواب میں کیسی دکھائی دی، یہ جاننا واقعی مزےدار بات ہوگی۔ اور تمہارے خیال میں کیسی ہوں میں؟ تم کم از کم تھوڑا بہت میرے بارے میں تو تصور کر ہی سکتے ہو؟،،

''اونچا قد، خوبصورت گھنیرے بال، لمبی ٹانگیں۔،،

میں نے کوشش کرکے اس کی شکل صورت کے خلاف بیان کیا۔

''تم حیرت انگیز حد تک صاحب بصیرت ہو،، اس نے کہا ''اب میں ہر رات تمہارے خوابوں میں آؤنگی۔،،

''تم،شاید صرف میرے ہی خوابوں میں نہیں آتی ہو۔،،

''پھر تم نے وہی بات چھیڑی؟،،

''نہیں،تم جانتی ہو، کہتے ہیں ملکہ محن بانو ہر رات سو مردوں کے خوابوں میں آتی تھی۔ اور بھلا تمہاری تعداد کیا ہے؟،،

''بس ایک، صرف تمہارے خواب میں، تم میرے مہربان فرشتے ہو۔،،

''شکریہ۔،،

''سنو، میرے مہربان فرشتے، میں تم سے ایک بات کے بارے میں مشورہ لینا چاہتی ہوں، صرف، التجا کرتی ہوں، آپے سے باہر نہ ہونا، چیخنا اور کڑھنا مت، اور رسیور بھی نہ رکھنا جب تک کہ میں پوری بات نہ کہہ لوں۔،،

میں اس باتچیت کا تین دن پہلے سے منتظر تھا۔ اور تین دن میں قیاس آرائیوں سے سر گھوم

گیا تھا کہ اس بارے میں اس نے بات‌چیت کیوں نہ چلائی؟

''اچھا تو سنو ۔ صرف سکون کے ساتھ، تمہارے پاس دل کے درد کی دوا ھے؟،،

''ھوں، روح کو کچوکے مت دو ۔ ،،

''اچھا ٹھیک ھے ۔ تین دن پہلے سیئی‌مور نے مجھ سے شادی کرنے کی تجویز پیش کی ۔ اے، تم ٹھیک تو ھو، بیہوش تو نہیں ھوئے؟،،

''نہیں،، میں نے کہا ''اور تم نے اس کو کیا جواب دیا؟،،

''ابھی تک کچھ نہیں، اب میں تم سے مشورہ لینا چاھتی ھوں ۔ تم تو میرے سب سے، سب سے اچھے دوست ھو، سب سے عزیز انسان ۔ ،،

عورتوں کی فطرت بھی حیرت انگیز ھوتی ھے ۔ ذرا کسی اور کی طرف مائل ھوئیں کہ آپ فوراً ھی ان کے لئے ''سب سے اچھے، سب سے عزیز دوست،، ھو گئے ۔

''نہیں، بالکل نہیں،، میں نے کہا ۔ اور سب سے حیرت‌انگیز بات تو یہ تھی کہ میں نے یہ بڑے خلوص سے کہا ۔ ''تم کسی سے بھی شادی مت کرو ۔ یا پھر مجھسے کرلو ۔ میں تم سے محبت کرتا ھوں ۔ آخ، کاشکہ یہ ممکن ھوتا کہ میں ٹیلیفون پر شادی رجسٹر کروا لیتا ۔ ،،

وہ دیر تک کچھ اس طرح ھنستی رھی جیسے اس کو دورہ پڑ گیا ھو ۔

''اچھا لو بھئی، عقلمند لڑکے بنو ۔ تم تو ابھی بالکل بچے ھی ھو ۔ ،،

''تم کہاں سے یہ جانتی ہو؟ تم نے تو مجھے دیکھا تک نہیں ہے۔''

''میں یہ ہر طرح سے محسوس کرتی ہوں: تمہارے اپنے ڈھنگ سے، تمہاری آواز سے، تمہاری خصلت سے، میری طرف تمہارے رویے سے۔ التجا کرتی ہوں کہ ایسے ہی رہو۔ بڑے بننے میں جلدی نہ کرو۔''

''ہوسکتا ہے میں تمہارے سیئی‌مور سے بڑا ہوں۔''

''نہیں‌نہیں، میرے عزیز۔ اس بارے میں تم صنف‌نازک کے وجدان پر یقین کرو۔''

یہ تو ہنسنے والا کھیل تھا۔ لیکن مجھے واقعی بڑی ٹھیس پہنچی۔

''مدینہ، شادی کی ضرورت نہیں۔ میں کیا کروں‌گا؟ دیکھو نا وہ مجھے رات کے دو بجے فون کرنے کی اجازت تو دے‌گا نہیں۔''

''اور ہم کچھ نہ کچھ سوچ لیں‌گے۔ دیکھو ٹیلیفون پر شوہر کو بدلنا تو ابھی تک گناہ نہیں ہے۔ اس وقت تک تمہارے گھر میں فون لگ جائے گا۔ اور میں خود ہی تمہیں فون کرلیا کرونگی۔''

میں اسے کیسے بتاتا کہ یہ سب ناممکن ہے۔

''مجھے سمجھنے کی کوشش کرو''، اس نے سنجیدگی اور اداسی سے کہا ''تم، مرد، اکثر اپنی تنہائی کی بات کرتے ہو، لیکن یہ کتنا عجیب ہے کہ تمہاری سمجھ میں یہ کبھی نہیں آتا کہ واقعی یہ تنہائیاں کیسی ہوتی ہیں تنہا عورت کے لئے۔

رات کو آنکھ کھلتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا کہ دیواریں تمہارے اوپر ڈھیئی جارہی ہیں... اچھا، آؤ غم انگیز باتوں کا ذکر نہیں کریں گے۔ اگر تم کہوگے کہ نہیں، تو میں انکار کردونگی۔''

میں اس سے کیا کہہ سکتا تھا؟ وہ خاموش رہی۔ میں نے جہاز کی گونج سنی اور میں سمجھ گیا کہ یہی ہے جواب۔ کبھی بھی ہم میں سے ایک بھی — نہ ہی میں، رستم، نہ ہی میں سیئیمور — اس کے مرحوم شوہر کے رقیب ہو سکیں گے۔

* * *

شام کو کام کے بعد اس نے اپنے گھر پر مجھے پہلی بار مدعو کیا۔ میں اس کی ڈیوڑھی اور منزل تو جانتا تھا لیکن فلیٹ جاننے میں بھول کر گیا۔ میں دیر تک اندھیرے میں گھنٹی بجاتا رہا، کسی نے میرے لئے دروازہ نہیں کھولا۔ میں نے ماچس جلائی اور اس کی روشنی میں ایک پرزہ دکھائی دیا: ''چابی پڑوسی کے پاس ہے''۔ اچانک مجھے خیال آگیا کہ یہ لفظ موسیقی کے نوٹ والے کاغذ پر لکھے ہیں۔ فوراً ہی سمجھ گیا کہ میں کہاں کھٹکھٹا رہا تھا۔ یادداشت میں سرگم کے سر تیرنے لگے۔ میں نے مڑکر سامنے والے دروازے پر دستک دی۔

''نیرینگا''، ریڈیو، نرم کرسی اور لیمپ، سب بالکل ٹھیک ویسے ہی تھے جیسے میں نے سوچ رکھے تھے۔

''ابھی لو میں تمہارے لئے دلکش موسیقی ڈھونڈھتی ہوں، سیٹی مور،، اس نے کہا ''یہ لو تم، سنو، جب تک میں کافی بناتی ہوں۔ ،،

پھر میں نے اسے چوما، آغوش میں لیا اور پیار کیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کے اندر کیسی شیریں اور بےچین عورت انگڑائیاں لے رہی ھے۔ دیوار کے اس طرف بالکل قریب ھی سرگم کی الاپ جاری تھی۔ اچانک وہ کچھ سن کر میری آغوش سے تڑپ کر نکل گئی۔ میں جانتا تھا اور انتظار کررہا تھا کہ کچھ لمحے بعد میں ھوائی جہاز کی گونج سنوں گا۔ پر کوئی بھی جہاز نہیں تھا۔

اور تب میں سمجھ گیا کہ وہ کس طرف کان لگائے ھے۔ وہ ٹیلیفون سننے کی کوشش کررھی تھی۔ یہ ٹھیک وھی وقت تھا، جب ''وہ،، فون کرتا تھا۔

وہ یعنی میں۔

اور حالانکہ میں جانتا تھا کہ ''وہ،، اب کبھی فون نہیں کرےگا، پھر بھی میں پل بھر کے لئے شبہ میں پڑگیا، میں بھی انتظار کرنے لگا، یہاں تک کہ یہ عجوبہ مجھ پر طاری ہو گیا کہ جیسے ٹیلیفون بج اٹھا۔

لیکن ٹیلیفون خاموش تھا۔

وادیم کوژیونیکوف

ریاستی انعام یافتہ مصنف کوژیونیکوف ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے - وہ سوویت مصنفوں میں بزرگ گنے جاتے ہیں اور ایک بڑے ادبی رسالے ''زنامیا،، (''جھنڈا،،) کے مدیر اعلی اور سوویت یونین کی اعلی سوویت کے ممبر ہیں - انقلاب کے ابتدائی برسوں میں سائبیریا کے متعلق ان کا ناول ''آمد سحر،،، سوویت سراغرسانوں کے بارے میں ''سپر اور شمشیر،، نامی ناول، مزدور طبقے کے بارے میں افسانے ''بالوئیف سے ملئے،، اور ''مخصوص دستہ،، اور ان کے علاوہ بہت سی دوسری کہانیاں ان کی قلمی کاوشوں کا نتیجہ ہیں -

سوویت پریس نے ان کی تصانیف کے بارے میں لکھا ہے ''اپنی تخلیقات میں کوژیونیکوف انسان کا کردار بہت ہی ترچھے زاویوں سے، شدید ٹکراؤ اور تصادم میں جو تاریخ اور زندگی پیدا کرتی ہے

اور حقیقی مشکلات سے دوچار حالات میں دکھاتے ھیں۔ لیکن یہیں سوویت انسان کے ''استقلال کے معیار،،، وطن، زندگی اور اپنے کام سے محبت کا انکشاف بھی ھوتا ھے۔،،

معمولی دورہ

انتہائی شدید سردی نے ہر چیز کو منجمد کردیا ہے لیکن سورج اس طرح چمک رہا ہے جیسے یہ افریقہ ہو۔ بڑا دریا پتھر کی طرح تہہ بہ تہہ جم گیا ہے اور وہ اتنی تیزی سے چمک رہا ہے کہ اس کی نفوذ کرتی ہوئی شعاعوں کی خشک سرسراہٹ کو سنا جاسکتا ہے۔ تائیگا کا نیلا اور گہرا بھورا براعظم ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاف و شفاف آسمان نے اپنے سارے دروازے کھول دئے ہیں۔

اورخاموشی تو ایسی ہے جیسی غالباً صرف خلائے کائنات میں ہوتی ہے۔ ایک گہرے نشیب کے کنارے، جس کی تہہ میں بڑے بڑے، بلند بالا لارش کے درخت کھڑے ہیں، ایک ٹریکٹر برف ٹرالی کو گھسیٹ کر لے جا رہا ہے جس کے اوپر نئے ترپال سے ڈھکا سیمنٹ کے بوروں کا ڈھیر ہے۔ ٹریکٹر برف کے سخت پرت کو اس طرح توڑ رہا

ہے جیسے وہ چینی مٹی کا ہو اور ایک گہری لیک اپنے پیچھے بناتا جارہا ہے۔

ٹریکٹر کا ڈرائیور چوکھٹے فریم کی فیشن ایبل رنگین عینک لگائے ہے۔ اس کی کیبن کے اندر گرمی ہے اور ڈرائیور کی سمور کی جیکٹ اور ٹوپی المونیم کی اس کھونٹی سے ٹنگی ہیں جو بازو کی دیوار میں لگائی گئی ہے، اور قریب ہی ایک بڑا سرخ تھرماس آہنی خانے میں اس طرح استادہ ہے جیسے وہ آگ بجھانے والا سلنڈر ہو۔

پیچھے کی دیوار پر ایک شیشے کے فریم میں عالمی چمپین یوری ولاسوف کی تصویر، جو رسالہ ''اوگونیوک،، کے سرورق سے کاٹی گئی ہے، مضبوط اور گٹھیلے رگ پٹھوں کی ساری شان وشوکت کے ساتھ نظر آرہی ہے۔

یوری ولاسوف کے مقابلے میں ٹریکٹر ڈرائیور سیرگئی لیوتیکوف حقیر لگتا ہے۔ اس کے شانے تنگ ہیں اور سنہرے بال باریک کترے ہوئے اور بکھرے ہیں، کندھوں کی ہڈیاں جھکی اور پشت سے باہر نکلی ہیں۔ اس کا لباس ظاہر کرتا ہے کہ وہ شمال کی سردی کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کھلے گلے کی فلالین کی قمیص، پتلے سوتی کپڑے کا پتلون جس میں چوڑے کپڑے کے تسمے لگے ہیں، چپٹی نوک والے موٹے چمڑے کے سیاحتی بوٹ اور سفید اونی موزے جن کے سرے الٹ لئے گئے ہیں۔ لیوتیکوف کے گالوں پر ''جہازی کپتان،، جیسی داڑھی بڑھی ہوئی ہے جو اس کے

نوخیز چہرے کے لئے چٹائی‌دار کناری کا کام دے رہی ہے جس میں بلی جیسی گستاخ اور شفاف آنکھیں نظر آتی ہیں۔

اپنی کم‌سنی کے باوجود لیوتیکوف موٹر ڈپو میں مستری ہے۔ وہ شمال میں تین سال سے کام کر رہا ہے اور اس کو انتہائی ذمہ‌داری کے کام سپرد کئے جاتے ہیں۔ وہ سنجیدہ آدمی ہے اور اپنی قیمت کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اس کی شادی ہوچکی ہے۔ اس کی بیوی لیباریٹری میں کنکریٹ کے تجزئے کا کام کرتی ہے۔ وہ سروقد حسین جارجیائی عورت ہے جس کی جذبات سے بھرپور آنکھیں دو سیاہ سورجوں کی طرح چمکتی ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ لیوتیکوف میں اس کو کیا کشش نظر آئی۔ جب تمارا گوتسیریدزے ٹکنیکی اسکول سے فارغ ہوکر آرکٹک کی اس جائے تعمیر پر آئی اور ایک بار لیباریٹری کی بارک میں چولھا جلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، اس کے سنولائے ہوئے چہرے پر آنسو نکل نکل کر جم رہے تھے کہ لیوتیکوف آگیا اور اس نے کہا:

”آؤ چلیں۔“

وہ تمارا کو اپنی پہیوں‌والی کیبن میں لے آیا اور بولا:

”یہ رہی تمہاری رہنے کی جگہ۔“

”اور تمہارا کیا ہوگا؟“

”میں گیراج میں سوؤنگا۔“

”نہیں، مجھے یہ منظور نہیں“ تمارا نے ذرا

تن کر کہا ''بہرحال ہم صرف مرد اور عورت تو نہیں ہیں - ہمیں کچھ اس سے بالاتر ہونا چاہئے...''
پھر اس نے ذرا افسردگی سے کہا ''خیر اگر بیچ میں کوئی آڑ ہو جائے تو زیادہ اچھا ہوگا - ''

شام کو لیوتیکوف ایک ٹپاپ لاری لیکر آگیا جس میں آنکڑوں سے جوڑے ہوئے تختے تھے -

طے ہوا کہ وہ اپنی جائے رہائش کو باری باری صاف کریں گے لیکن تمارا کو وقت ہی نہیں ملتا تھا - لیوتیکوف نے اسکو شریف‌زادی ہونے کا طعنہ دیا -

تمارا کو یہ بات بری لگی:

''جارجیا میں مرد ہمیشہ عورتوں کے ساتھ سورما سرداروں جیسا برتاؤ کرتے ہیں'' اس نے ڈینگ ماری ''یہ ہماری امتیازی قومی خصوصیت ہے - اگر میں تمہاری بیوی ہوتی تو بات دوسری تھی، پھر تمہاری جیسی مرضی...''

''جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں تم سے کبھی بھی شادی نہ کروں'' لیوتیکوف نے غصے میں کہا-

''آخر کیوں نہیں؟'' تمارا نے بھڑک کر پوچھا ''کیا میں بدصورت ہوں؟ ہاں، بدصورت؟''

''بہت خوبصورت ہو'' لیوتیکوف نے ملامت کرتے ہوئے کہا ''میں نے تو سوچا ہی نہ تھا کہ ایسے خوبصورت لوگ بھی ہوتے ہیں - ''

''اور یہ دیکھو ہوتے ہیں'' تمارا نے کہا اور بڑے فاتحانہ انداز میں اس نے اپنے دونوں سیاہ سورجوں کا اس کو نشانہ بنا دیا -

لیوتیکوف کچھ گھبرا گیا اور اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

...ماہرین ارضیات کا ایک جتھہ ٹنڈرا میں مشکلات میں مبتلا ہو گیا تھا۔

لیوتیکوف کو ان کو ڈھونڈھنے کا حکم ملا۔ وہ دو ہفتے بعد لوٹا تو اس کا بارکش ٹریکٹر جمے ہوئے یخ اور کیچڑ کا ایک تودہ تھا۔ اس کے کپڑے سخت کالی مٹی جیسے ہو رہے تھے۔ ٹریکٹر کیچڑ میں پھنس گیا تھا اور لیوتیکوف نے اس کو کھینچ کر نکالا تھا۔ اس نے کچھ درخت کاٹ کر تن تنہا ٹریکٹر کی پیٹیوں کے نیچے ڈالے تھے، تن تنہا کیونکہ چار ماہرارضیات ادھر ادھر بھٹکتے بھٹکتے بھوک سے بےجان ہو گئے تھے اور ٹرالی میں پڑے تھے۔ ماہرین کو تو طبی مرکز لے جایا گیا اور تمارا لیوتیکوف کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ اس نے لیوتیکوف کے منجمد کپڑے بیدھڑک پھاڑ دئے اور اس کو یہ کہہ کر دلاسا دیتی رہی کہ وہ اب قدیم زمانے کا کوئی سورما سردار لگتا ہے جو اپنے زرہ بکتر سے لیس ہو۔ اس نے لیوتیکوف کو گرم پانی سے نہلایا اور گلوگیر آواز میں کہتی رہی کہ اس کو کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا۔

''ارے میں تو ڈاکٹر بن سکتی تھی،، تمارا نے یقین دہانی کی ''میں تو تعمیری کام میں آگئی کیونکہ مجھے میڈیکل کالج میں داخلے کے لئے کافی نمبر نہیں ملے۔،،

لیوتیکوف کی انا کو اس مادرانہ فکر سے دھکا لگا۔

صبح سویرے وہ اس کیبن سے نکل گیا اور پھر وہاں نہیں آیا۔ وہ موٹر ڈپو میں رہنے لگا۔

ایک دن تمارا نے لیوتیکوف کا ٹریکٹر روک کر کہا کہ وہ اس کو لے چلے۔ اس نے لیوتیکوف کو ملامت کرتے ہوئے پوچھا:

''ارے، بھول گئے مجھکو اور اب میری یاد کبھی نہیں آتی؟''

''آتی ہے''، لیوتیکوف نے ایمانداری سے قبول دیا۔

''اور میری یاد بہت آتی ہے تمہیں؟''، تمارا نے سختی سے اپنی جرح جاری رکھی۔

''اب بہت''، لیوتیکوف نے افسردگی سے کہا۔

''اور کام کے دوران بھی؟''

''ہاں، کام پر بھی۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو''، تمارا نے قطعی طور پر اعلان کر دیا اور پھر ذرا جھجک بغیر دھرا دیا ''ہاں، سچ مچ تم مجھ سے محبت کرتے ہو!''، پھر اس نے ناراضگی سے اپنے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا ''پھر تم ضرور بیوقوف ہو۔ صرف بیوقوف آدمی ہی ایسی صورت پیدا کر سکتا ہے جس میں عورت کو اس کے جذبات کے بارے میں بتانا پڑے۔''

''ہاں، میں ضرور بیوقوف ہوں''، لیوتیکوف نے عاجزی سے مان لیا۔

''اور مجھ سے یہ بیوقوفی ہوئی کہ میں تم سے محبت کرنے لگی''، تمارا نے آہ بھر کر کہا اور پھر غصے سے بپھر کر اس نے یہ عہد کیا ''ارے

یاد رکھنا، ہماری ساری زندگی اس کو یاد رکھنا۔ میں یہ کبھی نہ بھولوں گی کہ تم نے مجھے پہلے اعتراف کرنے پر مجبور کرکے کس طرح ذلیل کیا ھے۔ عورت کے لئے تو یہ بڑی شرم کی بات ھے!،،

''لیکن میں نے اس کو پہلے کہا...،،

''تم نے کیا کہا؟ جب میں نے تم سے پوچھا تو تم کچھ بڑبڑا کر رہ گئے،، پھر اس نے ناراضگی سے پوچھا ''اب مجھے بتاؤ کہ میرا گھمنڈ کہاں رہا؟ مجھے اتنا گھمنڈ تھا،، اور پھر اس نے بدلہ لینے کی دھمکی دی ''لیکن اب تمہیں پتہ چلیگا کہ میں کتنی گھمنڈی ہوں۔،،

اور دونوں کی شادی ہو گئی۔ تمارا نے بدلہ لینے کا عہد پورا کیا۔ وہ عام طور پر لوگوں میں لیوتیکوف کو بڑی شان سے شوہر کی طرح برتاؤ کرنے کی اجازت دیتی لیکن گھر میں سارا کام کاج لیوتیکوف کے سر پڑتا۔ وہ گھر صاف کرتا، کھانا پکاتا حتی کہ کپڑے بھی دھوتا۔ لیکن گھر گرھستی کے کاموں میں اس کو پہلے کا تجربہ بھی تھا۔ جب وہ آٹھ سال کا تھا تو اس کی ماں پہلے ایک زخمی سپاھی کو لائی، پھر دوسرے کو اور ان کو ایک تہہ‌خانے میں نازیوں کے ظلم وستم سے بچنے کے لئے چھپا دیا۔

ماں ایک بدمست شرابی پولیس‌والے کی گولی کا شکار ہو گئی اور لیوتیکوف ان زخمی سپاھیوں کی دیکھ بھال کرنے، ان کو کھانا کھلانے لگا۔

جب وہ اچھے ہوگئے تو لیوتیکوف ان کے ساتھ چھاپہ ماروں کے ایک دستے میں چلا گیا، لیکن اس کو ہوائی جہاز کے ذریعہ عقب میں واپس کر کے ایک اطفال خانے کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کے بعد جلد ہی اس ٹرین پر بمباری ہوئی جو اس اطفال خانے سے تخلیہ کئے ہوئے بچوں کو لے جارہی تھی۔ لیوتیکوف نے ان بارہ بچوں کو جمع کیا جو بمباری سے بچ رہے تھے اور ان کو ماسکو لایا۔ پھر وہ ایک بورڈنگ اسکول کے ساتھ سائبیریا چلا گیا۔

وہ ایک حرفتی اسکول میں تربیت حاصل کر کے کارخانے میں کام کرنے لگا، ایک چوبی بکس پر اپنی مشین کے پاس کھڑا رہتا۔ پھر اس نے مستری اور ڈرائیور کا کورس لیا۔ اس کورس کے ڈائرکٹر نے جو ٹینک دستے میں کام کرتا تھا لیوتیکوف کو گود لینا چاہا۔ لیکن لیوتیکوف نے کہا ''ارے مجھے بیٹا بنانے کی کیا ضرورت۔ میرے پاس جو سندیں ہیں ان سے تو میں خود جس کو چاہوں بیٹا بنالوں...''

اس نے شمال میں کام کرنے کی خود پیش کش کی جہاں اس کی بے خوف رہنے سہنے اور جان توڑ کر کام کرنے کی خوبیوں نے ہر ایک کے دل میں اس کی عزت پیدا کردی۔

متذکرہ دورے سے پہلے لیوتیکوف رات گئے گھر لوٹا۔ اس نے ٹریکٹر کو طویل دورے کے لئے خود ہی تیار کیا۔ تمارا سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی دمک تھی — پراسرار، نازک، پرغرور

سی نیک مسکراہٹ، ایسی مسکراہٹ جس کو عظیم فنکاروں نے بڑے احترام کے ساتھ مریم کے لئے مخصوص کیا ہے۔

تمارا سوتی رہی لیکن وہ اس کے قریب پڑا جاگ رہا تھا اور اس خیال سے اپنے کو پریشان کر رہا تھا کہ وہ واقعی تمارا کا قصوروار ہے۔ تمارا کے پھولے چہرے پر زردی مائل زنگ جیسے داغ تھے، اس کے ہونٹ جو پہلے بہت نرم تھے اب زخم کی طرح پھٹے اور پھولے ہوئے تھے۔ وہ اپنی گرم، گول اور نکلی ہوئی توند سے اس کو دبا رہی تھی۔ لیوتیکوف کو اس بات سے بڑا خوف اور دہشت ہوئی جس نے اس کی بیوی کو ایسی بدصورت بنادیا ہے۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ تمارا کا قاتل ہے اور اگر تمارا بچے کی پیدائش کے دوران مر گئی تو وہ واقعی اس کا قاتل بن جائیگا۔

جب اس نے کوفت کی حالت میں تمارا کو اپنی اذیت کا سبب بتایا اور بڑی عاجزی سے اس سے معافی چاہی تو تمارا نے اس کی بات بڑی مہربانی سے سنی اور متکبرانہ برتری کے انداز میں کہا:

"ارے، کیسے بدھو ہو تم! میں تو اب بہت خوش ہوں"، اور اس نے بڑی خود اعتمادی سے وعدہ کیا "جلد ہی ہم تین ہو جائیں گے اور میں تو بہت خوش ہونگی۔"

لیوتیکوف کے لئے یہ حیرت کی بات تھی کہ تمارا جو کچھ دن پہلے نسوانی حیاداری کا اتنا خیال رکھتی تھی اب اجنبیوں تک سے اپنے حاملہ

ہونے کے بارے میں بلاجھجک بات کرتی جس کو وہ بےشرمی سمجھتا۔

اس کو ماں بننے پر بڑا فخر تھا اور لگتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں ڈینگیں مارتی ہے۔ پہلے وہ اس کے بازو میں بازو ڈالکر چلنا گوارا نہیں کرتی تھی لیکن اب وہ ہمیشہ ھاتھ میں ھاتھ دیکر چلنے لگی اور اپنا پیٹ ہمیشہ بڑی اہمیت کے ساتھ نکالے رہتی۔ ابھی حال ہی کی بات ہے کہ کلب میں وہ ضد کے ساتھ انتظار کرتی رہی یہاں تک کہ سب تماشائی ہال میں بیٹھ گئے اور جب تیسری گھنٹی ہوگئی تو وہ پورے ہال کو بلاعجلت کئے پار کرکے، لیوتیکوف کے بازو پر زوروں سے جھکی ہوئی اپنی نشست تک گئی اور وہ بھی اس وقت جب پوری قطار کھڑی ہو گئی اور اس کو احترام کے ساتھ گزرنے دیا۔ اس نے انکسار کے ساتھ جان پہچان والوں کو اشارے سے سلام کیا اور اپنے چہرے پر ایک مخصوص وقار قائم رکھا۔

اس سے پہلے تمارا لیوتیکوف کی ہر بات اور کام پر اتنی ملامت اور بےصبری نہیں دکھاتی تھی جتنی اب۔

''اچھا تم مجھ سے چاھتی کیا ہو، تم آخر مجھ کو لعنت ملامت کیوں کرتی رہتی ہو؟،، لیوتیکوف نے شکایت کرتے ہوئے سوال کیا ''جو کچھ میں ہوں سو ہوں۔ میں اس سے اچھا نہیں ہونگا۔،،

''نہیں. ہوگے!،، تمارا نے درشتی سے کہا

''تمہیں بہتر بننا پڑیگا جب تم باپ ہوگے اور بچے پر اپنا اثر ڈالوگے۔''

''اور تم؟ بالکل بےعیب ہو؟''

''ماں جیسی ہو سکتی ہے'' تمارا نے ٹھنڈے دل سے جواب دیا ''اس کے لئے تو ماں ہی ہونا کافی ہے، لیکن باپ تو خاندان کا بزرگ ہوتا ہے...''

''خاندانی زندگی کے بارے میں تمہارے خیالات بہت فرسودہ ہیں۔''

''یہ تو ساری انسانیت کے عام اصول ہیں۔''

''اور میں ضمیر کا خیال رکھتا ہوں۔ جو ہم میں سے اچھا ہو اس کو خاندان کا بڑا ہونا چاہئے۔''

''یہ تو میں جانتی ہوں کہ میں تم سے اچھی ہوں'' تمارا نے غصے سے کہا ''لیکن بزرگ تم ہی ہوگے۔ اب تم ذمہ‌داری سے جان مت چھڑاؤ۔''

لیوتیکوف کو غیرمتوقع طور پر تعمیرات کے کالج سے خط ملا تھا کہ اس نے جو خط اور داخلے کے لئے تحریری کام بھیجا تھا اس کی بنا پر اسے مراسلتی امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دی جاتی ہے۔

''لیکن میں نے تو کوئی درخواست نہیں بھیجی تھی'' لیوتیکوف نے حیرت سے کہا ''یہ کوئی غلطی ہے!''

''میں نے لکھا تھا'' تمارا بولی اور کہنے لگی ''میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے کا باپ اعلی تعلیم سے محروم ہو'' اور پھر وہ بڑی نرمی سے بولی ''کہو نا کہ تم ہمارے ننھے کو ابھی سے پیار کرنے لگے ہو؟''

''میں تم سے محبت کرتا ہوں،، لیوتیکوف نے گرمجوشی سے کہا ''لیکن جب وہ یہاں نہیں ھے میں اس سے ڈرتا ہوں۔ ،،

''لیکن میں تو اب تم سے زیادہ اس سے محبت کرنے لگی ہوں۔ ،،

''تمہارا کیا مطلب ھے — تو گھر میں میرا تیسرا نمبر ہو جائیگا؟،،

''اور کیا!،،

اور اس رات، دورے پر جانے سے پہلے، لیوتیکوف مشکل سے ھی سویا ہوگا۔ وہ تمارا کے لئے بہت ڈرا ہوا تھا اور اس ڈر سے کہ کہیں وہ تمارا کو کوئی دھکا نہ دے دے دوسری طرف کی دیوار سے چپکا ہوا تھا۔ کسی نے اس سے کہدیا تھا کہ اگر حاملہ ماں خوف سے جاگ اٹھتی ھے تو بچے کے بدن پر جنم داغ پڑجاتے ھیں۔

پوپھوٹنے سے پہلے لیوتیکوف ذرا بھی آھٹ کئے بغیر کمبل سے نکلا، اپنے کپڑے سمیٹے اور باورچی خانے میں ان کو پہنا۔ اس نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا ''میں تم دونوں کو دل و جان سے چاھتا ہوں۔،، اس نے کاغذ پر دستخط کئے اور اس کو ایک برتن کے ڈھکن پر رکھ دیا اور گھنے، سرد کہرے میں جس کے اندر سے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا موٹر ڈپو روانہ ہو گیا۔ وہ ٹریکٹر لئے نوآمد لوگوں کے مکان تک گیا جہاں کنکریٹ بچھانے والی مزدور ٹیم کا لیڈر نیستور فومیچ پولوخین جو سارے شمال میں مشہور تھا اس کا پہلے ھی سے منتظر تھا۔

ٹھوس کاٹھی، چوڑے شانوں‌والے پولوخین کے چہرے سے اقتدار و اختیار ہمیشہ ٹپکتا تھا اور جنگ سے پہلے ہی وہ بشکیریائی ریپبلک کے معزز معمار کی حیثیت سے نام پیدا کرچکا تھا۔ محاذ جنگ پر اس کو تین بار ناموری کا آرڈر اور بہت سے تمغے مل چکے تھے اور والگا پر پن‌بجلی گھر بنانے کے لئے اس کو سوویت یونین کا سب سے بڑا انعام لینن آرڈر عطا کیا جا چکا تھا۔

پولوخین اپنے کو کنکریٹ بچھانے والا نہیں بلکہ سیمنٹ کاری کا ماہر کہتا تھا۔ وہ طرح طرح کی چٹانوں کی مٹی ملانے میں ماہر تھا جو مختلف تعمیرات میں بنیاد کا کام دیتی ہے۔

''معمولی سربراہوں کی بات تو جانے دو میرے سامنے وزیر تک کانپتے ہیں،، پولوخین نے اپنے آپ کو سند عطا کی ''اگر میں عمارت کو ہر طرف سے کس نہ دوں تو عمارت ایک طرف جھک ہی جائے۔ سب لوگوں کے لئے پانی بس پانی ہے اور میرے لئے وہ کیمیائی محلول ہے۔ ارے یہ سور تو سنگین سے سنگین سلوں میں در آتا ہے جیسے وہ روئی کے گٹھے ہوں۔ ایک اکادمیشن کاپیتسا ہیں۔ وہ مادے کی بالاتر سیالیت پر کام کر رہے ہیں۔ وہ دباؤ کے تحت دھات کے اندر سے رقیق کو گذار دیتے ہیں یہ تو اچھا نتیجہ نکلا! لیکن مجھے اس کے برعکس نتائج حاصل کرنے ہوتے ہیں، یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ رقیق کہیں نہ در آئے۔ مجھے تو ایسا ٹھوس بلاک بنانا ہوتا ہے جس پر آپ جو

چاہیں بنا سکتے ہیں — دور حاضر کی یادگار، پن بجلی گھر، کارخانہ یا ٹیلی ویژن مینار۔ میں اپنی بنیادوں کے لئے آئندہ نسلوں کے سامنے اپنے کو جواب دہ سمجھتا ہوں اور مجھے ہمیشہ اپنی ذمے داری کا احساس رہتا ہے۔"

تھوڑا ہی عرصہ ہوا جب پولوخین نے ناقابل بیان دشواری کے ساتھ تعمیرات کے کالج کا مراسلتی کورس ختم کیا تھا۔ لیکن اس نے اس بات کو راز رکھا تھا کہ وہ سندیافتہ انجنیر ہے۔ ایک طرف تو اس خودپسندی کی وجہ سے کہ لوگ اس کو نوخیز انجنیر نہ سمجھیں اور دوسری طرف کہ وہ نئے انجنیروں کے سامنے یہ دعوی کر سکے کہ وہ مزدور ہے لیکن وہ انجنیروں سے کم معلومات نہیں رکھتا۔

پولوخین ایک بڑا جھبرا سا اوورکوٹ پہنے تھا جس کا سمور کا کالر گرم اور بڑا تھا کہ بس آدمی اس میں ڈھک اٹھے۔ ڈرائیور کی کیبن تک چڑھکر اس نے لیوتیکوف سے کہا:

"بہرحال جگہ کو گرم کرلیا۔ تم ایندھن کی کفایت نہیں کرتے"، اس نے پہلو کی کھڑکی گھس کر صاف کی اور آسمان پر شمالی روشنیوں کی سفید آگ دیکھنے لگا۔ اس نے خوب سوچ کر کہا "یہ چمکتی ہیں، لیکن کیوں چمکتی ہیں، سائنس ابھی اس کو صاف طور پر نہیں معلوم کر سکی ہے"۔ پھر بولا "آؤ چلیں..."

تھوڑی دیر بعد اس نے ناراضگی سے لیوتیکوف سے پوچھا:

''آخر تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟ یا تمھارے تہذیبی تقاضے صرف سینما تک محدود ہیں؟''

''ٹھیک ہے''، لیوتیکوف نے اتفاق کرتے ہوئے کہا ''سینما۔''

''بیکار بات ہے''، پولوخین نے کہا ''آدمی دوسرے آدمیوں کے ساتھ مل جل کر نشو و نما پاتا ہے۔''

''میں تو نشوونما پا چکا ہوں۔''

''ایسے لوگ ہیں جو نشوونما کو اپنے لباس کے نمبر سے ناپتے ہیں۔''

''اور میں بھی انھیں میں سے ہوں''، لیوتیکوف نے کہا ''میرا نمبر ہے ۴۸۔''

''برا مان گئے؟''، پولوخین نے گھبرا کر پوچھا۔

''نہیں، صرف بات یہ ہے کہ راستہ گپ ھانکنے والا نہیں۔ ڈھالو پہاڑیاں ہیں۔''

''تب تو میں چپ رہونگا''، پولوخین نے کہا۔ لیکن ذرا دیر کے بعد پوچھا ''اگر میں تھوڑی دیر کے لئے آنکھ جھپکا لوں؟''

''چلو ٹھیک ہے''، لیوتیکوف نے اجازت دے دی۔

پولوخین نے اپنی نشست پر پیچھے تکیہ لگالیا اور اپنے پیر پھیلا لئے جن میں بڑے بڑے سفید نمدے کے جوتے تھے۔ اس کی گھنی اور الجھی ہوئی پلکیں بند ہو گئیں، اس کے چہرے پر نرمی اور سکون کے آثار پیدا ہو گئے اور وہ فوراً اونگھ گیا۔ اب اس کے چہرے سے اختیار نہیں ظاھر ہو رہا تھا بلکہ وہ ایک کمزور بوڑھا اور بےچارہ نیک آدمی لگتا تھا۔

اب لیوتیکوف کو یہ احساس کرکے تکلیف ھورھی تھی کہ اس نے پولوخین سے ایسے اکھڑپن سے بات‌چیت کی تھی۔ لیکن وہ شروع سے ھی پولوخین سے ناراض تھا کیونکہ پچھلے دن اس نے موٹر ڈپو کے ڈائرکٹر سے کہا تھا:

''ایسے لمبے سفر کے لئے اس جیسے لڑکے کو مجھے کیوں دیا؟ کوئی ٹھکانے کا آدمی نہ تھا؟،،

اگرچہ موٹرڈپو کے ڈائرکٹر نے لیوتیکوف کو سب سے اچھا سرٹیفیکٹ دیا تھا پھر بھی اس نے کہا:

''واقعی نیستور فومیچ آپ کے جانے کی کیا ضرورت ھے۔ اسٹور کا منیجر چلا جاتا۔،،

لیکن پولوخین نے ڈائرکٹر کو جواب دیا تھا:

''میں لوگوں پر بھروسہ کرتا ھوں۔ میں کسی کو چور نہیں کہتا۔ لیکن میرے راستے میں پرانے زمانے کی یادگاریں بھی آتی ھیں اور ان پر کوئی خاص نشان تو بنا نہیں ھوتا۔ وہ بھی آدمیوں سے ھی مشابہ ھوتی ھیں...،،

پولوخین سفر کے دوران تقریباً سارے دن سوتا رھا۔ جب کہیں کوئی گڈھا پڑتا اور وہ ھچکولے سے لیوتیکوف کے کندھے پر جاپڑتا تو وہ جاگے بغیر بڑبڑاتا ''معاف کرنا،، اور لیوتیکوف بڑے گرم اوور کوٹ میں ملبوس اس کے بھاری جسم کو الگ ھٹا دیتا۔

انھوں نے رات ایک چھوٹی بستی میں گذاری اور ابھی آسمان پر صبح کے رنگ مشکل سے پھیلے ھوں گے کہ پولوخین نے لیوتیکوف کو جگادیا۔ پولوخین نے شیو کرکے یوڈی‌کالون لگایا۔ اب وہ

بشاش، تازہ‌دم اور جوش سے بھرا تھا۔ اس نے لکڑی کی چھپٹیوں کی آگ پر انڈے بھونے اور ڈرائیور سے کہا:

”کھاؤ۔“

”اور آپ؟“

”میں نے روٹی اور پیاز اڑائی ہے“، پولوخین نے زندہ‌دلی سے جواب دیا ”میں انڈوں سے پرہیز کرتا ہوں — کولیسٹرول۔ میری عمر میں لافانی بننے کے لئے زحمت اٹھانی ہی پڑتی ہے اور پیاز میں وٹامن ہوتی ہیں، رلا تو دیتی ہے لیکن سانس لینے میں مدد دیتی ہے۔ جب لوگوں کے درمیان ہوتا ہوں تو پیاز نہیں کھاتا۔ یہ بدتمیزی ہے۔ لیکن ایسے سفر کے دوران کھاتا ہوں۔“

ٹنڈرا کی سفید تابندگی میں بڑی جگمگاہٹ تھی۔ صاف خشک ہوا میں ہلکا برفانی غبار چمک رہا تھا اور پورے دوسرے دن کا سفر پہلے کی طرح زیادہ تھکا دینے والا نہ تھا۔ لیوتیکوف نے یہ فیصلہ کیا کہ اب رات کو ٹھہرا نہ جائے۔ وہ آدھی رات کے بعد منتقلی کے ڈپو پہنچا جو دریا کے کنارے تھا۔

لیوتیکوف کے ہاتھ، پیر اور پیٹھ میں درد تھا جیسے وہ اس سارے وقت کوئی بھاری بوجھ لاد کر چلتا رہا ہو اور جب ٹریکٹر سے اتر کر نیچے آیا تو وہ لڑکھڑا گیا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی لمبے سمندری سفر میں برابر ہچکولے کھاتا رہا ہو۔ ٹریکٹر سفر کے دوران برابر اسی

طرح جھولتا رہا تھا جیسے سمندر کی لہروں پر کشتی ہلکورے لیتی ہے۔

انتہائی تھکن کے باوجود اس نے زندہ‌دلی سے کہا:

''ذرا میں ایک آدھ گھنٹہ سو لوں۔''

اور وہ تین گھنٹے سویا۔ جب وہ باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ ٹرالی خالی تھی۔

منتقلی کے ڈپو میں جہاں سے پولوخین کو اول درجے کی سیمنٹ ملنی تھی لادنے کے لئے مشینیں وغیرہ نہ تھیں اور کوئی آدمی بھی اس کو لادنے والا نہ تھا۔

اسٹور کے منیجر نے حقارت سے کہا:

''یہ کوئی اسٹور ہے، یہ تو گھورا ہے گھورا۔ آخری بیڑا سامان لیکر دریا پر آرہا تھا کہ دریا کا نچلا حصہ جم گیا۔ سب کچھ خشکی پر لانا پڑا۔ اگر آپ اس کو خشکی کہیں۔ ارے ماقبل تاریخ کے زمانے کے دیوپیکر جانور اس کچھار میں آکر خرگوشوں کی طرح ختم ہو گئے۔ اور میں خود کون ہوں؟ بس منیجر، ہاں، مجھے یہی عہدہ سپرد کیا گیا ہے۔''

''بہرحال، دوست تم منیجر ہو۔ کوئی ترکیب نکالو''، پولوخین نے کہا۔

''میرے پاس مزدور نہیں ہیں! نہیں ہیں!''، اور منیجر نے بےبسی کا اظہار کرنے کے لئے اپنے ہاتھ زوروں سے ہلائے۔

''مان لو کہ ہم جنتا سے اپیل کریں؟''

''یہاں جنتا کہاں ہے؟ یہاں لوگ نہیں ہیں۔

یہاں کی آبادی، ماہی گیروں کی تین جھونپڑیاں۔ مرد تائیگا میں ہیں۔ صرف عورتیں گھر پر رہ گئی ہیں۔ وہ کسی طرح کی بھرتی کے لئے آمادہ نہ ہونگی۔ ان کو پیسے سے بھی دلچسپی نہیں ہے۔ مچھلیاں اور سفید لومڑیوں کا سمور ان کے پاس بہت کافی ہے۔ ان میں صرف ایک صورت میں کوئی سماجی جذبہ ابھرتا ہے — جب کسی پر مصیبت پڑجاتی ہے۔ نہیں تو وہ اپنی جگہ سے ہلتی نہیں۔ ہر چیز عاجزی سے مانگنی پڑتی ہے۔ میرا تو غرور ان سے نبٹنے میں ٹوٹا۔ اپنے پیمانے کے لحاظ سے میرا ڈپو یہاں پر آئندہ ترقی کا ایک خاص مقام ہے۔ ممکن ہے کہ یہ گودام آگے چل کر علاقے کا مرکز بن جائے لیکن لوگ اس کی قدر نہیں کرتے۔"

"بہت تیز نہ بھاگو"، پولوخین نے ناگواری سے کہا "بس لفظوں کی بھرمار کر رہے ہو، ذرا کوئی ترکیب سوچنے دو۔ تم کہتے ہو کہ ان کی خوشامد درآمد کرنا چاہئے؟"

"ہاں خوشامد درآمد کرنا چاہئے"، منیجر نے تصدیق کی۔

"کوئی بات نہیں، یہ ممکن ہے"، پولوخین نے وقار کے ساتھ کہا۔

اس نے اپنا بھیڑ کی کھال کا اوورکوٹ منیجر کو تھمایا۔ پتہ لگا کہ وہ اس کے نیچے ایک اچھا سلا ہوا اوورکوٹ اور پہنے تھا۔ اس نے ایک ٹیڑھی انگلی سے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا جو جھک کر اس کے منہہ پر آگئی تھیں اور ذرا شان

کے ساتھ ماہی گیروں کی جھونپڑیوں کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں پولوخین نے عورتوں سے کیا کہا یہ کسی کو پتہ نہیں، لیکن وہ جلد ہی مچھلی‌والیوں کے ساتھ گودام لوٹا اور سب کی طرف مخاطب ہوکر کہا:

''اب میری پیاری شہریو، تعمیری پروجکٹ کا انجام آپ کے ھاتھ میں ہے، ہو یا نہ ہو۔ اور سیمنٹ کے بغیر ہماری یہی حالت ہے جیسے جنازے کے ساتھ موسیقی نہ ہو۔''

''ارے، خوشامد کرنا بند کرو''، ایک سن‌دار عورت زور سے پولوخین پر چلائی ''اگر خوشامد کرنا ہی ہے تو یہ بتاؤ کہ کہاں سے کہاں لے جانا ہے۔ ہمارے پاس اور بھی بہت سے کام ہیں''

پھر وہ ہنس کر بولی ''ارے، ہم نے صرف ہنسی کے لئے تمھاری تعمیری پروجکٹ والی بات سن لی ہے۔ تمھارا خیال ہے ہم کچھ جانتے نہیں، کیا ہمارے پاس ریڈیو نہیں ہیں؟''

خاموشی اور تیزی کے ساتھ، بہت ٹھکانے سے مچھلی‌والیوں نے سیمنٹ کے بورے برف پر پھسلنے‌والی ٹرالی پر لاد دئے۔

پولوخین اور منیجر نے بھی مدد کی۔ ان کے چہرے سرخ پڑگئے تھے۔

''اور تم، نوجوان؟''، پولوخین نے لیوتیکوف سے پوچھا۔

''میرے لئے منع ہے۔ ہر لیور پر تیس کلوگرام کا بوجھ رہتا ہے اور مجھے ٹریکٹر واپس لےجانا ہے۔''

پولوخین چپ رہا لیکن اس نے لیوتیکوف کو

ایسے ملامت آمیز انداز میں دیکھا کہ لیوتیکوف کو بہت برا معلوم ہوا لیکن اس نے اپنی صفائی نہ دی۔ پولوخین کا جو جی چاہے اس کے بارے میں سوچے۔ بہرحال ٹریکٹر تو اس کو چلانا ہے۔ اس کو اپنے کو اتنا تھکا لینے کا حق نہیں ہے کہ وہ ٹریکٹر نہ چلا سکے۔ اور شمال میں اس وقت تک طویل سفر نہ کرنا چاہئے جب تک کافی طاقت اور فاضل پرزے محفوظ نہ ہوں۔

لیوتیکوف نے تیل کے دو پیپے لنڈھکا کر لکڑی کے تختے کے ذریعہ ٹرالی پر چڑھائے اور انجن کا تیل بدلا۔ اس نے آگ جلانے کے لئے لکڑی اکٹھا کی اور اس کو سمینٹ کے بوروں کے درمیان ڈھیر کر دیا۔ راستے میں نہ جانے کیا اتفاق ہو۔ بھلا لیمپ سے اپنے کو اس طرح گرم کیا جا سکتا ہے جیسے کسی الاؤ سے؟ ٹنڈرا میں لٹھے مشکل سے ملتے ہیں۔ بس جھاڑیوں جیسے چھوٹے چھوٹے برچ کے پیڑ ہوتے ہیں جن کی جڑیں ہمیشہ منجمد رہنےوالی زمین کی وجہ سے بجائے نیچے جانے کے اوپر کی طرف بڑھتی ہیں۔ اگر کسی پیڑ کو کاٹ کر دلدلی کوئلےوالی زمین سے باہر کھینچا جائے تو اس کی جڑیں چھتری کی تیلیوں کی طرح باہر نکل آتی ہیں۔

لیوتیکوف نے ٹریکٹر کا انجن چالو کردیا اور اپنا سر جھکا کر اس کی آواز سننے لگا۔ پھر اس نے فاضل پرزوں کا بکس کھولا اور سب چیزوں کی جانچ کی، اپنی کیبن میں ٹریک لائن اور اس کی پنیں رکھیں۔ آج جیسی برفانی آندھی چلتی رہے تو

ٹریک لائن کا راستے میں ٹوٹ جانا بالکل ممکن تھا۔ نیچے درجہ انجماد پر دھات پھوٹک ہوجاتی ھے اس لئے ٹریکٹر کو طویل مدت تک بے کار نہ رھنا چاھئے۔ نہیں تو سالیماتی ڈھانچہ ٹوٹ جاتا ھے اور پتلی دراڑیں پڑ جاتی ھیں۔ اس نے ٹریکٹر کو ٹرالی سے الگ کرلیا۔ اس کو آھستہ آھستہ گودام کا ایک چکر دیا، کیبن کی کھڑکی سے اپنا سر نکالے جھانکتا رھا۔ وہ سن رھا تھا کہ پہیوں کے نچلے حصے بج تو نہیں رھے ھیں۔ جب وہ واپس آیا تو ٹرالی پر سیمنٹ کے بورے لدچکے تھے اور ان کو نئے ترپال سے ڈھک دیا گیا تھا۔

پولوخین کا چہرہ سرخ اور پرمسرت تھا، اس کی چمکتی ھوئی ناک پر گلابی اور نیلی رگیں ابھری تھیں، اس کے اوورکوٹ کے پلے کھلے ھوئے اڑ رھے تھے۔ وہ ھر طرف مچھلی‌والیوں کو پکڑنے دوڑ رھا تھا اور زور زور سے قہقہے لگاکر کہہ رھا تھا:

''ارے، میں تو بوڑھا پھوس ھوں، میں تو تمھیں دادا کی طرح چومنا چاھتا ھوں۔ ارے، پوتیو، میرے پاس دوڑ کر آؤ۔ ابھی میرا موڈ ذرا اچھا ھے۔،،

مچھلی‌والیاں ٹریکٹر کے گرد جمع ھو گئیں، انھوں نے پولوخین کو ھاتھ ھلاکر خداحافظ کہا اور اس کو مچھلی کا شوربہ کھانے کی دعوت بھی دی۔

لیکن لیوتیکوف کو کسی نے خداحافظ نہیں کہا جیسے اس کا وجود ھی نہ ھو۔

''اچھے لوگ ھیں، خلوص والے،، پولوخین نے کہا

اور پھر معنی‌خیز انداز میں اضافہ کیا ''اجتماعیت کا جذبہ رکھنےوالے ہیں۔''

اپنا موٹا بھورا ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے پولوخین ذرا پریشانی سے سننے لگا۔

''درد ہو رہا ہے۔ دیکھو۔ یہ سیمنٹ کے بوروں کی کارستانی ہے،'' اس نے افسردگی سے کہا ''اب مجھ سے ایسے بوجھ نہیں اٹھتے۔''

''آپ ریٹائر کیوں نہیں ہو جاتے؟''

''اور بوڑھاپے میں تن تنہا رہ جاؤں؟ یہ میں نہیں چاہتا۔ پھر ٹکنالوجی بھی تو ہے، ٹکنالوجی انسان کی کام کی زندگی بڑھا دیتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے لئے دماغ بھی ہونا چاہئے اور میں ابھی کوئی معذور بھی نہیں ہوں، جہاں تک دماغی کام کا سوال ہے۔ میرا دماغ اچھی طرح کام کرتا ہے۔''

پولوخین نے اپنے کو ٹریکٹر کے آئینے میں دیکھا اور اس کو اس طرح موڑ دیا کہ اپنے کو زیادہ اچھی طرح دیکھ سکے، پھر انگلیوں سے اپنے گال تھپ تھپائے اور آہ بھر کر کہا:

''جب میں اپنے کو آئینے میں دیکھتا ہوں تو ایک اچھے مرد کی صورت دکھائی دیتی ہے اور یہ عورتیں مجھکو بوڑھا سمجھتی ہیں۔ میں کیسے بوڑھا ہوں؟ اس لئے کہ میرے سر پر بال نہیں ہیں؟ گنجے ہونے میں کیا مضائقہ ہے۔ میں تو جوانی میں ہی گنجا ہو گیا تھا۔ مجھے سمور کی ٹوپی بہت پسند ہے اسی لئے میرے بال جھڑ گئے،

میں تو یہ ٹوپی پہن کر بارک میں سوتا بھی تھا تاکہ سر میں ٹھنڈک نہ لگ جائے۔"

"آپ شادی شدہ ہیں؟"

"لگے کچوکے دینے!" طنزیہ مسکراتے ہوئے پولوخین نے کہا "تم نے ان مچھلی والیوں کے لئے میرے یہ چٹکی لی ہے" پھر اس نے افسردگی سے کہا "میں عورتوں سے شرماتا ہوں، میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ میں نے محاذ جنگ پر شادی کرلی تھی جب میں خاصی عمر کو پہنچ چکا تھا۔ وہ فوج میں ٹرافک کنٹرولر تھی۔ ہمارے اپنے ہی ایک ٹینک سے وہ دب گئی۔ اس کے جسم میں ہڈی چورا جو کچھ باقی رہ گیا تھا اس کو ایک برساتی کے کپڑے میں لپیٹ کر تسویکاؤ میں دفن کردیا گیا۔ بس یہیں میری شادی‌شدہ زندگی ختم ہوگئی۔"

"اور پھر آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟"

"یہ میں کیسے کرسکتا ہوں؟" پولوخین نے خوفزدہ ہوکر کہا "اب بھی اس کی یاد ہمیشہ آتی رہتی ہے۔ نہیں، یہ اچھا نہ ہوتا" اس نے اپنا سر جھکا لیا اور بےکیف لہجے میں بولا: "دیکھو، اس کی آنکھیں اتنی اچھی تھیں اور میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ جب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے تو اس کو ہر چیز اچھی اور خالص نظر آتی ہوگی، میں بھی..."

"میری بیوی کی آنکھیں بھی غیرمعمولی ہیں" لیوتیکوف نے کہا۔

"آدمی کی آنکھیں ہی اس کی شخصیت کی سند

ھوتی ھیں،، پولوخین نے کہا ''الفاظ جھوٹے ھو سکتے ھیں لیکن آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں۔ یہ واقعہ ھے۔ ،،

''ھمارے یہاں بچے کی آمد ھے،، لیوتیکوف نے بتایا اور ذرا گھبرا کر مسکرایا۔

''ارے، سچ؟،، پولوخین نے خوش ھوکر کہا ''جلدی؟،،

''ممکن ھے کہ وہ میری غیرموجودگی میں آچکا ھو۔ ،،

''کیا اسی وجہ سے تم اتنے گھبرائے ھو؟،،

''دیکھئے نا، اس کو کوئی تجربہ تو نہیں ھے،، لیوتیکوف نے ذرا پریشانی سے کہا۔

''تم نے کہا کیوں نہیں؟،، پولوخین نے خفگی سے کہا۔

''ارے، دورے پر آنا تھا، تو کیا کہتا۔ ،،

''اچھا، تو میری بات سنو!،، پولوخین نے حکم لگایا ''رات کو راستے میں نہیں رکیں گے۔ ھم باری باری ٹریکٹر چلائیں گے۔ میں مشین اور ٹریکٹر اسٹیشن پر ٹریکٹر چلاتا تھا،، اور پھر اس نے مڑ کر پوچھا ''اس تھرماس میں کیا ھے؟،،

''چائے۔ ،،

''اچھا، میں اس کو کافی پی لونگا اور پھر جھپکی لیکر ٹریکٹر چلاؤنگا،، پھر اس نے مزید یقین دھانی کے لئے کہا ''میں اپنا کام جانتا ھوں، گھبراؤنہیں۔ اورجہاں تک قانون کا سوال ھے تو میں مقامی سوویت کا ممبر ھوں، تم کو حکم دے رھا ھوں۔ بس...،،

پولوخین نے پلاسٹک کا گلاس پھر تھرماس پر کس دیا اور بھیڑ کی کھال کے بڑے اوور کوٹ کے دامن سے اپنے کو ڈھک کر فوراً سو گیا۔ بہت دیر تک اس کے چہرے پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ پھیلی رہی۔ پھر اس کا چہرہ نرم اور پرسکون ہو گیا۔ وہ پھولا اور بے کیف تھا اور اس کا نچلا ہونٹ ذرا نیچے جھک کر کھل گیا تھا۔

برف کی تہہ ٹریکٹر کی پیٹیوں کے نیچے چرمرا رہی تھی، ٹوٹ اور پھیل رہی تھی۔ برفانی سطح پر دراڑیں اس طرح پڑ رہی تھیں جیسے وہ ٹوٹا ہوا شیشہ ہو۔ رفتہ رفتہ، چپکے چپکے برفانی طوفان چلنے لگا۔ برف کی جالیدار چادریں زمین کے اوپر کافی نیچے پھیلنے لگیں۔ ان میں ریت جیسی سرسراہٹ تھی۔ لیکن ہوا تیز ہونے لگی اور پھر جھکڑ میں بدل گئی۔ برفانی طوفان نے آندھی کی شکل اختیار کرلی۔ ٹریکٹر سفید غبار کی آندھی میں چل رہا تھا اور برفانی لہریں اس کی باھری اسکرین پر سفید جھاگ کی طرح ٹکرا رہی تھیں۔ اب یہ سفید آندھی سیاہ آندھی بن گئی۔ آندھی نے سارے برف کو اڑا ڈالا تھا، اس کو سطح سے صاف کردیا تھا اور ایک فوجی جہاز کی طاقت سے ٹنڈرا کی زمین کو متھ رہا تھا اور اس کے سیاہ ناقابل گزر گرداب ہر طرف گرجتے ہوئے سیاہ دھوئیں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ ٹریکٹر کی اگلی روشنیاں دھندلی پڑ گئیں اور اب ان سے روشنی نکل نہیں رہی تھی کیونکہ ان پر سیاہ برف کی تہہ جم گئی تھی۔

لیوتیکوف نے اپنی رفتار کم نہیں کی حالانکہ وہ بےآگے دیکھے ٹریکٹر چلا رہا تھا، صرف قطب نما اور گھڑی سے کام چلارہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس رفتار سے مسطح ٹنڈرا کی وسعتوں کو سات گھنٹے میں طے کر سکیگا جو اس کی جانی پہچانی تھیں۔ اس کے بعد پہاڑیاں تھیں اور پھر ٹنڈرا آجاتا تھا۔ لیکن یہ دلدلی تھا جہاں تہہ تک بالکل ٹھوس جمی ہوئی بےشمار جھیلیں تھیں۔

پولوخین جاگ اٹھا اور اس نے کہا کہ وہ اب لیوتیکوف کی جگہ لیگا۔

''آپ کے لئے ممکن نہیں،، لیوتیکوف نے کہا ''بالکل دکھائی نہیں دیتا۔،،

''دکھائی دینے سے مجھے کیا کام؟،، پولوخین نے کہا ''مجھے منظربینی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہاں کے مناظر سے تو میرا دل بھر چکا ہے۔ قطب‌نما کے بارے میں میری جانکاری کچھ تم سے کم نہیں ہے۔ فوجی سپاہیوں کے ساتھ سراغرسانی میں اس کو استعمال کر چکا ہوں اور اس نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا اور میں نے بھی اس کے ساتھ کبھی دغا نہ کی۔،،

پولوخین کھسک کر ڈرائیور کی سیٹ پر آگیا۔ اس کی موٹی، بیضوی توند لیوتیکوف کو زوروں سے دبا رہی تھی۔ پولوخین نے اپنے کوٹ کے بٹن کھولے، پیڈلوں پر پیر رکھے اور چکر ھاتھ میں سنبھالا۔ کچھ دیر تک تو لیوتیکوف نے ذرا بےچینی سے پولوخین کو ٹریکٹر چلاتے دیکھا۔ پھر مطمئن ہو گیا

کہ پولوخین یہ کام کر سکتا ہے۔ وہ اپنی سیٹ پر جھکا اور سمٹ کر سو گیا۔

وہ ٹریکٹر کے رکنے پر اچانک جاگ اٹھا۔ پولوخین نے اپنی غلطی تسلیم کی:

''میں اونگھ گیا۔ اب عادت تو رہی نہیں،، اس نے بڑے چاؤ سے چائے پی اور سینہ پر مالش کرتے ہوئے شکایت کی ''میرے دل کی حالت خراب ہے، درد ہوتا ہے،، یہ کہہ کر وہ سیٹ پر پیچھے کی طرف لنڈھک گیا، اس کی آنکھیں بند تھیں اور موٹے پپوٹے دھڑک رہے تھے۔

لیوتیکوف گھڑی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پولوخین پانچ گھنٹے سے زیادہ ٹریکٹر چلاتا رہا تھا!

جلد ہی پہاڑیاں شروع ہو گئیں۔ یہاں آندھی اتنی تند نہ تھی۔ لیکن چڑھائی پر جانا اور پھر اتنے بوجھ کے ساتھ اترنا اس تمام مہارت کا مقتضی تھا جو لیوتیکوف رکھتا تھا۔ ایسے لمحے بھی آتے تھے جب ٹریکٹر دھات کے بےجان ٹکڑے کی طرح پھسل جاتا، رینگتا اور پہلو پر الٹنے کے قریب ہو جاتا۔

کنٹرول کے آلات کو سنبھالتے ہوئے لیوتیکوف پسینے سے شرابور تھا۔ اس نے اس طرف کا دروازہ ذرا کھول دیا جدھر پولوخین سو رہا تھا۔ یہ اس لئے تھا کہ اگر کچھ ہو جائے تو وہ الٹتی ہوئی مشین سے پولوخین کو باہر دھکیل کر موت سے بچائے۔

جب لیوتیکوف نے ڈرائیور کا دروازہ کھولکر اپنا سر باہر نکالا تو اس کا چہرہ جس سے پسینہ

ٹپک رہا تھا فوراً یخ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے ڈھک گیا۔

اب پہاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور وہ پھر ٹنڈرا میں آگئے۔ تہہ تک برف سے منجمد جھیلیں ٹریکٹر کے نیچے چرمرا رہی تھیں۔ یخ کی بڑی بڑی سلوں کے اوپر ٹریکٹر کی پیٹیاں ہچکولے کھاتی گزر رہی تھیں۔ برفانی آندھی ٹریکٹر کے خلاف چل رہی تھی اور برف کا باریک برادہ کیبن کے اندر اسی طرح آ رہا تھا جیسے تپتے ہوئے ریگستان میں خوب بند موٹر کے اندر ریت گھس آتی ہے۔

پولوخین جاگ اٹھا اور بڑبڑایا:

''میرے پیر ذرا ٹھنڈے ہو ہی گئے حالانکہ میں نے کتے کے بالوں کے دو جوڑ موزے پہن رکھے ہیں، ایک مہربان بڑی بی نے میرے لئے بنے تھے''، پھر اس نے کہا ''آؤ، ذرا کچھ کھالیں، میرے پیٹ میں تو چوہے کود رہے ہیں''، اس نے دھوئیں میں پکی بطخ نکالی اور اس کو چند حصوں میں چیر دیا اور بولا ''میں ایسے چربی‌دار کھانے کھا کر اپنے دانتوں سے ہی اپنی قبر کھود رہا ہوں۔ یہ تو رگوں کو تنگ کرنے کی بیماری پیدا کرتے ہیں۔''

ٹریکٹر کو کسی چھوٹے تودے پر سے گزرتے ہوئے زور کا جھٹکا لگا اور پولوخین ناراض ہو کر بولا:

''گرمیوں میں تو میں آبی ٹرانسپورٹ کو ترجیح دیتا ہوں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ پسو اور مچھر آدمی کو زندہ جان چٹ کر جاتے ہیں۔ پچھلی

گرمیوں میں انھوں نے کم از کم میرا ایک بالٹی خون چوس لیا ہوگا،، پھر اس نے سوچتے ہوئے کہا ''میں نے فاشسٹ ہواباز کو دیکھا تھا جو بجلی سے گرم کیا ہوا ہوابازی کا سوٹ پہنے تھا۔ کاشکہ میرے اور تمھارے پاس بھی اس طرح کی چیز اس وقت ہوتی!،،

''ارے، آپ نے ایسی وردی بطور نشانی کیوں نہ حاصل کرلی؟،، لیوتیکوف نے مذاق میں کہا ''کام آتی۔ ،،

''میں نے اس نازی سے کہا کہ وہ چپ چاپ اپنے کو حوالے کردے،، پولوخین نے سادگی سے کہا ''لیکن وہ نہ مانا اور گولیاں چلاتا رہا۔ مجھے اسے خاموش کرنا پڑا۔ ،،

''اس سے آپ کی مڈبھیڑ کہاں ہو گئی؟،،

''ان کے ہوائی اڈے پر، جب ہم چھتریوں سے وہاں اترے۔ ،،

''تو آپ پیراشوٹ والے سپاہی بھی تھے؟،،

''ہاں، ٹھیک ہے۔ ،،

''آپ کو پیراشوٹ کیسے سنبھال پاتا تھا؟،،

''خوب کہی!،، پولوخین نے مسکرا کر کہا ''ارے، کیا میں ہمیشہ سے ایسا تھا جیسا اب ہوں، ٹھکانے کا تھا؟ میری وردی کا نمبر ۳۸ تھا اور اب ۴۶ نمبر کی بھی کسی ہوتی ہے،، اچانک پولوخین کے چہرے سے برتری ٹپکنے لگی اور اس نے پراقتدار لہجے میں کہا ''اچھا کافی بکواس ہوچکی، اب ٹریکٹر چلانے کی میری باری ہے،، یہ کہہ کر

اس نے اپنے پھولے ہوئے ہاتھ جن پر بڑے بڑے سرخ دھبے تھے ٹریکٹر کے چکر پر رکھ دئے۔ پھر ذرا ناراضگی سے بولا ''میں اپنی طویل زندگی سے بالکل مطمئن ہوں اور میں تمھاری عمر سے اس کو بدلنے کے لئے نہیں تیار ہوں۔''

ٹریکٹر کی پیٹیاں برف اور پتھروں پر زور زور سے بج رہی تھیں۔ ٹرالی کی پٹریاں بھی اپنا گیت گا رہی تھیں۔

رات کو لیوتیکوف ٹریکٹر چلا رہا تھا لیکن اس کو مشکل سے رات کہا جا سکتا ہے۔ بالکل بادلوں سے گھرے دن کی طرح جس میں نہ تو سایہ ہو اور نہ دھوپ۔ آسمان ایک افسردہ ویرانی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اور ہر چیز سفید اور بےجان تھی۔ لیوتیکوف سوچنے لگا کہ موجودہ زمانے میں کیسے ریڈیو دوربینیں ان لہروں کو حاصل کر رہی ہیں جو کرۂارض کے وجود سے پہلے خارج ہوئی تھیں۔ یہ لہریں تین لاکھ کلومیٹر فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہیں لیکن ان کو اپنے ستاروں کے جھرمٹ سے زمین تک پہنچنے میں تقریباً دس ارب سال لگتے ہیں۔ ہم لوگ اب ان لہروں کا پتہ تو لگا لیتے ہیں لیکن ان کو حل نہیں کر سکتے، ان کے معنی نہیں سمجھ سکتے، پھر بھی وہ وقت آئیگا جب لوگ ان کو پڑھ بھی لیں گے۔

فی‌الحال آفاق نے اپنا یہ عظیم راز سربستہ رکھا ہے اور انسان کے لئے یہ اسرار ہے۔ لیکن اس کے اپنے لئے، لیوتیکوف کے لئے، آفاق کے اس معمے

سے زیادہ اہم اور ضروری کچھ اور بھی تھا۔ مثلاً جب تمارا اپنے گہرے سیاہ، لہردار بالوں سے کانٹے نکالکر راکھدان میں رکھتی ہے تو اس سے ناراض نہ ہونا چاہئے۔ جب تمارا نے کہا تھا کہ وہ اس سے زیادہ بچے سے محبت کرتی ہے تو اس کو برا لگا تھا، اور اب لیوتیکوف کی ساری ہستی اس کے لئے اشتیاق اور محبت سے انتہائی بےچین تھی جس کا ابھی وجود تک نہ تھا، لیکن جو تمارا کے اندر اس کے اپنے وجود کے سلسلے کی حیثیت سے موجود تھا اور اس کی زندگی کا دوسری زندگی میں یہ سلسلہ اس کی بیوی تمارا کا تحفہ تھا۔ اب لیوتیکوف اپنی بےچینی میں ٹریکٹر تیز چلانے لگا، وہ تمام پیڈلوں کو بڑی خوبی اور مہارت سے اس طرح چلا رہا تھا جیسے اس کا اور مشین کا وجود بالکل ایک دوسرے میں وصل ہو گئے ہیں۔

صبح کی گلابی شفق آسمان کو سجنے لگی۔ آرکٹک کا برفانی خول جو ناقابل برداشت سفیدی کے ساتھ چمک رہا تھا لوہے کے نیچے آکر ٹوٹ گیا، چور چور ہوگیا۔ برف کا پوڈر ہوا میں منڈلا کر سفید چمک رہا تھا اور ٹریکٹر کے چھوڑے ہوئے راستے میں دیر تک معلق رہتا تھا۔

لیوتیکوف اب ٹریکٹر لیکر ڈھلوان کنارے سے دریا پر آگیا جو یخ بستہ تھا۔ اس کی سطح کو تیز ہوا نے صاف کرکے چکنا کر دیا تھا اور ٹریکٹر کی پیٹیوں کی گرفت ان پر نہیں رہی تھی۔ ٹریکٹر پھسلنے لگا۔ لیوتیکوف اب ذرا سست رفتاری

سے آگے بڑھتا اور ان برف کے تودوں سے کترا کر نکلتا تھا جو چکاچوند کرنےوالی چمک رکھتے تھے۔ وہ دوسرے کنارے کے قریب پہنچ چکا تھا جب اس نے پہلے ایک ھلکی گھڑگھڑاھٹ سنی جو جلد ھی ایک تیز تڑاقے کی آواز میں تبدیل ھوگئی۔ اب اسے ایسا محسوس ھوا جیسے ساری برفانی وسعت ھانپ رھی ھے... اس کے نیچے کوئی چیز آھستہ سے نیچے کی طرف بیٹھ گئی۔ شیشے کی جھنک بڑھکر ایک خوفناک گرج میں بدل گئی۔ اس کو پوری طرح سمجھے بغیر کہ کیا ھورھا ھے لیوتیکوف نے دروازہ کھولکر اپنے شانے سے زوروں کا دھکا دیکر پولوخین کو کیبن سے باھر دھکیل دیا اور ٹریکٹر کو پوری رفتار سے ٹوٹتی اور گرجتی ھوئی یخ میں بھگایا۔ بھورا پانی کیبن میں بھررھا تھا لیکن ٹریکٹر اس میں سے گزر کر کنارے پر پہنچ گیا اور رک گیا۔

لیوتیکوف کا سر سامنے کی اسکرین سے ٹکرایا اور اس نے پھر (اگرچہ مختصر طور پر) برف کے ٹوٹنے اور گرجدار تڑاقے کی آواز سنی۔ پھر ھر طرف اندھیرا چھا گیا۔

''ارے، بھائی، ھم تو تمھارے ساتھ دوسری دنیا تک پہنچتے پہنچتے رہ گئے،، پولوخین نے لیوتیکوف کا سر باندھتے ھوئے کہا ''تم نے مجھ کو کیبن سے باھر دھکیل کر ٹھیک ھی کیا۔ اس کا مطلب ھے کہ تمھاری نفسیاتی مشینری ٹھیک کام کررھی

تھی۔ تم نے بوجھ ہلکا کردیا،، پھر اس نے خوشی سے بتایا ''میں نے تمھیں بھی ہلکا کرنے کا کام کیا۔ میں نے بھی کچھ کارگذاری دکھائی،، اور پھر اس نے برف پر کھڑی ہوئی تن تنہا ٹرالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غرور سے کہا ''میں نے اس کو الگ کرلیا۔ ورنہ تم اس بوجھ کو لیکر کبھی نہ نکل پاتے۔ بس تم ٹریکٹر کے ساتھ ڈوب جاتے۔،،

''ارے، تم نے کیا کیا؟،، لیوتیکوف نے غصے سے پوچھا ''کس نے تم سے اس طرح بدحواس ہونے کے لئے کہا تھا؟ تم نے تو سارا مال کھودیا!،،

''تم نے سچ مچ تو میری توہین نہیں کی ہے، سچ مچ نہیں...،، پولوخین نے خوشدلی سے کہا۔

''ڈر گئے کہ تم ٹرالی کے ساتھ ڈوب جاؤگے اور پھر نہ کہیں جنازہ اٹھے گا اور نہ کہیں مزار ہوگا۔،،

''میرا جنازہ کیسے اٹھے گا اس کا فیصلہ میں تمھارے بغیر ھی کرلونگا۔ مزار ہوگا یا نہیں،، پولوخین نے درشتی سے کہا ''اب صرف کام کی بات کرنا چاہئے۔ پرانے قصوں کو چھوڑو۔ یہ میں تم سے دوستانہ کہہ رہا ہوں۔،،

''لیکن ہم اب ٹرالی کو باہر کیسے نکالیں؟ اس کے نیچے برف بوجھ سے دب رہا ہے۔ وہ جلد ھی ڈوب جائے گی۔،،

''میں اس کو دیکھ رہا ہوں،، پولوخین نے رکھائی سے کہا ''دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں...،،

افق کے سرے پر کرنوں سے محروم سرخ سورج لٹک رہا تھا۔ ہوا ایسی خالص اور شفاف تھی جیسے

کائناتی فضا کی لیکن اس کی ٹھنڈک تیزاب کی کاٹ رکھتی تھی۔

''میں نے دیکھا،، پولوخین نے کہا ''کہ تم گودام سے کچھ لکڑی لائے تھے۔ ہمیں اسے ٹرالی سے نکالنا اور آگ جلانا چاہئے،، اور پھر اس نے طنزیہ اضافہ کیا ''اپنے کو خوش کرنے کے لئے کیونکہ میں غم کا عادی انسان نہیں ہوں،، اب اس نے ایک لمحہ سوچکر کہا ''ظاہر ہے کہ ہم برف کو مرمت کرکے بحال تو کریں گے نہیں، یہ ہمارا کام نہیں ہے، لیکن میں جہازی قلی کا خطاب تم کو اور اپنے کو دونوں کو عطا کرتا ہوں۔،،

''اور ہمیں لادنا کیا ہے؟ ایک دوسرے کو؟،،

''سیمنٹ کے بورے،، پولوخین نے پیار سے کہا ''ہم بوروں کو کنارے لاتے ہیں، پھر خالی ٹرالی کو کھینچ لائیں گے اور پھر اپنی راہ لگ سکتے ہیں۔ بس یہ رہا کام،، اس نے مسکراتے ہوئے کہا ''اور تم نے کیا سوچا تھا؟ کہ اگر میرا گنجا سر یہاں نہ پھنس گیا ہوتا تو وہ کام نہیں کرتا ہے؟ ارے، وہ تو مشین کی طرح کام کرتا ہے۔،،

پولوخین کے اوورکوٹ کے دامن شرابور تھے۔ اس نے اس کو اتار کر الگ پھینک دیا۔ پھر اس نے اپنے بوٹوں کو دیکھ کر ملامت آمیز انداز میں کہا:

''ارے، یہ تو پانی کے پیاسے رہتے ہیں، اچھا میں انہیں ابھی ٹھیک کرتا ہوں۔ پانی بہرحال نم ہوتا ہے،، وہ برف پر گیا اور دونوں پیر یکے بعد

دیگرے تیزی سے پانی میں ڈالکر نکال لئے ''یہ شکاریوں کی پرانی ترکیب ہے،، اس نے کہا ''بس جوتوں کو ذرا بھگولو۔ اس طرح سے پانی برف کی صورت اختیار کرکے ان کو سربند کردیتا ہے۔ میرے پیر خشک رہیں گے۔ ان کو یہ خوشی نصیب ہوگی۔ ،،

وہ رات ہونے تک سیمنٹ کے بورے کھینچ کھینچ کر کنارے لاتے رہے۔ پھر ٹرالی نکال کر لائے۔ لیکن اب ان میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ ٹرالی پر بورے لادیں۔ پولوخین ترپال کے ایک ٹکڑے پر آگ کے قریب پڑا تھا۔ اس کی بیمار سی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ باریک جھلی سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ وہ بکتا جا رہا تھا، اس وجہ سے نہیں کہ وہ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لیوتیکوف کو خوش رکھے۔

''اگرچہ میرا پیٹ وزنی ہے اور میں گنجا ہوں، پھر بھی دیکھو میں کتنا سخت‌جان ہوں۔ میں زندہ ہوں اور وہ بھی ایک پوشیدہ اعصابی عضلے کی وجہ سے اور اس خوشی میں کہ میں ڈوبا نہیں۔ ،،

لیوتیکوف پولوخین کی باتیں ناپسندیدگی سے سن رہا تھا اور انجن میں کچھ کھٹ پٹ کرتا جارہا تھا۔ کبھی کبھی وہ بغلوں میں اپنے ہاتھ دبا کر گرم کرلیتا۔

ٹریکٹر کے نیچے ہوا سے محفوظ ایک لیمپ جل رہا تھا تاکہ جما ہوا تیل گرم ہو سکے۔ آگ کے اوپر ریڈیئیٹر کے لئے پانی گرم ہو رہا تھا۔ لیوتیکوف

کے چہرے پر نیلے نیلے دھبے تھے جیسے اس کو شدید سردی لگ گئی ہو۔ ٹریکٹر یخ کا تودہ معلوم ہوتا تھا۔ بعد کو انہوں نے بورے ٹرالی پر لادے۔ ان میں اتنی کم قوت باقی رہ گئی کہ ان کو ہر بورا سلکر اٹھانا پڑا۔

لیوتیکوف نے پولوخین کے نمدے کے جوتے پہن رکھے تھے۔ پولوخین نے اپنے پیروں میں برساتی کے ٹکڑے لپیٹ لئے تھے۔

وہ اکثر بورے سمیت ٹرالی پر جا گرتے اور ان کو دوبارہ اٹھنے کے لئے کافی کوشش کرنی پڑتی۔ اپنے لہولہان ہاتھوں سے انہوں نے ٹریکٹر کے کام کرنے والے حصوں سے برف اکھاڑی۔

اور پھر ٹریکٹر اور اس کے پیچھے لگی ہوئی ٹرالی قطبی روشنیوں والی رات میں روانہ ہوئی جس میں نہ تو سائے تھے اور نہ ستارے۔ ٹریکٹر خشک، سفید برف میں ایک گہری خندق بناتا چلا جارہا تھا، وہ کسی برفانی پہاڑی کی کٹی ہوئی ایک بڑی سل لگتا تھا۔

اور جب بالآخر انہیں بستی کا نفیس، سربلند اور مستحکم ریڈیو مینار نظر آیا تو پولوخین نے اپنے پھولے چہرے پر پرفکر انداز میں ہاتھ پھیر کر کہا:

''ارے، یہ کتنی بڑھ گئی ہے لیکن یہ اچھی داڑھی نہیں ہے، لال اور گھنی،، اس نے اپنے تھیلے سے مشینی شیور نکالا اور اس میں کنجی بھرنی شروع کی۔ پھر اچانک اس نے فیصلہ کیا کہ وہ

شیو نہیں کریگا۔ لیوتیکوف کو شیور دیتے ہوئے کہا ''ارے، مجھے بننے سنورنے کی کیا ضرورت؟ کس کے لئے؟''

پولوخین ڈرائیور کی سیٹ پر چلا گیا۔ برفانی گھاٹیوں کی ناقابل برداشت چمک پر آنکھیں میچیں اور پھر کچھ سوچتے ہوئے ذرا جھجک کر کہنے لگا:

''میں بھی بے حساب خوشیوں کا مالک رہ چکا ہوں۔ میں ایمبولینس میں سوار ہوکر جاتا تھا اور وہ اپنی جھنڈیاں لئے اس طرح کھڑی ہوتی تھی جیسے پر ہوں اور وہ ان کو ہلاتی۔ میں جنگ میں بے دھڑک تھا، اس لئے کئی بار زخمی ہوا۔ اور جب میں نے اس کو دیکھا تو سارا درد ورد جاتا رہا۔ اپنے بستر سے کہنی کے بل ابھرتا اور کھڑکی کے باھر جھانک کر اس کو دیکھتا۔ مجھے ان تمام افسروں پر رشک آتا جو محاذ پر آزادی سے سڑکوں پر گھومتے تھے اور رک کر ہر ٹرافک کنٹرولر سے راستے پوچھ سکتے تھے'' اس نے گھورتے ہوئے کہا ''مجھے اس کے بارے میں سب کچھ یاد ھے اور میں مرتے دم تک اس کو یاد کرتا رھونگا...''

جب وہ اسٹور واپس پہنچے تو پولوخین کے چہرے پر پھر اقتدار و اختیار کے جذبات طاری ہوگئے اور اودی رگیں ابھرآئیں۔ اس نے چلا کر اسٹور کے منیجر سے کہا:

''مجھے ایک ڈرائیور معہ خودکار باربردار کے چاھئے! زندہ جان بنو اور ذرا احتیاط سے، اگر ایک

بھی بورا پھٹا تو سر کاٹ لونگا ،، یہ کہہ کر وہ پھرتی سے نیچے کودا لیکن پھر لڑکھڑا کر ٹریکٹر کا سہارا لیتے ہوئے بولا ''سگرٹ ہے؟،، اس نے بڑی خوشی سے سگرٹ کے کش لئے اور زور سے کہا ''مرنے کے بعد تو سگرٹ نہیں پی سکتے۔ ،، اس نے لیوتیکوف کی طرف اپنا موٹا ہاتھ بڑھا دیا اور بڑے اخلاق اور نرمی سے کہا ''سیریوژا، تمہارا شکریہ، تم نے مجھے خوب ٹریکٹر پر سیر کرائی۔ ،، پھر وہ عمارت کے اندر چلا گیا یہ دیکھنے کہ کہاں اس کی خاص اور اعلی کوالٹی کی سیمنٹ رکھی جانےوالی ہے۔

لیوتیکوف گھر پہنچا۔ کمرے میں روشنی جل رہی تھی حالانکہ باہر قطبی دن تھا۔

تمارا سمور کا اوورکوٹ پہنے میز کے قریب بیٹھی تھی جس پر ایک الارم گھڑی اور آئینہ رکھا تھا۔ وہ ہراساں سی کبھی گھڑی کو دیکھتی اور کبھی آئینے کو۔ اس کی آنکھوں میں گڈھے پڑ گئے تھے اور اس کا چہرہ برے اور زنگ کے رنگ کے داغوں سے بگڑ گیا تھا۔ اس نے مڑکر دیکھا، اس کی سیاہ آنکھیں جل رہی تھیں، اور کہا:

''آگئے؟ ہاں، آگئے؟،، اور اپنا سر ہاتھوں میں لیکر پھوٹ پڑی۔

لیوتیکوف نے ڈرتے ہوئے تمارا کے پیٹ کی طرف دیکھا، سب ٹھیک تھا، وہ تو اسی طرح پھولا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی تک کچھ نہیں ہوا تھا۔

تمارا اچھل کر اٹھی اور اس کے قریب آ گئی۔ اس نے لیوتیکوف کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا اور اپنے ھاتھ اس کے شانوں پر۔ وہ ساکت کھڑی رھی۔ پھر شکایت آمیز لہجے میں پوچھنے لگی:

''میں بہت بدصورت ھو گئی ھوں نا؟ بہت ھی؟ اور اب مجھ سے تمھاری محبت کم ھو گئی ھے نا؟''

لیوتیکوف نے منہ ھی منہ میں بڑبڑاتے ھوئے لیکن خوش دلی سے کہا:

''ارے، میں اتنا ٹھنڈا ھوں اور تم مجھ سے اس طرح لپٹی کھڑی ھو۔ سردی لگ جائے گی اور ھمارا بچہ سردی لگا پیدا ھوگا۔''

تمارا پیچھے ھٹ گئی اور لیوتیکوف کو تجسس آمیز نظروں سے دیکھتے ھوئے بولی:

''تم نے شیو کیوں کیا؟ کیوں؟''

''ارے، تمھارے لئے، ابھی بستی کے باھر'' لیوتیکوف نے صفائی دی۔ اس کو فخر تھا کہ تمارا اتنی بے اعتباری اور جلن کے ساتھ اسے دیکھ رھی تھی اور اس نے بڑی آھستگی سے بیوی کے پھولے اور کانپتے ھوئے ھونٹوں کو، اس کے خشک الجھے ھوئے بالوں اور اس کی نم آنکھوں کو جو دو سیاہ سورجوں کی طرح چمک رھی تھیں چوما۔

ٹنڈرا کی بے جان برفانی وسعتوں پر معلق زبردست کائناتی آسمان سے پراسرار شمالی روشنیوں کی بوچھار ھوئی۔ وہ دھندلی پڑجاتیں اور پھر ظاھر ھوتیں۔ ٹنڈرا کی لامحدود وسعتوں میں ٹریکٹر کی پیٹیوں

کی بنائی ہوئی دندانےدار لیک پھیلی ہوئی تھی۔ برف کی سفید اور خشک دھاریاں اس کے نشانوں کو مٹانے لگی تھیں اور وہ جلد ہی ہمیشہ کے لئے غائب ہونےوالے تھے، ان لوگوں کے دماغوں تک سے بھی جنھوں نے ان کو بنایا تھا، کیونکہ یہ تو بہت ہی معمولی اور روزمرہ کے دورے کے نشان تھے۔ اور یہاں کون ان دوروں کو زندگی بھر یاد رکھتا ہے؟ غالباً کوئی نہیں۔

یوری ریتھیؤ

چوکچی قوم کے پہلے مصنف یوری ریتھیؤ (سال پیدائش ۱۹۳۰ء) کا نام غیرملکی قارئین تک پہنچ چکا ہے۔ یوری ریتھیؤ کی کہانیوں کے بارے میں لندن کے پریس نے لکھا ''یہ اپنی قسم کی واحد کتاب ہے۔ اس کے مصنف کی عمر چھہ سال کی تھی جب چوکچی رسم خط وجود میں آیا۔ کہانیوں کی زبان میں بڑی تازگی اور صفائی ہے اور ان میں جوش وولولہ پایا جاتا ہے۔ مصنف کی طرز تحریر کی سادگی اس کو انوکھاپن عطا کرتی ہے۔ اس ادیب کی تخلیقات ہی چھوٹی شمالی قوموں کی ناقابل یقین ترقی کا انتہائی روشن ثبوت ہیں''۔

یوری ریتھیؤ ٹنڈرا میں قطبی سمندر کے ساحل پر ایک چوکچی شکاری کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے دیسی پھونک جھاڑ کرنےوالوں کے ٹونے ٹوٹکے بھی دیکھے ہیں۔ وہ سوویت اسکول میں تعلیم حاصل کرکے لینن گراد گئے اور یونیورسٹی کے شمالی

قوموں کے شعبے میں پڑھتے رہے اور ادیب بنے۔

ان کی کہانیوں کے زیادہ مشہور مجموعے ہیں ''چوکچی تاریخی کہانی''، ''نیلی لومڑیاں''، ''شیرماہیوں کا نفاق''، تین حصوں پر مشتمل خود نوشت سوانح عمری ''برف پگھل رہی ہے'' اور ان کی بہت سی دوسری تصانیف سوویت یونین کی قوموں کی ۳۰ سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

بادبان

لینن گراد کی سڑکیں سفید کہر سے بھری ہوئی تھیں - اس نے بڑے بڑے مکانوں کو لپیٹ لیا تھا، تاروں کے اوپر طاری تھا اور پارکوں اور چوکوں پر برس رہا تھا - اطالوی پل کے فانوس گریبائیدوف نہر کے اوپر رنگ برنگے ہالوں میں جھلملا رہے تھے -

میں نے پل پار کیا اور راکوف سڑک پر فلہارمونی کی طرف چلا جہاں دور ہی سے داخلے کے بھاری دروازوں کے قریب ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے شائقین کا مجمع دکھائی دے رہا تھا -

میں نے اوورکوٹ اتارا اور زینے چڑھتا ہوا بائیں جانب کورس کی طرف گیا -

میرے نیچے ہال میں چہل پہل تھی اور ایسی آواز آ رہی تھی جیسے کہیں دور سمندر کی لہریں ٹکرا رہی ہیں - یہ وہاں بیٹھتے ہوئے لوگوں کا شور تھا - فراخ اسٹیج پر ابھی کرسیاں خالی پڑی

تھیں اور دوروالے کونے میں دیوار کا سہارا لئے ساز آرام کر رہے تھے۔

بلوریں روشنی سے معمور سفید ستونوں والا ھال آہستہ آہستہ بھر رہا تھا۔ میں نے پیچھے مڑکر دیکھا تو مجھے دیوار تک خوب گھنا مجمع نظر آیا۔

تماشائیوں کے ھال میں روشنیاں دھندلی ھو گئیں اور اسٹیج کے اوپروالے جھاڑ نے جگمگا کر موسیقی کے سفید اسٹینڈوں کو چمکا دیا اور اس کی کرنیں تانبے کی جھانجھوں اور بڑے طبل کی سیپ کے رنگ کی کھال پر کھیل رہی تھیں۔

دو وسیع دروازوں کے بعد ھال کی گہرائی میں سرخ مخمل کا پردہ پھیلا ھوا تھا۔ اب دو لہروں میں موسیقار داخل ھوئے۔

میں اس شاندار ھال میں پہلی بار نہیں آیا تھا۔ لیکن اس دن میں معمول سے زیادہ بےچین تھا کہ اب آرکسٹرا کے سر گونجیں گے۔ ممکن ھے اس کی وجہ یہ ھو کہ میں نے مدتوں سے سمفنی آرکسٹرا نہیں سنا تھا۔ ابھی کل ھی میں برف سے ڈھکے ھوئے میخائیلوفسکی پارک میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ دن میں کئی بار میں پتھریلے زینے سے چڑھکر سفید سنگ مرمر کے یادگار ستون تک گیا جس کے نیچے پوشکن* دفن ھیں۔ اس کی بلندی سے روسی سرزمین حد نگاہ تک پھیلی نظر آتی تھی اور سرد

---

*الکساندر سیرگیئوچ پوشکن (۱۷۹۹ء—۱۸۳۷ء) — ۱۹ ویں صدی کے عظیم روسی شاعر۔

نیلی فضا میں جنگلوں کے اوپر چمنیوں کا دھواں چھایا تھا۔ میرا وہاں سے ہٹنے کو دل نہیں چاہتا تھا اور آج میں چائکوفسکی* کی پہلی سمفنی سننے کے لئے آگیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ میں اس غیرمعمولی طور پر سادہ روسی حسن کی یاد اپنے اندر پھر جگا سکونگا جو میں نے پوشکن پہاڑیوں کے میدانوں اور جنگلوں میں دل و جان سے محسوس کی تھی۔ یہ دن فروری کے سورج کی چمک اور سفید برف سے بھر پور تھے جس میں جابجا جنگلوں کے سرسبز گچھے سے ابھرے تھے۔

تالیوں کی لہر مجھے پھر ہال میں واپس لائی۔ آرکسٹرا کے درمیان سے گذر کر کنڈکٹر اپنے پیش تختے کی طرف آرہا تھا۔ وہ تیزی سے چل رہا تھا اور اس کے سیاہ فراک کے دامن کھلے ہوئے تھے، مٹھیاں بندھی تھیں۔ اس کی بے چین انگلیوں کے تناؤ میں قوت محسوس کی جا سکتی تھی۔

اس نے اپنے بلند چبوترے پر کھڑے ہو کر چھڑی اٹھائی۔

آرکسٹرا کی آواز سنکر مجھے پچھلے چند دنوں کی باتیں یاد آگئیں — دور دور تک پھیلی ہوئی روسی سرزمین کی وسعتیں اور برف سے ڈھکے ہوئے سبز جنگلوں کی گہرائیاں۔

---

*پیوتر ایلیچ چائکوفسکی (۱۸۴۰ء — ۱۸۹۳ء) — لاجواب روسی کمپوزر تھے۔

لیکن اچانک شعور کی گہرائیوں میں سے کہیں ایک تصویر ابھری — ایک بڑے سفید بادبان کی جو بحری ہواؤں سے بھرا تھا۔ وہ مجھے کیوں یاد آیا؟ ممکن ہے اس وجہ سے کہ ہال کے سارے سفید ستون لپٹے ہوئے بادبانوں سے مشابہہ تھے؟ اور آرکسٹرا کی آوازیں سمندر کی ہواؤں کی طرح تھیں؟.. نہیں، ایسا نہ تھا، کوئی اور بات تھی جو واقعی ہوئی تھی اور اچانک دور ماضی سے نکل کر اوپر آ گئی تھی۔ ہاں، میں نے یہ سمفنی اس وقت سنی تھی جب میں لفظ ''فلہارمونی،، کے معنی بھی نہیں سمجھتا تھا، جب کہ میری ساری دنیا میری عزیز بستی اوایلین کے آخری کھال کے خیمے تک محدود تھی۔

ان برسوں میں میری پیاری بستی کھال کے خیموں کی دو قطاروں پر مشتمل تھی جو خشکی کی لمبی پٹیوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ پہاڑ کے دامن میں اضلاعی انتظامی کمیٹی کی بادامی رنگ کی عمارت تھی اور ساحلی جھیل کے پاس اسکول اور چھوٹی سی گول دوکان تھی۔ یہ تھے اس وقت کے اوایلین کے سارے بڑے بڑے چوبی مکان۔

اسکول میں ہی ریڈیواسٹیشن بھی تھا۔ میں گنگناتے ہوئے تاروں کے نیچے کھڑا تھا جب میں نے ریڈیوآپریٹر کو اپنے چچا سے یہ کہتے سنا:

''اسٹیمر آ رہا ہے۔ اس سے آرٹسٹ آرہے ہیں۔،،

اسٹیمر کا لفظ تو میں جانتا تھا لیکن دوسرا لفظ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

شام کے کھانے پر جب چچا نے چائے پینے

کے لئے اپنا بڑا مینے کا پیالہ اٹھایا تو میں نے ان سے پوچھا:

''یہ آرٹسٹ کیا ہوتا ہے؟،،

چچا کو اچھو لگ گیا اور انھوں نے پیالہ احتیاط کے ساتھ میز پر رکھتے ہوئے پوچھا:

''کیا کہا تم نے؟،،

''کچھ نہیں، میں نے یہ پوچھا کہ آرٹسٹ کیا ہوتا ہے۔،،

''پتہ نہیں،، چچا نے جواب دیا۔

مجھے ان کے جواب سے حیرت ہوئی کیونکہ چچا تو بہت کچھ جانتے تھے۔ انھوں نے بڑی محنت سے روسی زبان سیکھی تھی۔ پنچائتی فارم کے جلسوں میں سلیقے سے تقریریں کرتے تھے اور جب بستر کے پردے کے پیچھے چربی کا چراغ گل ہو جاتا تو وہ روحوں سے ملاقات کرتے، ان کی زبان میں بڑبڑاتے اور مجیرا بجاتے۔

اسٹیمر کے آنے میں دو دن رہ گئے تھے اور خود اپنی کوششوں سے یہ جاننے کے لئے کافی وقت تھا کہ آرٹسٹ کیا ہوتا ہے۔

اسٹیمر عام طور پر ہمارے یہاں طرح طرح کا تجارتی سامان اور کھانے پینے کی چیزیں لایا کرتے تھے۔ دو سال ہوئے وہ مشینیں لائے تھے جو اخبار ''سوویت اوایلین،، چھاپتی تھیں۔ ہر بار جب اسٹیمر آتا تو اوایلین میں بہت سی نئی نئی چیزیں نمودار ہوتیں مثلاً گراموفون، پرائمس چولھے اور بند ہونے والے چاقو... اور کتنے آدمی آتے! اب اوایلین میں کون

نہیں ہے ـ اضلاعی انتظامی کمیٹی کے صدر، ریڈیو آپریٹر، نانبائی پاولوف اور اسکیمو دوکاندار ایمو۔
بستی اور قطبی اسٹیشن کے درمیان ہوا انجن بھی اپنے پر ہلاتا رہتا تھا۔ اس کو بھی اسٹیمر ہی کے ذریعہ لایا گیا تھا۔
ریڈیو آپریٹر کی اس خبر کے دوسرے دن ہی یہ بات صاف ہوگئی کہ آرٹسٹ آدمی ہوتے ہیں۔ یہ تو بڑی دلچسپ بات تھی۔
اسٹیمر کے آنے تک آرٹسٹوں کے بارے میں افواہیں زیادہ تفصیل اور یقین سے پھیل گئیں۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اوایلین جیسی بستی کے لئے جہاں ایک ہارمونیم بجانےوالا ہی کافی تھا (وہ قطبی اسٹیشن کا انجن ڈرائیور تھا)، آخر اتنے موسیقار اور وہ بھی لوک ساز بجانےوالے کیوں آ رہے ہیں۔
''ارے، کہیں ان کو ہماری بستی میں مستقل آباد کرنے کا ارادہ تو نہیں ہے؟،، سابق جھاڑ پھونک کرنےوالے ریپیل نے پوچھا جو اب پنچائتی فارم کی شوقیہ فنکاری کا رہنما تھا۔
''وہ صرف ایک دن کے لئے آ رہے ہیں،، اسکول کے ڈائرکٹر نے وضاحت کی۔ اوایلین میں وہ روسیوں میں اکیلے تھے جو چوکچی زبان جانتے تھے۔
ڈائرکٹر لینن گراد کے رہنےوالے تھے۔ انھوں نے آرکسٹرا کے بارے میں ہمیں دلچسپ باتیں بتائیں۔
''ایسے لوگ بھی ہیں جن کے لئے زندگی میں ایک ہی خوشی ہے یعنی ساز بجانا،، ریپیل نے یہ

جان کر کہ موسیقاروں کو اپنے کام کے لئے تنخواہ ملتی ہے چھپے ہوئے رشک کے ساتھ کہا۔

اس دن چچا نے اپنے خیمے کو نئی کھال سے ڈھکنے کا فیصلہ کیا۔ کھال مدتوں ہوئے سوکھ چکی تھی۔ وہ زمین پر پھیلی ہوئی تھی اور اس میں شیرماھی کی پسلیاں گڑی ہوئی تھیں۔ جب خیمے پر سے پرانی کھال اتار لی گئی تو خیمے کا سیاہ دھواں لگا ہوا ڈھانچہ نکل آیا اور رھائش گاہ میں سورج پہنچ گیا۔ اس نے کتے کے بالوں سے ڈھکی ہوئی زمین کو روشن کر دیا۔ گرمیوں کی خوشگوار ہوا بستر کے سموری پردے سے کھیلنے لگی۔ رواج کے مطابق پڑوسی چچا کی مدد کو آ گئے۔

نئی چھت جلد پھیل گئی اور خیمے کے اندر فوراً آرام اور خوبصورتی کا احساس ہونے لگا۔ ھمیں زرد اور گرم روشنی کی بارش ہو رھی تھی۔ میں اندر بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ چچا نئی چھت پر چل کر کس طرح سیل کی ھڈی کے بیلچے سے اس کے سوراخ بند کر رہے تھے۔ بڑے انسانی سائے نے سورج کی روشنی روک رکھی تھی اور میں ڈر رہا تھا کہ کہیں چچا نئی کھال کو پھاڑ نہ دیں اور ساری تقریب اکارت جائے۔

لیکن سب کچھ ٹھیک ٹھکانے سے ہو گیا۔ چچا نیچے اتر آئے اور سب چائے پینے بیٹھ گئے۔

''اسٹیمر آ گیا ہوتا تو میں بڑی آتش خو اسپرٹ سے تمھاری خاطر کرتا،، چچا نے پڑوسی مددگاروں سے کہا۔

"اور وہ آرٹسٹوں کو بھی لائے گا"، مجھے یاد آیا۔

اور جیسے میری بات کا جواب دیتے ہوئے زرد روشنی سے بھرے خیمے میں دور سے بھونپو کی آواز گھس آئی۔

"اسٹیمر! آرٹسٹ!"، میں چلایا اور سڑک کی طرف بھاگا۔

پہلے تو میں نے افق پر دھواں دیکھا اور پھر اس کے نیچے سفید ڈھانچہ اور اسٹیمر کا سیاہ نچلا حصہ جو پانی سے اوپر اٹھا ہوا تھا۔

"آرٹسٹوں کو لا رہا ہے، آرٹسٹوں کو!"، شور مچاتا میں پانی کی طرف بھاگا جہاں وھیل کشتی تیار کرلی گئی تھی۔

ہر طرف سے ساحل پر لوگ جمع ہو گئے۔ نیم اندھا بوڑھا گائک رینتی گیرگین بھی، جو اپنی آواز کھو چکا تھا ٹیڑھی ٹانگوں پر گھسٹتا ہوا آگیا۔

اس نے اسٹیمر کو دیکھا تو نہیں تھا لیکن پانی کی طرف کبھی ایک اور کبھی دوسرا کان کرکے وہ بڑے شوق سے اسٹیمر کے بھونپو کی آواز سن رہا تھا۔

اسٹیمر ساحل کے قریب آ گیا اور اس کے عرشے پر لوگوں کا ھجوم ہمیں دکھائی دینے لگا۔ پھر بھی اتنے فاصلے سے آرٹسٹوں کو دیکھنا ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ پتہ بھی نہ تھا کہ آرٹسٹ معمولی آدمیوں سے کیسے مختلف ہوتے ہیں۔

ھمارے پنچائتی فارم کی وھیل کشتی اسٹیمر کے سیاہ پہلو کے پس منظر میں سفید دھبے کی طرح معلوم ہو رہی تھی اور اب اس سے اس طرح الگ

ہوئی جیسے وہیل کا بچہ اپنی ماں سے الگ ہوتا ہے۔ وہ ساحل کی طرف چل دی۔ دور سے ہی یہ دکھائی دے رہا تھا کہ کشتی پانی میں ذرا ڈوب گئی: وہ آدمیوں سے بھری تھی۔

میں کشتی پر آرٹسٹوں کو دیکھنے کی امید سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اسٹیمر جتنا قریب آ رہا تھا اس میں بیٹھے لوگ زیادہ صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ روسی اور چوکچی تھے۔ میری یہ امید جاتی رہی کہ میں سب سے پہلے اوایلین کے ان غیرمعمولی مہمانوں کو پہچانونگا۔

بہرحال اس کشتی کے مسافروں میں آرٹسٹ موجود تھے۔ ہاں، مجھے اس کے بارے میں اسکول کے ڈائرکٹر نے بتایا اور سب سے بڑے آرٹسٹ یعنی کنڈکٹر کو دکھا بھی دیا۔ کنڈکٹر جوانوں کی طرح کود کر ساحل پر آ گیا اور سارے مجمع سے صاحب سلامت کی۔ اس کا چہرہ دبلا پتلا اور واضح خط و خال رکھتا تھا۔ ایسے نوجوان چہرے کے ساتھ سفید بال عجیب معلوم ہو رہے تھے۔ کنڈکٹر تیزی سے پتھریلی پٹی پر اوپر کی طرف چلا اور اضلاعی انتظامی کمیٹی کا صدر بھی اس کے پیچھے چھوٹے قدم رکھتا تیز چل رہا تھا۔ انہوں نے اوایلین کے سارے چوبی مکان دیکھ ڈالے، حتی کہ انہوں نے گیمالکوت کے سب سے بڑے کھال کے خیمے کو بھی دیکھا۔

''وہ ایسا خیمہ ڈھونڈھ رہے ہیں جس میں سب آرٹسٹ آ جائیں،، کسی نے اس تلاش کا مقصد بتایا۔

گائک رینتی گیرگین یہ سنکر اس سارے مجمع کو چیرتا ہوا جو کنڈکٹر کے ساتھ ساتھ تھا آگے بڑھا اور کنڈکٹر کا ھاتھ پکڑ کر کہنے لگا:

''آؤ، میرے ساتھ چلو۔''

اس نے یہ بات چوکچی زبان میں کہی تھی لیکن سب کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کنڈکٹر نے اس کی بات فوراً سمجھ لی۔

رینتی گیرگین ان کو چھ بڑے بڑے پتھروں کے پاس لے گیا جو زمین سے آدھے نکلے ہوئے تھے۔ وہ نہ جانے کس زمانے سے یہاں کھڑے تھے اور ان کو مقدس سمجھا جاتا تھا۔ جب ہماری بستی میں جھاڑ پھونک کرنےوالوں اور چوبی مورتیوں کا قلع قمع کیا گیا تو پتھروں کا کچھ نہیں کیا جا سکا کیونکہ وہ زمین میں مضبوط جمے ہوئے تھے اور بہت بھاری تھے۔

''ہم یہاں اپنے گیت گاتے ھیں،'' رینتی گیرگین نے کنڈکٹر کو پتھروں کے پاس لے جاتے ہوئے کہا۔

برابر کھڑے ہوئے اضلاعی انتظامی کمیٹی کے ھدایت کار پی‌اورا نے بوڑھے گائک کی بات کا ترجمہ کیا۔

کنڈکٹر نے پتھروں پر سرسری نگاہ ڈالی، سمندر اور ساحلی جھیل کے چمکتے ہوئے آئینے کو دیکھا۔ ادھر سے جنوبی ھوا آرھی تھی۔

''لاجواب جگہ ھے! یہیں ھمارا آرکسٹرا بجے گا!،،'' کنڈکٹر نے کہا۔

''زمین پر بادبان بچھا دینگے،'' رینتی گیرگین نے کہا جس کا پی‌اورا نے تیزی سے ترجمہ کر دیا۔

''لاجواب!،، آرٹسٹ نے چہک کر کہا۔
کشتیاں آرٹسٹوں کو لینے اسٹیمر کی طرف چلی گئیں اور مقدس پتھروں کے پاس رینتی گیر گین کی رہنمائی میں دو سفید بادبان بچھا دئے گئے۔

جنوبی ہوا ذرا تیز ہو گئی۔ ساحلی جھیل کے آئینے میں ہلکی ہلکی لہریں پیدا ہوئیں۔ سمندر کا زور کم ہو گیا حتی کہ جب آرٹسٹ کشتیوں سے کود کر کنارے آئے تو ان کے جوتے بھی نہ بھیگے۔ وہ سب یکساں لباس پہنے تھے — لمبے سیاہ سوٹ اور آنکھوں کو خیرہ کرنےوالی سفید قمیصیں — اسی‌لئے وہ سب ایک ہی ہستی معلوم ہوتے تھے۔ اور وہ طرح طرح کے کتنے ساز اپنے ساتھ لائے تھے! نازک سیاہ رنگ کی لکڑی کی نفیس وائلن، نوع بنوع قرنا، چوبی اور دھات کے۔ ان کے بڑے ڈھولوں نے تو ہمارے شوقیہ فنکاروں کے رہنما، سابق جھاڑ پھونک کرنےوالے ریپیل کو حیرت میں ڈال دیا جس نے اپنی صدی میں نہ جانے کتنے طرح طرح کے ڈھول بجا رکھے تھے اور آوازوں کی قوت کو پرکھا تھا لیکن ایسے ڈھول کبھی نہ دیکھے تھے۔
موسیقار جلدی میں تھے اور اسٹیمر کا کپتان بھی جلدی کر رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی جنوبی ہوا کو محسوس کرنے کے لئے اپنا چہرہ موڑتا اور تیوریاں چڑھاتا۔
ساری بستی مقدس پتھروں تک امنڈ آئی اور ان ساری بنچوں، اسٹولوں اور چوکیوں کو جو وہاں

تھیں بیٹھنے کے لئے اپنے ساتھ لائی۔ وہ سب ان پھیلے ہوئے بادبانوں کے سامنے بچھا دی گئیں جن پر موسیقار اپنے ٹوٹ کے اسٹول جما کر ساز رکھ چکے تھے۔

کنڈکٹر کے لئے وھیل کی ریڑھ کی ھڈی لنڈھکا کر لائی گئی۔

بالآخر سب کچھ کنسرٹ شروع کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

سامعین آرکسٹرا کے سامنے بیٹھ گئے۔ کنڈکٹر وھیل کی ریڑھ کی ھڈی پر کھڑا ھوگیا اور اپنے ھاتھ میں چھوٹی نازک قمچی لے لی۔

میں سامعین کی پہلی قطار میں کھڑا تھا۔ موسیقار اپنے سیاہ سوٹوں اور سفید قمیصوں میں ان سیاہ شمالی چڑیوں کی طرح معلوم ھو رہے تھے جن کے سینے سفید ھوتے ھیں اور جو ھماری بستی میں چین‌لیوک‌وین چٹان پر چڑیوں کے ھجوم میں ملتی ھیں۔ ھوا کنڈکٹر کے لمبے سفید بال اور بچھے ھوئے بادبانوں کے کنارے اڑا رھی تھی۔

آرکسٹرا کی پہلی آوازیں گونجیں۔ وہ ھوا میں اڑنے‌والی ھزاروں چڑیوں کی شکایتوں جیسی تھیں۔ لیکن نہیں۔ صرف ایسا معلوم ھوتا تھا۔ چڑیاں ھوا سے لڑ رھی تھیں۔ ھر طرف سمندر پھیلا تھا، کہیں آگے نیلا ساحل جھلک رھا تھا، وہ چڑیوں کو پکار رھا تھا اور ان سے طوفان سے پناہ دینے کا وعدہ کر رھا تھا۔ موسیقی انگڑائیاں لے رھی تھی، وہ ھر سکنڈ زیادہ قوی ھوتی جا رھی تھی اور جلد ھی اس کی شاندار اور فاتحانہ گونج سمندر پر پھیل گئی۔

اور ہوا نے چڑیوں کی فاتحانہ چیخوں کو دور دور تک سمندر کی وسعتوں اور ٹنڈرا کے طول و عرض میں پھیلا دیا جہاں سرمئی لومڑیاں اور اولورین پھرتے ہیں، دلدل اونگھتے ہیں اور کائی اور چھوٹی گھنی گھاس اگتی ہے۔ رینڈیروں نے اپنے سینگ اٹھا لئے اور ان غیرمانوس آوازوں کو سننے لگے۔ یہ کہاں سے آرہی ہیں؟ کوئی نئی ہستی اس ساحل پر آ گئی ہے جہاں صدیوں سے ایک ہی طرح کی آوازیں گونجتی رہی تھیں۔ موسیقی تنگ پہاڑی وادیوں میں پھیل گئی، سیاہ پتھریلی چوٹیوں پر پہنچ گئی اور پھر وہاں سے تیرتی ہوئی رینڈیروں کے باڑوں میں پہنچ گئی جو کھال کے خیموں کی شکل میں دریاؤں اور جھیلوں کے کنارے پھیلے ہوئے تھے۔

جنوبی ہوا زور پکڑ گئی۔ وہ سامعین کی پشت سے ٹکرا رہی تھی، ان پر اپنی آواز مسلط کر رہی تھی۔ لیکن لوگ روسی موسیقی سن رہے تھے، کسی نے ہوا کی بات کو نہیں سنا اور ساحلی جھیل کی نیچی لہروں کے ابال کو نہیں دیکھا۔

موسیقی نے جیسے ان سب کو جو اس وقت مقدس پتھروں کے سامنے کھڑے تھے سمندر سے، دیژنیف آبنائے سے، عظیم چوکچی ٹنڈرا سے زیادہ بلند کر دیا تھا۔ ان کے افق نے اور رفعت اختیار کر لی تھی، دنیا کی وسعتیں ان کے سامنے کھول کر رکھ دی تھیں؛ گویا یہ سارا خطہ اور اس کے

سارے خیمے ایک زبردست جہاز میں بدل گئے تھے جو سفید بادبانوں سے لیس تھا۔

مجھ سے قریب ہی بوڑھا گانک رینتی گیرگین کھڑا تھا۔ میں نے ویسے ہی اس پر نظر ڈالی تو بوڑھے کا چہرہ پہچانا نہ جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں کہیں بہت دور دیکھ رہی تھیں، موسیقاروں سے اوپر، سیاہ مقدس پتھروں سے آگے، سمندر پار۔ قطبی بید کی جڑوں جیسی گانٹھدار، اور بھورے رنگ کی انگلیاں عصا کو مضبوط پکڑے تھیں۔ اس کے ہونٹ کچھ بڑبڑا رہے تھے اور وہ خود بالکل سیدھا ہو گیا تھا جیسے وہ بالاقد، زیادہ قوت‌ور اور جوان ہو گیا ہو۔

ہوا اسٹینڈوں پر موسیقی کے ورق اڑا رہی تھی لیکن موسیقار اس کی طرف توجہ نہیں کر رہے تھے۔ ان کی انگلیاں تاروں پر دوڑ رہی تھیں اور ساحرانہ موسیقی پیدا کر رہی تھیں۔

کسی نے بھی وقت کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اینچواونسکی پہاڑ کے اوپر سورج بلند ہوا اور اس کی ترچھی کرنوں نے کھال کے خیموں کی قطاروں کو روشن کر دیا۔ ان کرنوں نے وائلن کے پالش کئے ہوئے حصوں کو چمکا دیا اور نفیریوں کا تانبا جل سا اٹھا۔

آرکسٹرا کے نیچے بچھے ہوئے بادبان موسیقی سے بھر گئے تھے اور موسیقاروں کو لے جارہے تھے۔

اوایلین میں کبھی بھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ جب آرکسٹرا کی آخری آوازیں خاموش

ہوئیں تو سارے مجمع پر تحسین و آفریں کی کیفیت طاری تھی۔ کسی نے تالیاں بجائیں تو سب نے اس کا ساتھ دیا۔ کنڈکٹر وہیل کی ریڑھ کی ہڈی پر سے اتر آیا اور اپنا سفید سر جھکا دیا۔ رینتی گیر گین اس کے پاس گیا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا کر اس نے کنڈکٹر سے کہا:

''یہ ہے حقیقی زندگی!،،

شام کو جب سورج پانی میں غروب ہو رہا تھا موسیقار روانہ ہو گئے۔ کشتیوں پر بادبان کھولدئے گئے۔

اور جب میں نے ان بادبانوں کو دیکھا جن کو ڈوبتے ہوئے سورج نے روشن کردیا تھا، تو میرے سینے میں وائلنوں کے گیت گونج اٹھے۔ میرے برابر ہی بوڑھا گائک رینتی گیر گین کھڑا تھا۔ اب جنوبی ہوا زوروں میں چل پڑی تھی۔ اس نے بادبانوں کو بھر دیا تھا اور وہی نغمے گا رہی تھی جو اس نے ابھی سنے تھے۔

اور بوڑھا گائک چپکے چپکے بڑبڑا رہا تھا۔

''یہ ہے زندگی! یہ ہے حقیقی زندگی!،، میں نے ہوا کے شور کے درمیان سنا۔

...چوتھائی صدی سے زیادہ پہلے کی بات ہے۔ وہ دن میرے لئے اور میرے بہت سے ہم‌وطنوں کے لئے بہت ہی لاجواب دن تھا۔ اوایلین اب بہت دنوں سے ویسا نہیں ہے جیسا وہ اس پہلے کنسرٹ کے دن تھا۔ اب ہماری بستی میں ایک بھی کھال کا خیمہ نہیں ہے اور پنچائتی فارم کے کلب میں بہت بڑے سمفنی

آرکسٹرا کے لئے جگہ ہے۔ میرے ہم‌وطنوں نے جو زیادہ ہمت و جرأت کے ساتھ مستقبل کی طرف دیکھنے لگے ہیں، اپنی زندگی کو مختصر مدت میں ایسا بدل ڈالا ہے کہ پہچانی نہیں جاتی ہے۔ ممکن ہے اس میں روسی کمپوزر پیوتر ایلیچ چائکوفسکی کی اس موسیقی کا بھی ہاتھ ہو جو ''پہلی سمفنی'' کہلاتی ہے۔

میں اسی راستے پر کنسرٹ سے واپس ہوا۔ کہر پہلے کی طرح بڑی بڑی عمارتوں کو لپیٹے تھا اور برف کے ہلکے ذرات درختوں پر کھڑکھڑا رہے تھے۔ میں دیر تک روسی میوزیم کے قریب پوشکن کے کانسے کے مجسمے کے پاس کھڑا رہا۔ میری روح اور خیالات کو موسیقی کے بادبان کہیں دور لئے جا رہے تھے۔

یوری کازاکوف

''انسان اور قدرت کے درمیان، تمام جانداروں کے درمیان جو اندرونی تعلقات نمودار ہوتے ہیں اور غائب ہوجاتے ہیں اور پھر پیدا ہوتے ہیں ان کے انکشاف میں یوری کازاکوف کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ کازاکوف کی نثر جس میں کوئی بات دکھاوے کی نہیں ہوتی کسی مصور کی تصویر کی طرح رنگوں سے بھری ہوتی ہے،، — یوری کازاکوف (سال پیدائش ۱۹۲۷ء) کی کہانیوں کے بارے میں غیرملکی پریس نے لکھا ہے۔

کازاکوف کی کہانیوں کے کئی مجموعے ہیں: ''نیلا اور سبز،،، ''وہ اور وہ،،، ''چھوٹا اسٹیشن،،، ''روٹی کی مہک،، وغیرہ۔ انکی کہانیاں سوویت یونین کی قوموں کی بہت سی زبانوں میں اور ان کے علاوہ بیس سے زیادہ غیرملکی زبانوں میں شائع ہوچکی ہیں۔ یوری کازاکوف کو دانتے کا انعام مل چکا ہے۔

وہ اور وہ

وہ دیر تک اسٹیشن پر اس کا انتظار کرتا رہا۔ دن بہت سرد لیکن دھوپ‌والا تھا اور اسکو سب کچھ اچھا لگ رہا تھا — اسکی‌انگ کرنے‌والوں کی کثرت اور تازہ برف کی چرمراہٹ جس کو ماسکو میں ابھی تک صاف نہیں کیا جاچکا تھا۔ وہ اپنے آپ سے بھی خوش تھا — وہ اسکی‌انگ کرنے‌والے مضبوط جوتے، تقریباً گھٹنوں تک پہنچے ہوئے اونی موزے، بھاری سویٹر اور چھجے‌دار آسٹریائی ٹوپی لیکن سب سے زیادہ شاندار تو اسکیز تھیں جن میں چمڑے کی پٹیاں جڑی تھیں۔

اسکو آج بھی ہمیشہ کی طرح دیر ہوگئی تھی، اسکو پہلے تو اس بات پر غصہ آجاتا تھا لیکن اب وہ اسکا عادی ہوچکا تھا کیونکہ اگر سوچا جائے تو بس یہی ایک اسکی کمزوری تھی۔ اب اس نے اسکیز دیوار کے سہارے رکھدیں اور ہلکے سے اپنے پیر پٹکے تاکہ وہ گرم رہیں۔ پھر وہ اس طرف دیکھنے

لگا جس طرف سے وہ آنے والی تھی اور پرسکون ہو گیا۔ وہ خوش نہیں تھا بس پرسکون ہو گیا تھا۔ اس کو یہ سوچ کر مسرت اور سکون ہورہا تھا کہ کام پر سب کچھ ٹھیک ہے اور سب اسکو پسند کرتے ہیں اور گھر پر بھی اچھا ہے اور جاڑوں کا موسم بھی مزیدار ہے۔ دسمبر کا مہینہ ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مارچ ہے، سورج اور چمکیلی برف اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ اس کی خوب نبٹ رہی ہے۔ جھگڑوں، رقابت، شک و شبہے، بے اعتباری، اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے اور پھر خاموشی اور گہری آہوں کے سوا کچھ نہیں جس سے دل کو بڑی تکلیف ہوتی تھی، اب ان ساری ناخوشگوار باتوں کا زمانہ، خدا کا شکر ہے، گذر گیا، حالات بالکل دوسرے ہو گئے ہیں۔ اب سکون، اعتبار اور نرم و نازک جذبات کا دورہ ہے!

بالآخر جب وہ آئی اور اس کا چہرہ اور جسم دکھائی دینے لگا تو وہ بولا:

''اچھا، تو تم آگئیں...،،

اس نے اپنی اسکیز اٹھا لیں اور دونوں آہستہ آہستہ چل پڑے کیونکہ اسکو ذرا دم بھی لینا تھا، اس نے جلدی کی تھی اور ہانپ گئی تھی۔ وہ سرخ ٹوپی پہنے تھی جسکے اندر سے بالوں کی لٹیں نکلی ہوئی تھیں۔ جب وہ اس کی طرف دیکھتی اسکی آنکھیں ترچھی ہوجاتیں اور جھپکنے لگتیں۔ اسکی ناک پر پہلی ننھی جھائیاں پڑی تھیں۔

وہ ذرا پیچھے رہ گیا اور اچانک سوچنے لگا کہ وہ کیسی خوبصورت ہے اور کیسے سلیقے سے اس نے کپڑے پہنے ہیں۔ غالباً وہ ہمیشہ خوبصورت رہنا چاہتی ہے اور اسی لئے اسکو دیر ہوجاتی ہے، اور اس کی یہ لٹیں ممکن ہے اتفاق سے نہیں نکلی ہیں اور وہ کتنی محبت اور فکر کرنےوالی ہے!

"کیسی دھوپ ہے! کیا جاڑا ہے، اوہ"، اس نے کہا، وہ ٹکٹ لے رہا تھا "ارے، تم کچھ بھولے تو نہیں؟"

اس نے اپنے ہونٹ سکیڑے۔ اس نے تو بہت کچھ لے لیا تھا، اسکو ایسا ہی لگتا تھا کیونکہ اسکا سفری تھیلا کافی بھاری تھا۔

برقی ٹرین کے ڈبے میں بڑا مجمع اور شور تھا۔ لوگوں کے ساتھ اسکیز اور تھیلے بھی بھرے تھے۔ سب شور کررہے تھے، ایک دوسرے کو پکار رہے تھے، شور کرکے جگھوں پر بیٹھ رہے تھے اور اسکیز سے کھٹ پٹ ہو رہی تھی۔ ڈبے کی کھڑکیاں ٹھنڈی اور شفاف تھیں لیکن سیٹوں کے نیچے لگے ہوئے اسٹوو خشک گرمی دے رہے تھے اور کھڑکی سے دھوپ میں پھیلی ہوئی برف بہت اچھی لگ رہی تھی اور جب ٹرین چلی تو نیچے سے پہیوں کی تیز اور ہلکی کھٹ کھٹ بھلی لگ رہی تھی۔

کوئی بیس منٹ بعد وہ ڈبے کی رھگزر میں سگرٹ پینے کےلئے چلا گیا۔ باھری دروازے کا ایک شیشہ غائب تھا اور اس سے رھگزر میں سرد ھوا آکر اسکی دیواروں اور چھت کو سفید کررھی تھی، پالے

اور لوہے کی تیز مہک پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں پہئے کھٹ کھٹ نہیں کررہے تھے بلکہ بجتی ہوئی پٹریوں پر گرج رہے تھے۔

وہ سگرٹ پیتا اور شیشے والے دروازے سے ڈبے کے اندر دیکھتا رہا۔ اسکی نگاہیں ہر سیٹ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسکو سب مسافروں پر افسوس تھا کیونکہ اس کے خیال میں ان دو دنوں میں کوئی اتنا خوش نہ ہوگا جتنا وہ۔ اس نے لڑکیوں پر بھی نظر ڈالی، ان کے بشاش چہرے دیکھے اور پھر ان کے بارے میں ایک غم آگیں بے چینی سوچا جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتا تھا جب وہ کسی نوخیز حسینہ کو اپنے ساتھ نہیں بلکہ کسی اور کے ساتھ اپنے پاس سے گزرتے دیکھتا تھا۔ پھر اس نے اپنی والی کی طرف دیکھا اور خوش ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ یہاں بھی نوجوانوں اور حسیناؤں کے درمیان وہ سب سے اچھی تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دھندلا سا تھا، اسکی آنکھیں سیاہ اور پلکیں لمبی تھیں۔

اس نے بے شیشے والے دروازے سے باہر پالے اور فضا کو بھی دیکھا اور تیز روشنی اور ہوا کی وجہ سے آنکھیں جھپکائیں۔ لکڑی کے چرچراتے ہوئے اور برف سے ڈھکے ہوئے پلیٹ فارم آتے اور تیزی سے گذر جاتے۔ بعض پلیٹ فارموں پر پلائی ووڈ کے چھوٹے چھوٹے چائے خانے تھے، نیلے رنگے ہوئے اور ان کی چھتوں پر لوہے کا پائپ نکلا ہوا جس سے نیلاھی دھواں نکلتا تھا۔ اور اس نے سوچا کہ کسی

ایسے چائےخانے میں بیٹھ کر، گزرتی ہوئی برقی ٹرین کی سیٹی سننا، اسٹوو کے پاس بیٹھکر تاپنا اور بیئر پینا کتنا خوشکن ہوگا۔ اور یوں تو سب کچھ کتنا خوبصورت تھا، کیسا اچھا جاڑا ہے اور کیسی خوشی کی بات ہے کہ وہ اب کسی سے محبت کرسکتا ہے! کہ جس سے اسکو محبت ہے وہ اسی ڈبے میں بیٹھی ہے، اسکو دیکھنا اور جوابی نگاہ سے لطف اندوز ہونا ممکن ہے۔ کیسا لاجواب ہے یہ، وہ بخوبی جانتا تھا کہ کتنی شامیں اس نے تنہا گھر پر گذاری تھیں، جب وہ اسکی نہ تھی یا پھر وہ اپنے دوست کے ساتھ بےمقصد سڑکوں پر گھومتا تھا اور نظریۂ اضافیت اور اسی طرح کی خوشکن دماغی باتوں پر فلسفہ بگھارکر پھر مغموم گھر لوٹ آتا تھا۔ حتی کہ اس نے شاعری شروع کردی جو اس کے دوست کو اس وقت پسند آئی تھی کیونکہ وہ بھی تنہا تھا۔ اب دوست کی شادی ہوچکی ہے...

اس نے سوچا انسان بھی عجیب ہوتا ہے۔ مثلاً وہ خود وکیل ہے اور اسکی عمر تیس سال کی ہوچکی ہے لیکن اس نے کوئی خاص کارنامہ نہیں دکھایا۔ نہ تو کوئی ایجاد کی اور نہ شاعر ہی بنا۔ چمپین بھی نہ بن سکا، جیسے کہ جوانی میں خواب دیکھا کرتا تھا۔ اس کے پاس کتنی ساری وجوہ تھیں افسوس کرنے کی کیونکہ زندگی میں بہت کچھ نہیں ہوسکا تھا، پھر بھی اسکو افسوس نہ تھا۔ اسکا معمولی کام اور یہ بات کہ اس نے کوئی شہرت نہیں حاصل کی تھی اسکے لئے غم کا باعث نہ تھے اور نہ

اس سے اسکو کسی طرح کا ھراس پیدا ھوا تھا۔ اس کے برعکس، وہ اب مطمئن، پرسکون اور معتدل زندگی بسر کررھا تھا جیسے اس نے وہ سب پالیا ھو جس کے خواب اس نے دیکھے تھے۔

ایک بات اب بھی اسکو بےچین رکھتی تھی۔ وہ تھا گرمیوں کا خیال۔ وہ نومبر سے ھی سوچنے لگا تھا کہ وہ اپنی آئندہ گرمیوں کی چھٹیوں میں کیسے اور کہاں جائیگا۔ یہ چھٹیوں کا زمانہ اسکو ایسا لامتناھی اور اسکے ساتھ ھی اتنا مختصر لگتا کہ ھر بات کو پہلے سے اچھی طرح سوچنے اور سب سے دلچسپ جگہ منتخب کرنے کی ضرورت ھوتی تھی تاکہ کوئی غلطی نہ ھو۔ سارے جاڑوں اور بہار کے زمانے میں وہ پریشان رھا، یہ دریافت کرتا رھا کہ کہاں اچھا رھےگا، وھاں کے مناظر اور آب و ھوا اور لوگ کیسے ھیں، کیسے وھاں پہنچا جائے۔ یہ تمام پوچھ گچھ اور منصوبے شاید اس کے لئے چھٹیوں کے سفر سے زیادہ خوشگوار تھے۔

وہ اس وقت بھی گرمیوں کے بارے میں سوچ رھا تھا، کسی چھوٹی ندی کے کنارے سفر کے بارے میں۔ وہ اپنا چھوٹا سا خیمہ لیکر اس ندی کے کنارے آجائیں گے۔ اپنی ربر کی کشتی میں ھوا بھریں گے اور بالکل کسی ریڈ انڈین کی ڈونگی کی طرح ھوجائےگی۔ پھر ماسکو، اسفالٹ کی سڑکوں، ھر طرح کے مقدموں اور قانونی مشوروں کو خدا حافظ!

اور پھر وھیں اس کو یاد آیا کہ وہ پہلی بار کیسے ایک ساتھ ماسکو سے باھر گئے تھے،

استونیا کے ایک چھوٹے شہر، جہاں وہ پہلے بھی کسی کام سے جاچکا تھا۔ کیسے وہ بس پر جا رہے تھے اور رات کو والدائی پہنچے تھے، وہاں بالکل اندھیرا تھا۔ صرف ایک رستوران میں روشنی اور جان معلوم ہوتی تھی، کیسے وہ ایک گلاس وادکا پی کر نشے میں ہوگیا تھا اور بس میں وہ بہت مسرور اور مزے میں آگیا تھا کیونکہ وہ اس کے برابر بیٹھی تھی اور رات کے اندھیرے میں وہ اونگھ اونگھ کر اس پر جھک جاتی تھی، اور کیسے وہ پوپھٹتے اس چھوٹے شہر پہنچے تھے۔ اگرچہ وسط اگست کا زمانہ تھا اور ماسکو میں بارش ہو رہی تھی، لیکن وہاں صفائی اور روشنی تھی۔ سورج نکل رہا تھا، سفید مکانات، سرخ ٹائلوں کی چھتیں، لاتعداد باغات، سکون اور خاموشی اور سڑکوں پر پتھروں کے درمیان اگی ہوئی ٹیڑھی میڑھی گھاس ہر طرف پھیلی تھی۔

انھوں نے ایک صاف ستھرا اور روشن کمرہ ٹھیرنے کےلئے حاصل کرلیا تھا جہاں ہر طرف، کھڑکی کے پاس اور پلنگ کے نیچے اور الماری میں آنتونوفکا نامی قسم کے سیب بکھرے تھے اور انکی تیز مہک آرھی تھی۔ وہاں بہت اچھا استونیائی بازار بھی تھا۔ وہ دونوں ساتھ گئے تھے اور دھوئیں میں تیار کیا ہوا گوشت، شہد، مکھن، ٹماٹر اور کھیرے خریدے تھے۔ یہ سب بہت ھی سستے تھے۔ بیکریوں سے تازہ روٹی کی بھینی بھینی خوشبو آرھی تھی اور ہر طرف کبوتر پر پھڑپھڑا کر اڑ رہے تھے اور غوں غوں کر رہے تھے۔ اور وہ، ایسی

دور دور جیسے ناآشنا ہو اور اس کے ساتھ ھی ایسی محبت کرنےوالی اور قریب۔ وہ کتنا خوش تھا اور شاید اس سے بھی زیادہ مسرت نصیب ہوگی بس جنگ نہ ہو۔

پچھلے دنوں اسکو جنگ کا بہت خیال آرہا تھا۔ وہ اس سے سخت نفرت کرتا تھا۔ لیکن اب چمکتی ہوئی برف، جنگل اور کھیتوں کی طرف دیکھتے ہوئے، ریل کی کھٹ پھٹ کے ہم آهنگ ساز کو سنتے ہوئے اس نے اعتماد کے ساتھ سوچا کہ کوئی لڑائی نہ ہوگی، اسی طرح موت بھی نہیں آئے گی۔ اس نے سوچا، زندگی میں ایسے لمحے ہوتے ھیں جب آدمی دہشت‌ناکیوں کے بارے میں نہیں سوچتا اور بدی کے وجود پر یقین نہیں کرتا۔

وہ اس دوروالے اسٹیشن پر ڈبے سے تقریباً آخری اترنےوالوں میں سے تھے۔ پلیٹ‌فارم پر چلتے ہوئے برف ان کے قدموں کے نیچے چرمرا رہی تھی۔

”کیسا جاڑا ھے!،، اس نے آنکھیں میچتے ہوئے پھر کہا ”مدتوں سے ایسا جاڑا نہیں پڑا تھا!،،

ان کو رات گذارنے کے لئے بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے اس کے دیہاتی بنگلے جانا تھا اور پھر دن میں اسکی‌انگ کرکے شام کو دوسری ریلوے لائن سے گھر لوٹنا تھا۔

اسکے باپ کے پاس پھلوں کا چھوٹا سا باغیچہ اور چوبی تختوں کا بنا ھوا گرمیوں کا بنگلہ تھا۔ اس میں دو پلنگ، میز، چند بھدے اسٹول اور لوھے کا جرمن اسٹوو تھا۔

اس نے اپنی اسکیز پیروں میں باندھیں، کئی بار اچھلا، برف پر اسکیز سے تھپ‌تھپ کیا جس سے باریک برف اڑی، پھر اس نے اس کی کڑیوں اور بندوں کی اچھی طرح جانچ کی اور وہ آہستہ روانہ ہو گئے۔ ابتدا میں وہ تیز جانا چاہتے تھے تاکہ بنگلے تک جلد پہنچ جائیں اور اچھی طرح اسے گرم کرکے آرام کرسکیں لیکن اس طرح کے کھیتوں اور جنگلوں میں تیزی سے گذرنا ممکن نہ تھا۔

''دیکھنا، ان اسپ کے درختوں کے تنے کیسے ہیں!،، اس نے کہا اور رک گئی ''بالکل بلی کی آنکھوں جیسا رنگ ہے۔،،

وہ بھی دیکھنے کے لئے رک گیا۔ اور سچ مچ وہ اسپ کے درخت پھننگیوں پر زردی مائل سبز تھے، بالکل بلی کی آنکھوں کے رنگ جیسے۔

جنگل میں دھواں دھار ترچھی کرنیں آرہی تھیں۔ درختوں کے تنوں کے درمیان کہیں کہیں برف کی چادر لٹکی ہوئی تھی اور صنوبر کے پیڑ بوجھ سے چھٹکارا پاکر اپنے بازو پھیلائے جھوم رہے تھے۔

وہ ایک ڈھلان سے دوسرے ڈھلان پر گذر رہے تھے اور اوپر سے سفید چھتوں‌والے گاؤں کو دیکھتے جاتے تھے۔ سبھی بنگلوں میں اسٹوو جل رہے تھے اور گاؤں دھواں اگل رہے تھے۔ یہ دھواں ستونوں کی شکل میں آسمان کی طرف اٹھتا تھا جو بعد کو ٹوٹ جاتے، ادھر ادھر پھیل جاتے اور آس پاس کی پہاڑیوں کو نیلے نقاب میں چھپالیتے۔ گاؤں سے ایک دو کلومیٹر کے فاصلے پر بھی دھوئیں کی مہک سونگھی

جاسکتی تھی جس سے فوراً یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ جلد گھر پہنچ کر اسٹوو جلا دیا جائے۔

کبھی کبھار وہ ایسی سڑکوں سے بھی گذرتے جن پر جمی ہوئی سخت برف کو برفانی گاڑیوں نے چکنا کرکے چمکادیا تھا اور اگرچہ مہینہ دسمبر کا تھا لیکن ان سڑکوں پر بہار جیسا سماں تھا۔ ان سڑکوں کے کنارے سوکھی گھاس کے ڈھیر، گڈھوں میں شفاف نیلگوں سائے سبھی بہار کی کیفیت پیدا کررہے تھے اور ان میں بہار کی مہک بھی تھی۔ ایک بار ایک سیاہ گھوڑا گاؤں کی طرف دوڑتا جارہا تھا، اس کی کھال چمک رہی تھی اور اس کے پٹھے پھڑک رہے تھے۔ اس کے کھروں سے برف اور یخ اڑ رہی تھیں، چرمرا کر ٹوٹنے اور پھٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ پھر رک گئے۔ ان کی نگاہیں گھوڑے کا پیچھا کررہی تھیں۔

ایک چھوٹا سا جھبرا کوا گھبرایا سا اڑتا نکل گیا اور اس کے پیچھے دوسرا، اور کچھ آگے ایک غوغائی اس کھوج سے بھری کہ ان کوؤں نے کیا دریافت کرلیا ہے ان کے گرد منڈلاتی رہی۔ انھوں نے ان باتوں کو بھی غور سے دیکھا۔ پھر رنگ برنگی چڑیاں تھیں جو منطقۂ حارہ کی چڑیوں کی طرح پالے اور برف میں غیرمعمولی سی لگتی تھیں۔ وہ ایک برف سے نکلی ہوئی گوکھرو کی جھاڑی پر بیٹھ بیٹھ کر جھول رہی تھیں، چڑچڑاتی ہوئی اس کے گرد گھومتی تھیں اور اس پر چونچیں مار رہی تھیں۔ خشک بیج انکی سخت چونچوں سے نکل نکل کر پھیل رہے تھے اور ایک چھوٹی سی پٹی بنارہے تھے۔

کبھی کبھی وہ کسی لومڑی کے پیروں کے نشان دیکھتے جو برابر لیکن پیچ وخم کھاتی ہوئی لکیر میں ایک ٹیلے سے دوسرے ٹیلے تک، ایک تودے سے دوسرے تودے تک چلے جاتے۔ پھر یہ نشان کسی طرف مڑ کر برف کی درخشانی میں غائب ہوجاتے۔ اسکی انگ کرنے والے آگے بڑھتے جارہے تھے اور انکو کبھی خرگوشوں کے تو کبھی گلہریوں کے پیروں کے نشان اسپ اور برچ کے جھنڈوں میں مل رہے تھے۔

رات کی پراسرار زندگی کے یہ سب نشانات جو سرد اور ویران کھیتوں اور جنگلوں میں پھیلے تھے دل کو بےچین کردیتے تھے اور شکار سے پہلے والی رات میں سماوار کی، پیروں تک لمبے بھیڑوں کی کھال کے اوورکوٹ اور بندوق کی، آہستہ آہستہ بہتے ہوئے ستاروں اور ان سیاہ گھاس کے ڈھیروں کی یاد دلاتے تھے جہاں یہ سب خرگوش رات کو گھاس کھانے آتے تھے اور جہاں کبھی کبھی کچھ فاصلے پر لومڑیاں آکر اپنے پچھلے پیروں پر کھڑی ہوتی تھیں اور ہوا کو سونگھتی تھیں۔ بندوق کی گرج، شعلے کی چمک اور پہاڑیوں میں ایک ٹوٹتی، بکھرتی ہوئی اچانک آواز، دیہاتوں کے اطراف میں گھبرائے ہوئے کتوں کا بھونکنا، خرگوش کی شیشے جیسی ٹھی ہوئی آنکھیں، انکی مونچھوں پر جما ہوا سفید سا پالا اور ننھے سے جسم کا گرم وزن — ان سب کا تصور ذہن میں آتا تھا۔

نیچے وادیوں اور گھاٹیوں میں برف گہری اور خشک تھی اور وہاں سے گذرنا مشکل تھا لیکن

پہاڑیوں پر بڑےدار برف کی سخت تہہ پر ہلکی سی نئی گری ہوئی برف کا برادہ سا پھیلا تھا جس سے چڑھائی اور پھر نیچے کی طرف تیز اترنا آسان ہوجاتا تھا۔ دور افق کی سطح پر پہاڑیاں گلابی چمک رہی تھیں، آسمان نیلا تھا اور کھیت لامحدود لگ رہے تھے۔

اس طرح وہ چلے جارہے تھے۔ کبھی اوپر چڑھتے اور کبھی نیچے ڈھال پر پھسل جاتے، گرے ہوئے درختوں کے سہارے آرام کرتے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے۔ کبھی کبھی وہ اس کی گردن میں اپنی باہیں ڈال کر اس کے ٹھنڈے ہونٹوں کو چوم لیتا۔ وہ مشکل سے کوئی بات کرتے تھے، بس اتنا ھی ''دیکھو!،، یا ''سنو!،،

وہ واقعی افسردہ اور کھوئی کھوئی سی تھی اور پیچھے رہ جاتی تھی لیکن وہ کچھ بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ یہ تھکن کی وجہ سے ھے۔ وہ رک کر اس کا انتظار کرتا اور جب وہ پھر اس کے برابر آجاتی اور اسکو غیرمعمولی انداز میں دیکھتی جسمیں ملامت کا شائبہ ہوتا تو وہ جھجکتے ہوئے پوچھتا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ساتھی سے ایسے سوالات کرنا کتنا ناپسندیدہ ھوتا ھے:

''تم تھک تو نہیں گئیں؟ ورنہ آرام کرلیں۔،،

''ارے، تم کیا کہتے ہو!،، وہ جلدی سے کہتی ''یہ تو محض ویسے ھی... کچھ سوچنے لگی تھی۔،،

''اچھا،، یہ کہکر وہ پھر چل پڑتا لیکن ذرا سست رفتاری سے۔

سورج نیچا ہو گیا اور صرف پہاڑیوں پر کھیت دھوپ سے چمک رہے تھے۔ جنگل، وادیاں اور گھاٹیاں بہت پہلے ہی نیلے سایوں میں آکر تاریک ہوچکی تھیں۔ جنگل اور میدانوں کی ان ساری وسعتوں میں صرف دو چھوٹے سے دھبے حرکت کررہے تھے۔ وہ آگے تھا اور پیچھے پیچھے وہ چل رہی تھی۔ اسکو اسکی اسکیز کی برف پر گھسنے اور اسکیز کی چھڑیوں کی کھٹ کھٹ کی آوازیں اپنے پیچھے بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

ایک بار، جنگل کے پار گلابی درخشانی سے جہاں سورج غروب ہوچکا تھا انجنوں کی ہموار گرج سنائی دی اور منٹوں میں بلندی پر ایک ہوائی جہاز نظر آیا۔ وہ واحد روشن چیز تھی اور اسکے ڈھانچے پر دھوپ کے دھبے چمک جاتے تھے۔ نیچے سے یہ منظر بہت بھلا لگ رہا تھا، اس سرد اور افسردہ خاموشی سے، اور اس میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا تصور کرنا بھی جو اپنے سفر کے خاتمے اور اسکے بارے میں سوچ رہے ہوں گے کہ وہ جلد ہی ماسکو پہنچ جائیں گے اور کون انکا انتظار کررہا ہوگا۔

شام کے دھندلکے میں وہ بالآخر اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ انھوں نے اپنے برف سے ڈھکے ہوئے بوٹوں کو پٹک پٹک کر برآمدے میں صاف کیا، دروازے کا قفل کھولا اور اندر داخل ہوئے۔ کمرے میں تاریکی اور باہر سے زیادہ سردی معلوم ہوئی۔

وہ فوراً لیٹ گئی اور اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ راستے کی گرمی سے اسکے پسینہ نکل رہا تھا۔ اب ذرا ٹھنڈک محسوس ہوئی اور اچانک اسکے جسم میں ایسی کپکپی پیدا ہو گئی کہ وہ حرکت کرنے سے بھی ڈرنے لگی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور تختوں سے بنی ہوئی چھت کو دیکھنے لگی۔ اس نے تیل کے لیمپ کی لو دھندلی چمنی میں دیکھی۔ اس نے اپنی آنکھیں پھر زور سے میچ لیں اور فوراً طرح طرح کے رنگ تیرنے لگے — زرد، سبز، سفید، نیلے اور سرخ — وہ تمام رنگ جنکو اس نے اس دن دیکھا تھا۔

وہ برآمدے کے نیچے سے لکڑی نکال کر لایا اور انکو اسٹوو کے قریب ڈال دیا۔ پھر کاغذ کو کھڑکھڑاتے اور سرسراتے ہوئے، کراہتے ہوئے اس نے آگ جلائی۔ لیکن اس کو کسی بات کی خواہش نہ تھی، اسکو افسوس تھا کہ اس کے ساتھ وہ اس بار کیوں آئی۔

اسٹوو لال بھبھوکا ہوگیا، اب کمرہ گرم ہوگیا اور کپڑے اتارنا ممکن تھا۔ اس نے کپڑے، جوتے اور موزے اتار کر اسٹوو کے پاس ٹانگ دئے، صرف ہلکی قمیص پہنے رہا وہ مطمئن تھا، اسکی آنکھیں نیم‌وا تھیں، وہ اپنے ننگے پیروں کی انگلیاں ہلا رہا تھا اور سگرٹ پی رہا تھا۔

''تھک گئیں؟،، اس نے پوچھا ''کپڑے اتارو!،،

وہ ذرا بھی حرکت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ناراضگی اور افسردگی کی وجہ سے وہ سو جانا چاہتی تھی

لیکن اس کی بات مانتے ہوئے اس نے کپڑے اتار دئیے اور جیکٹ، موزے اور سویٹر سوکھنے کے لئے لٹکادئیے۔ اب وہ ایک مردانی چارخانے کی قمیص اور پتلون پہنے رہ گئی۔ وہ پلنگ پر بیٹھی تھی، اس نے اپنے ہاتھ ڈھیلے ڈال دئیے تھے اور لیمپ کو گھور رہی تھی۔

اس نے پیر جوتوں میں ڈالے، جیکٹ کاندھے پر رکھی اور بالٹی لیکر برآمدے کی طرف چلا۔ اس کے جانے پر بالٹی کی جھنک‌دار آواز سنائی دی۔ واپس آکر اس نے اسٹوو پر چائےدانی چڑھائی اور تھیلے میں کھود کھاد شروع کردی۔ اس میں جو کچھ تھا سب نکال کر میز اور کھڑکی پر رکھ دیا۔

وہ خاموش چائے کا انتظار کرتی رہی۔ اس نے اپنے گلاس میں چائے انڈیل لی اور پھر چپ بیٹھ گئی، روٹی اور مکھن چباتی رہی، گلاس سے اپنے ہاتھ گرم کرتی رہی، چائے کی چسکیاں لیتی اور لیمپ کو گھورتی رہی۔

''چپ کیوں سادھ رکھی ہے؟،، اس نے پوچھا ''آج کیسا دن رہا! آں؟،،

''ہاں... میں آج بہت تھک گئی،، وہ کھڑی ہوئی اور اسکی طرف دیکھے بغیر انگڑائی لیکر کہنے لگی ''ہمیں سوجانا چاہئے!،،

''خیال تو برا نہیں ہے،، وہ بہت آسانی سے راضی ہوگیا ''ذرا رکو، میں کچھ اور لکڑیاں لگا دوں۔ گھر ٹھنڈا ہوگیا ہے۔،،

''میں آج تنہا لیٹونگی۔ ممکن ہے کہ یہاں اسٹوو

کے قریب؟ ناراض نہ ہونا،، اس نے جلدی سے یہ کہکر آنکھیں جھکالیں۔

''ارے، کیا ہوا؟،، اس نے حیرت سے کہا اور پھر اسکو یاد آگیا کہ وہ پورے دن کیسی افسردہ اور الگ الگ سی رہی تھی۔ اس یاد نے اسکو ناراض کردیا اور اس کے دل کی دھڑکن دردآمیز ہوگئی۔

اچانک اسکی سمجھ میں آیا کہ وہ اسکو بالکل نہیں جانتا ہے: وہ اپنی یونیورسٹی میں کیسے تعلیم حاصل کررہی ہے، اسکی کس سے جان پہچان ہے اور وہ کن باتوں کے بارے میں گفتگو کرتی ہے۔ اور وہ اب بھی اسکے لئے اسی طرح معمہ ہے جیسی پہلی ملاقات میں تھی۔ وہ اسکے لئے اجنبی ہے اور غالباً اس کے لئے وہ بھدا اور کم‌عقل ہے کیونکہ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اسکو کیا چاہئے اور کچھ اس طرح نہیں ہوسکتا کہ وہ اس کے ساتھ ہمیشہ خوش رہ سکے اور اسکو کسی بات اور کسی دوسرے شخص کی ضرورت نہ رہے۔

اور اچانک اس کو اس سارے دن پر، اس حقیر بنگلے، اسٹوو پر، حتی کہ نہ جانے کیوں اس پالے، سورج اور اپنے اطمینان پر شرم آنے لگی — ہم کیوں آئے، ان سب باتوں کی کیا ضرورت تھی؟ اور وہ منحوس مسرت کہاں ہے جسکی بڑی تعریف تھی؟

''اچھا، کیا ہوا...،، اس نے سردمہری سے کہا اور زور سے سانس کھینچی ''جہاں چاہو لیٹو۔،،

اسکی طرف دیکھے بغیر اور کپڑے اتارے بغیر وہ فوراً لیٹ گئی، اپنے کو جیکٹ سے ڈھک لیا اور

اسٹوو میں آگ کو دیکھنے لگی۔ وہ دوسرے بستر
پر چلا گیا اور بیٹھا، سگرٹ پیتا رہا اور پھر لیمپ
بجھا کر لیٹ گیا۔ اسکے دل کو لگی تھی کیونکہ
وہ محسوس کررہا تھا کہ اب وہ اسکے پاس سے جارہی
ہے۔ بہرحال انکو خوشی نہ نصیب ہوسکی لیکن
کیوں، اسکو یہ نہیں معلوم تھا اور اسکو غصہ آگیا۔

چند منٹ میں اس نے سنا کہ وہ رو رہی ہے۔
وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور میز کے پار اسکو دیکھا۔
اسٹوو کی وجہ سے کافی روشنی تھی۔ وہ کروٹ کے
بل لیٹی تھی اور جلتی ہوئی لکڑی کو دیکھ رہی
تھی۔ اس نے اس کا غمگین آنسوؤں سے بھرا ہوا
چہرہ دیکھا جو رنج کی وجہ سے بگڑ گیا تھا۔ اس
کے ہونٹ اور ٹھڈی تھرتھرا رہے تھے، آنکھیں بھیگی
تھیں جنکو وہ بار بار اپنے نازک ہاتھ سے صاف
کررہی تھی۔

کونسی بات آج اس کے لئے اچانک ایسی ناگواری
اور ناخوشی کی ہوئی تھی؟ وہ خود یہ نہیں جانتی
تھی۔ وہ صرف یہ محسوس کررہی تھی کہ اب محبت
کی پہلی لہر گذرچکی تھی، اب کوئی نئی چیز آرہی
تھی اور پہلےوالی زندگی غیردلچسپ ہوگئی تھی۔
وہ اس بات سے عاجز آگئی تھی کہ وہ اس کے ماں
باپ، چچاؤں اور چچیوں، اسکے دوستوں اور اپنی
سہیلیوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔
وہ بیوی اور ماں بننا چاہتی تھی لیکن وہ اسکو نہیں
سمجھتا اور وہ موجودہ حالت میں ھی مگن ہے۔
اسکو اپنی محبت کے ابتدائی بےچین زمانے پر

بے حد افسوس تھا جب سب کچھ بہت غیرواضح اور غیریقینی تھا لیکن اس کے ساتھ ھی بہت پرجوش اور نئے پن سے بھرپور۔

پھر اسکو نیند آنے لگی اور اسکو اسکے دوردراز کے خوابوں نے گھیرلیا جن کے درمیان وہ اس وقت سوتی تھی جب وہ چھوٹی سی بچی تھی۔ کہ گویا وہ بہت قوت‌ور اور بہادر تھا اور اس سے محبت کرتا تھا اور وہ بھی اسکو چاھتی تھی، لیکن نہ جانے کیوں اس نے ''نہیں،، کہہ دیا، اور پھر وہ دور شمال میں چلاگیا اور مچھیرا ھوگیا اور وہ اسکی یاد میں کوفت برداشت کرتی رھی۔ وہ وھاں ساحل کے کنارے کی چٹانوں پر شکار کھیلتا، ایک چٹان سے کود کر دوسری پر جاتا، گیت بناتا، سمندر پر جاکر مچھلیاں پکڑتا اور ھر وقت اس کے بارے میں سوچتا رھتا۔ ایک بار وہ سمجھ گئی کہ اگر اسکو خوشی نصیب ھوسکتی ھے تو اسی کے ساتھ۔ وہ سب چھوڑ چھاڑ کے اس کے پاس چلی گئی۔ وہ ایسی خوبصورت تھی کہ راستے میں ھوابازوں، شوفروں اور جہازرانوں سبھی نے اسکی خاطریں کیں لیکن اس نے کسی کو بھی نگاہ بھرکر نہ دیکھا اور صرف اسی کے بارے میں سوچتی رھی۔ اس سے ملاقات ایسی غیرمعمولی ھونی چاھئے تھی کہ اسکا تصور بھی دشوار تھا۔ وہ اس میں تاخیر کی نئی سے نئی باتیں سوچتی تاکہ وہ وقت نہ آئے۔ اس طرح وہ عام طور پر سوجاتی اور اس سے ملاقات نہ ھوتی۔

مدتوں سے اس نے ایسے خواب کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ نہ جانے کیوں آج پھر اس نے یہ خواب دیکھنا چاہا۔ اور آج بھی جب وہ موٹر کشتی پر جا رہی تھی پھر اس کے خیالات گڈمڈ ہو گئے تھے اور وہ سوگئی تھی۔

رات کو وہ سردی کی وجہ سے چونک پڑی۔ وہ اکڑوں بیٹھا ٹھنڈے اسٹوو کو گرم کررہا تھا۔ اسکا چہرہ غمگین تھا۔ اس پر اسکو رحم آگیا۔

صبح کو وہ شروع میں تو چپ رہے، خاموشی سے ناشتہ کرلیا اور چائے پی لی لیکن بعد میں ذرا چونچال ہوئے اور اسکیز لیکر اسکی‌انگ کے لئے چلدئے۔ وہ پہاڑیوں پر جاتے اور پھر نیچے پھسلتے۔ وہ سب سے زیادہ پیچیدہ اور خطرناک جگہیں منتخب کر رہے تھے۔

گھر آکر انھوں نے تاپا، ادھر ادھر کی، کام کاج کی باتیں اور اسکا ذکر کرتے رہے کہ اس سال جاڑے کا موسم کتنا اچھا ہے۔ اور جب اندھیرا ہونے لگا تو وہ روانگی کے لئے تیار ہوگئے، بنگلے میں تالا لگاکر اسکیز پر اسٹیشن کی طرف چل پڑے۔

انکی ٹرین شام کو ماسکو پہنچی۔ وہ اونگھ رہے تھے۔ لیکن جب بڑے بڑے مکانات اور روشن کھڑکیوں کی قطاریں دکھائی دینے لگیں تو اس نے سوچا کہ وہ اب جدا ہوجائیں‌گے اور اچانک اس نے اپنی بیوی کی حیثیت سے اسکا تصور کیا۔

کیوں نہیں! جوانی کا ابتدائی زمانہ گذر گیا

جب سب کچھ سادہ اور غیرضروری لگتا ہے۔ گھر، بیوی، خاندان اور اسی طرح کی ساری چیزیں۔ میں تیس سال کا ہوگیا۔ اب وہ وقت گیا جب یہ خیال کیا جاسکے کہ وہ تمھارے ساتھ ہے اور وہ خوبصورت بھی ہے لیکن تم اسکو چھوڑ کر دوسری کے ساتھ جا سکتے ہو کیونکہ تم آزاد ہو۔ اس احساس میں درحقیقت کوئی خوشی نہیں ہے۔

کل کا سارا دن قانونی مشورے دینے، اپیلیں اور درخواستیں لکھنے، لوگوں کی مشکلات کے بارے میں سوچنے میں، جن میں گھریلو دشواریاں بھی ہونگی، گذر جائیگا اور پھر گھر جانا ہوگا۔ لیکن کس کے پاس؟ پھر گرمیاں آئیں گی، طویل گرمیاں، طرح طرح کے دورے، کشتیاں، خیمے اور پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کس کے ساتھ؟ اس کے دل میں زیادہ اچھے بننے، بہتر انسان بننے اور وہ سب کرنے کی خواہش جاگی جس سے اس کی ساتھی کو خوشی ہو سکے۔

لیکن جب وہ اسٹیشن سے باہر نکل کر چوک میں آئے تو ہر طرف لیمپ جل چکے تھے، شہر میں چہل پہل تھی اور برف صاف کی جاچکی تھی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ جیسے ان کا یہ سفر ہوا ہی نہ تھا، وہ دو دن ایک ساتھ نہیں رہے تھے، کہ ان کو ایک دوسرے کو الوداع کہنا تھا، اپنے اپنے راستے جانا تھا اور ممکن ہے دو تین دن بعد پھر ملنا تھا۔ وہ روزمرہ کے ڈھرے پر آگئے تھے اور سکون و آرام محسوس کررہے تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی رخصت ہوئے، ایک سرسری مسکراہٹ کے ساتھ۔ اور وہ اسکو گھر تک پہنچانے نہیں گیا۔

ای اون دروتسے

''بچپن میں میرے پاس جوتے نہ تھے۔ جب موسم خراب ہوتا تو میرے باپ مجھ کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر اسکول پہنچاتے۔ راستے میں وہ اکثر مجھ سے پوچھتے (یہ سچ ہے کہ کافی شک و شبہ کے ساتھ):

''تیرا کیا خیال ہے، کیا تو کچھ ہو سکے گا؟''

سال گزرتے گئے۔ میری پہلی چھوٹی تصانیف نے والد کو کچھ زیادہ متاثر نہیں کیا۔ وہ یہ انتظار کرنے لگے کہ ان کے بعد کیا ہوگا۔ وہ انتظار کر رہے ہیں کیونکہ یہی قرض مجھ کو ادب تک لایا۔ اس چھوٹے مالداویائی گاؤں کا قرض جو اگرچہ نقشے پر کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن اس طرح محبت کر سکتا ہے کہ اس سے بہار کبھی نہیں جاتی۔''

ای اون دروتسے (سال پیدائش ۱۹۲۸ء) کی اپنی اس انوکھی سوانح عمری کے مزاح اور غنائی انداز

بیان سے ہی ان کے جوہروں اور صلاحیتوں کا اظہار ہو جاتا ہے۔ وہ مالداویا کے باجوہر نثر نگار اور ڈرامہ‌نویس ہیں۔ انھوں نے اپنے گاؤں کا قرض پوری طرح چکا دیا ہے۔ ان کی کہانیاں، ''گیورگے، بیوہ کا بیٹا،، نامی افسانہ اور ناول ''استیپی کے نغمے،، اور ''ہماری نیکیوں کا بار،، ہمارے پورے ملک میں مشہور ہیں۔

بادیا چیریش

بوڑھاپا تو پرانا لباس ہے
لیکن میں تجھ کو اتاروں کیسے؟

(مالداویا کا ایک لوک گیت)

بادیا چیریش نامی گاؤں اس سب سے بڑے گاؤں سے بھی تین گنا بڑا ہے جسے آپ کو کبھی دیکھنے کا موقع ملا ہوگا۔ اور جب ایسا ہو تو باقی باتیں بھی اسی لحاظ سے ہونگی۔ اسی لئے یہاں صبح سے لیکر شام تک کا وقت تین دن کے برابر ہوتا ہے اور ایک شادی کے بیچ میں دو تین شادیاں اور ہو جاتی ہیں۔ یہاں کے مذاق فیتےدار ہوتے ہیں تاکہ ان کو نظر نہ لگ جائے۔

گاؤں تو بڑا ہے اور یہاں کے چھوٹے بڑے سبھی بہت تیز اور زندہ‌دل ہیں، لیکن یہاں بادیا چیریش کی طرح نہ کوئی مذاق کرتا ہے اور نہ

لوگوں کو ہنساتا ہے ۔ حتی کہ پڑوسی گاؤں بوتوچینی کے لوگ جو سال میں ایک بار، جب مرغی انڈوں سے چوزے نکالتی ہے ہنستے ہیں، وہ بھی اسکو تسلیم کرتے ہیں :

''ہاں، اس چیریش کے اندر بہت سے شیطان بیٹھے ہیں...''

اور غالباً ہے بھی ایسا ہی کیونکہ خود بادیا چیریش اس کی تردید نہیں کرتا ۔ شراب کے گلاس کے ساتھ وہ یہ اعتراف کرتا ہے کہ اس کے اندر شیطان ہوں یا نہ ہوں لیکن کوئی بری روح ضرور بیٹھی ہوئی ہے جو اس کو ہمیشہ گناہ کی طرف گھسیٹتی ہے اگرچہ فطرتاً وہ اتنا باہوش اور خاموش ہے کہ اپنے آپ سے بات کرکے ہی لطف حاصل کر لیتا ہے ۔

بہت سے لوگ اس کی باتیں سنتے تھے لیکن بہت کم یقین کرتے تھے — بادیا چیریش کی باتوں کا یقین کرنے کے لئے بالکل بدھو ہونے کی ضرورت تھی ۔ وہ جو کچھ کل کہتا ہے آج بھول جاتا ہے اور آج کا قصہ کل وہ ایک نئے خاتمے کے ساتھ شروع کرتا ہے ۔ اسمیں کوئی حیرت کی بات نہیں کیونکہ اس کی چوڑے کناروں والی عنابی ٹوپی کے اندر کم ازکم تین چیریش تو اور ہیں ۔ لیکن خدا نے ان کو تو کل دو ہاتھ اور ایک منہہ دیا ہے تاکہ دوسروں کے لئے کچھ نہ کچھ بچ جائے ۔

ان تین میں سے ہی ایک تھا بادیا چیریش — مسخرہ ۔ بس کسی نئے مذاق سے لطف لیتی ہوئی

چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنے چوراھے پر آتے
ھی چاروں طرف سے لوگ اس کو گھیر لیتے اور
اتنے زوروں کے قہقہے لگاتے کہ ایک بار تو گوریاں
بھی بہری ہوگئیں اور جب صبح کو عورتیں ان کو
کچھ کھانے کے لئے دینے گھروں سے نکلیں تو وہ
اڑکر ان کے پاس نہیں گئیں۔

خیر یہ تو کوئی بات نہیں، محض گلکاری ہے۔
اس کا مطلب یہ ھوتا تھا کہ بادیا چیریش پر مذاق
کا دورہ پڑ گیا ھے۔ اصل مذاق تو بہترین گیتوں
کی طرح، خم کی تہہ میں ھی ھوتے ھیں جو اپنی
قیمت بخوبی جانتا ھے۔ اور میرے خدا، جب وہ
اپنی قمیص کے بٹن کھولکر مذاق کی گرمی دکھاتا
ھے تو آسمان پر سورج اور ستارے اسکو حیرت سے
تکنے لگتے ھیں۔ وہ اپنی ساری آنکھیں نیچے بادیا
چیریش پر لگا دیتے ھیں۔ اس وقت ایسا معلوم ھوتا
ھے کہ اس کے ھر ناخن پر طرح طرح کی ھونی اور
انہونی کہانیاں موجود ھیں اور پھر اس کے ساتھ
ایک دو گھنٹے اور نہ گزارنا بڑی حماقت ھوگی۔

اسی عنابی ٹوپی کے نیچے دوسرا شخص انگوروں
کی کاشت کرنےوالا بادیا چیریش تھا۔ ادھر وہ
انگوروں کے باغ میں آیا، اپنی آستینیں چڑھائیں، ٹوپی
نیچے کی طرف کھسکائی اور پھاوڑا اس کے ھاتھ
میں پہنچ کر رونے اور کراھنے لگا۔ پنچائتیفارم
کی ھزاروں انگوری بیلیں چھوٹی چھوٹی قطاروں میں
اس کو گھیر لیتیں تاکہ وہ ان کو جاڑے سے
محفوظ رکھنے کے لئے ملبوس کرسکے۔ اس کو

دیکھ کر یہی پتہ چلتا تھا کہ ساری زندگی اس کے ہاتھوں نے بس انگور کی بیلیں ہی بوئی ہیں، ان کو ملبوس کیا ہے اور انگور جمع کئے ہیں۔

اور آخر میں تیسرا شخص، وہ بھی اسی عنابی ٹوپی کے نیچے بزرگ خاندان بادیا چیریش تھا۔ گھر کے اندر وہ اس شان سے قدم رکھتا جیسے وہ ابھی کسی نئے فرمان پر دستخط کرکے آیا ہے۔ اگر وہ دو ایک لفظ کہنے پر مجبور ہوتا تو ان کو اس طرح آہستہ آہستہ اور رک رک کر ادا کرتا جیسے وہ اپنی بیوی کو نہیں بلکہ دور حاضر کے کسی گزرتے ہوئے لمحے کو مخاطب کر رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ بڑھیا تپ جاتی اور اس کی ناراضگی کو دور کرنے کے لئے بادیا چیریش وقتاً فوقتاً کچھ پی پلا کر اور ہشاش بشاش ہوکر گھر واپس آتا تاکہ اپنی رفیقۂ حیات کو آدھ گھنٹہ بڑبڑانے کی معقول وجہ عطا کر سکے۔ اور جب وہ دیکھتا کہ اس کی پیاری ایلینکا سب کچھ کہنے کے بعد بھی محض اس لئے بڑبڑاتی چلی جاتی ہے کہ وہ رک نہیں سکتی تو اپنی ٹوپی آنکھوں تک جھکا کر پوچھتا:

"ارے، اپنے شوہر کو ناراض کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟"

اور اکثر ایسا ہوتا کہ مسخرہ چیریش بزرگ خاندان چیریش سے میدان مار لے جاتا اور عنابی ٹوپی پھر پیچھے کی طرف گدی تک کھسک جاتی۔

''ارے، ایلینکا...، بہرحال، یہ بتاؤ کہ کس احمق نے تم کو میرے ساتھ شادی کرنے کی صلاح دی تھی؟ یا یہ کہو کہ وہ بالکل احمق نہ تھا؟''

اس کو چیریش اسی لئے پکارتے تھے کہ وہ چیری کے پیڑ کی طرح بلند بالا اور تنومند تھا۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا گاؤں عنابی ٹوپی گدی تک کھسکا کر سڑک پر چل رہا ہے۔

جس شخص نے پہلی بار تریفانیشتی گاؤں کو بادیا چیریش کا نام دیا تھا اس نے یقیناً دنیا میں بہت کچھ دیکھا ہوگا کیونکہ یہ نام تو چپک کر رہ گیا۔ اور یہی نام اب زندہ ہے اور بہت دن تک قائم رہیگا کیونکہ اس کو تیس سال ہو چکے ہیں اور بادیا چیریش کی دائیں کنپٹی کے ابھی دو ہی بال سفید ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ چیریش کی ایلینکا نے ان کو اکھاڑ پھینکنا چاہا لیکن بادیا چیریش نے یہ نہ کرنے دیا — ان کو خوبصورتی کے لئے برقرار رکھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے چیریش نے برسوں کے ساتھ چپکے سے سازش کرلی ہو، وہ اس کے پھاٹک کے باہر پیر پٹکتے اور قہقہے لگاتے ہیں اور اس کو سدابہار مذاقوں کی طرح سدابہار رہنے دیتے ہیں۔

صبح کو پھاٹک چرچرایا جس سے بادیا چیریش کی آنکھ کھل گئی۔ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ پڑا رہا کہ کس کے قدموں کی آواز آنے والی ہے لیکن قدموں کی جگہ پھاٹک پھر چرچرایا۔

چیریش اچھل کر پلنگ سے کھڑا ہو گیا اور کھڑکی کے پاس آ گیا۔

''کون ہے؟،، ایلینکا نے پوچھا۔

''سوچو تو، ہوا پھاٹک بند کرنا سیکھ رہی ہے...،،

وہ واپس گیا، اور لیٹنا چاہتا تھا لیکن تکئے پر وہ گرم جگہ جہاں سیٹھی نیند آتی تھی جا چکی تھی، اس کی تلاش کی اور بڑبڑاتے ہوئے تکئے کو ادھر ادھر الٹا پلٹا۔

''ایلینکا ذرا سننا... شام کو تم یہاں میرے پاس لیٹنا... ورنہ اگر ایک منٹ کو اٹھتا ہوں تو بستر کو گرم رکھنےوالا کوئی نہیں رہتا...،،

پھر اس نے کپڑے پہنے اور اپنا برما ڈھونڈھنے باھر نکلا۔ معلوم نہیں وہ اسے کس لئے چاہئے تھا۔ پورا ھفتہ ہو چکا ہے کہ صبح بستر سے اٹھتے ہی برما ڈھونڈھنے لگتا ہے۔ غالباً اب اس کی اتنی ضرورت بھی نہیں رہی ہے۔ اسکو تو محض آدھ گھنٹے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے اندر کوئی مذاق انگڑائی لے تاکہ کسی آدمی سے ملنے پر اس کی ھیٹی نہ ہو۔

ممکن ہے کہ یہ بہار کی ابتدا کی وجہ سے ہو یا کسی دوسری وجہ سے کہ اس نے پورا گھنٹہ برما ڈھونڈھنے میں صرف کیا اور برابر یہ دھمکی دیتا رہا کہ اگر اس کو پا گیا تو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کے سامنے پھینک دیگا۔ اور آخر میں وہ مل بھی گیا لیکن اس کو کتوں کے سامنے پھینکتے ہوئے افسوس ہوا، چنانچہ اس کو اٹھا کر ایک طاقچے پر رکھدیا۔

پھر بالٹی اٹھالی جسمیں شام کا تھوڑا سا پانی بچ رہا تھا اور باہر چلا گیا۔ مرغیوں نے یہ طے کرکے کہ ان کو کھانا دیا جانےوالا ہے دم بھر میں اس کو گھیر لیا۔ چیریش نے چپکے سے بالٹی کو الٹ دیا جس سے ایک مرغ شرابور ہو گیا اور جب وہ اپنے پر پھڑپھڑا رہا تھا تو چیریش نے رشک کے ساتھ کہا:

''آہ، آج بھی ساری مرغیاں اس سے چونچیں ملائیں گی...''

کنوئیں کے قریب آ کر اس نے پہلا کام یہ کیا کہ کئی بار کھانسا تاکہ پڑوسی کہیں یہ نہ سمجھیں کہ صبح تڑکے تازہ پانی چرانے آیا ہے۔ کنوئیں میں بالٹی ڈالی۔ ابھی وہ اسے کھینچنے ہی لگا تھا کہ دوسری بالٹی کی جھنک سنائی دی۔ سڑک کے کنارے آہستہ خرامی سے آریوناش کی بیوی ماریاوتسا کنوئیں کی طرف آ رہی تھی۔ وہ حسین عورت تھی اور اس کی آنکھیں ایسی سیاہ تھیں کہ ان کو نظر بھر کر دیکھتے ہی آدمی کے اندر سارے شیطان انگڑائی لینے لگتے تھے۔ لیکن پچھلے دنوں سے بادیا چیریش کے شیطان ذرا کاہل ہو گئے تھے اس لئے وہ بالٹی آہستہ، بہت آہستہ کھینچتا رہا۔

''ارے، ماریاوتسا تیرا شوہر اتنے سویرے تجھکو تن تنہا کنوئیں پر کیسے آنے دیتا ہے؟''

ماریاوتسا بالٹی پتھر پر رکھ دیتی ہے جو اسی کے لئے ہے۔ بادیا چیریش پرنالے کے سرے پر بیٹھ جاتا ہے جو بہت پرانا ہے اور ایک بید مجنوں کو کھوکھلا کرکے بنایا گیا ہے۔ لیکن ایک معجزہ یہ

ھوا کہ اپنے بوڑھاپے کے باوجود اسمیں دو شاخیں پھوٹ پڑیں۔

''بادیا چیریش، اس کو کیا خوف ھو سکتا ھے؟،، ماری اوتسا نے جواب میں پوچھا۔

''ارے، کوئی جوان بیچ میں آ گیا تو تمھارا بےچارہ شوھر تو لنڈورا رہ جائیگا۔،،

''کوئی نہیں مجھے بھگالے جائیگا، بادیا چیریش... تم دو سال سے مجھ کو ڈرا رھے ھو اور میں منحوس روز صبح پانی لینے آتی ھوں اور کوئی بھی تمھارا جوان نہیں ھوتا...،،

''تو تم چلی جاتیں؟،،

''اور کیا... میں اکیلی تنگ آگئی ھوں... آریوناش چلا گیا ٹریکٹر لیکر بوتوچینی میں جوتائی کرنے۔ ساری گرمیوں بھر اس کو نہیں دیکھا...،،

بادیا چیریش نے دائیں آنکھ میچنا بند کر دی۔

''مشکل ھے، ماری اوتسا؟،،

''مشکل ھے، بادیا چیریش۔ کل گائے نے باڑ کی ایک بلی اکھاڑدی اور اب وہ صحن میں گھوم رھی ھے اور میں اس بلی کو پھر اپنی جگہ پر گاڑ نہیں سکتی...،،

''ماری اوتسا میں شام کو آکر بلی لگا دونگا...،،

''آنا، بادیا چیریش...،،

اپنے بھلے پن کی نشانی کے طور پر بادیا چیریش نے وہ تازہ پانی ماری اوتسا کی بالٹی میں ڈال دیا جو اس نے کنوئیں سے بھرا تھا اور اس نے دیکھا کہ اس عارضی بیوہ کی آنکھیں کیسی چمک رھی ھیں۔

''ارے، اس کے ساتھ بات چیت میں کتنا لطف ہے، واہ، کتنا لطف...،،

اور وہ گھر بہت ناراض لوٹا اور چلایا:

''ارے، ارے، بھلا عورتوں کو کنوئیں پر بھیجنے کی بات کون سوچ سکتا ہے؟ یہ ماری اوتسا بس بالٹی کنوئیں میں ڈبوتے رہ گئی!،،

اس طرح حالات پر پردہ ڈالکر، بادیا چیریش نے گھر کا کچھ کام کاج دیکھا اور پھر کھانے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ مونچھیں ٹھکانے سے تراشیں۔ اس نے اپنے بوٹوں کو چمکانا چاہا کیونکہ نہ جانے کیوں عورتوں کو یہ بات بے حد پسند ہے کہ مردوں کے جوتے چمکتے رہیں۔ لیکن مصیبت یہ آئی کہ برش کہیں چھپ گیا۔ چیریش اس کو اس وقت تک تلاش کرتا رہا جب تک لوگ پنچائتی فارم سے نہیں آئے۔ کوئی پیپہ رسنے لگا تھا اور چیریش لاجواب پیپے ساز تھا۔ موقع واردات پر پہنچ کر پہلے تو اس نے یہ تحقیقات کی کہ پیپے میں بھرا کیا تھا تاکہ امکانی نقصان کا اندازہ ہو سکے، اور جب پیپے کی مرمت ہو چکی تو اس سے درخواست کی گئی کہ وہ بقیہ پیپوں کی بھی جانچ کرلے۔ بادیا چیریش نے ان کی طرف فاضل توجہ کرنے میں کافی وقت ضائع کر دیا۔ چنانچہ جب وہ آدھی رات کو گھر لوٹا تو کافی بست ہو چکا تھا۔

اس نے خاموشی سے کھانا کھایا اور اس پر کان لگائے رہا کہ ایلینکا اسٹوو سے اس کا کیسے جائزہ لے رہی ہے اور پھر اس نے اسی خاموشی سے جوتے اتارنا

شروع کئے ۔ اچانک اس کو یاد آیا کہ آج وہ اپنے جوتوں پر پالش کرنےوالا تھا ۔

''آہ، شیطان...،،

ساری اوتسا کے یہاں جانا بھول گیا ۔ اب تو دیر ہو چکی تھی ۔ لیٹ گیا لیکن سویا نہیں ۔ وہ اس کو کیسے بھول گیا، وہ زندگی میں ایک بار بھی کسی عورت کی خدمت کرنا نہیں بھولا تھا...

''میاں چیریش، بڈھے ہو چلے ہو کیا؟،،

اس نے اپنے ذہن میں وہ ساری باتیں دھرانا شروع کیں جو سال بھر میں کی تھیں ۔ اس سال بھی، پچھلے سال کی طرح دسیوں وزنی بورے اس وقت تک اس کی پیٹھ پر لدے رہے تھے جب تک اس نے ان کو آٹامل سے گاڑی تک نہیں پہنچا دیا تھا؛ پچھلے سال کی طرح اب بھی میزیں صاف ہو جاتی تھیں جب وہ ان سے اٹھتاتھا، اور اس کے مذاق بھی پہلے کی طرح گاؤں کے تین چکر لگاتے تھے...

اور پھر بھی... ساری اوتسا کا معاملہ دیکھنا بھول گیا...

''میاں چیریش، آؤ ٹھیک سے گنتی گنو...،،

وہ کہنی کے بل ابھرا اور گننا شروع کر دیا ۔ اس نے برسوں کا شمار نہیں کیا ۔ یہ اس کا کام نہ تھا ۔ کوئی آدمی چالیس سال کی عمر میں ھی بوڑھا ہو جاتا ھے تو کوئی ساٹھ سال کا ہو کر شادی کرتا ھے ۔ بادیا چیریش اپنی زندگی کے واقعات پر نظر ڈالتے ہوئے مونچھوں پر تاؤ دیتا رہا ۔ اس نے بہت ھی پرانی باتیں سوچیں... پوپھٹنے تک کہنی کی ٹیک لگائے لیٹا

رہا۔ اس نے ایک بار پھر دو جنگوں کی بارود میں سانس لی، ایک بار پھر چھ بیٹوں کو پالا پوسا اور ان کو گھر مہیا کئے۔ پھر اس نے رنج کے ساتھ تین هیکٹر زمین کھوکر شراب پی ڈالی اور اس کو واپس پانے تک طرح طرح کی تکلیفیں گوارا کیں۔ ایک اور بھکمری کا سال برداشت کیا اور پھر اپنے گاؤں کے لئے انگور کی ہزاروں بیلیں لگائیں...

''بڈھا ہو گیا... کیسی بری بات ہے کہ بڈھا ہو گیا۔''

وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکا کہ وہ گاؤں کی سڑکوں پر بوڑھا ہوکر کیسے چلے گا، وہ جو اتنے زمانے تک جوان رہ چکا تھا اور دوسروں کے مذاق کیسے پھیلائے گا، وہ جس کے مذاق دوسرے مدتوں پھیلاتے رہے تھے، اور کیسے وہ جیبوں میں ان دو ہاتھوں کو دفن رکھے گا جو اتنے طویل عرصے تک گاؤں کے رازق رہے ہیں...

''جب لوگوں کو معلوم ہوگا تو وہ کیا کہیں گے؟ لیکن ٹھہرو، چیریش آپ کو انگلیوں پر نچائیگا۔ میں بتاؤنگا ہی نہیں کہ بڈھا ہو گیا ہوں اور کسی کو پتہ نہ چلے گا...''

دوسرے دن بادیا چیریش صبح تڑکے اٹھا اور اپنا پھاوڑا لیکر جنگل گیا۔ وہاں سے وہ ایک چھوٹا جنگلی چیری کا پیڑ لایا اور اپنی کھڑکیوں کے سامنے ایک جگہ چھانٹ کر اپنے اوپر صلیب کا نشان بنایا اور کھودنے لگا۔

جنگلی پیڑوں کو اس نے پوری زندگی گوارا نہیں کیا لیکن اب لگانا ہی پڑا۔ بادیا چیریش کا یہ شعار

تھا کہ اگر کوئی بڑا واقعہ ہو تو وہ پیڑ لگاتا تھا اور صرف وہی جانتا تھا کہ کب اور کس موقع پر کوئی پیڑ لگایا گیا ہے۔

اس کا سارا باغ واقعات سے بھرا ہوا تھا۔ مثلاً پرانا اخروٹ کا درخت اس صبح کو لگایا گیا تھا جب اس نے ایلینکا کو حاصل کیا تھا۔ اور کیا آپ کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ وہ اس وقت بڑی حسین تھی اور اس کے والدین چیریش کو اپنی دامادی میں نہیں قبول کرنا چاہتے تھے... اور تین آلوچے کے درخت تب لگائے تھے جب وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ محاذ جنگ پر گیا تھا۔ سب ملا کے چار درخت تھے لیکن ان میں سے ایک سوکھ گیا اور اسی لئے اس کا بیٹا واسیلی میدان جنگ سے نہیں لوٹا... اس نے چیری کے دو درخت اس وقت لگائے تھے جب اُس کا گھر جل گیا تھا اور ناشپاتی کا پیڑ اس نے پنچائتی فارم میں کام پانے پر نصب کیا تھا اور بہی کا اس وقت لگایا جب اس نے تمباکو نوشی چھوڑی۔

دو پہر کے کھانے کے بعد جنگلی چیری کا پیڑ گھر کے سامنے استادہ تھا اور بادیا چیریش اس طرح کام کاج میں مصروف تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ سڑکیں ویسی ہی تھیں اور اس کے مذاق بھی ویسے ہی دلچسپ تھے اور اس کی گدی تک کھسکی ہوئی عنابی ٹوپی بھی وہی تھی۔

پھر بھی کچھ ہوا تو ضرور تھا... اس دن سے جب بادیا چیریش نے یہ جنگلی چیری کا پیڑ لگایا تھا، اس نے اپنے آپ سے بڑی محبت اور اپنی دیکھ بھال کرنی

شروع کر دی تھی۔ اگر وہ کہیں بیٹھتا تو پیر رکھنے کے لئے کوئی چیز تلاش کر لیتا تا کہ ان کو آرام مل سکے۔ اب وہ بالٹی بھر کر پانی نہ لاتا، بلکہ کنوئیں کے پاس ہی اس کا کچھ پانی انڈیل دیتا، اور پھر اس نے ایلینکا کو کہہ سنکر مجبور کیا کہ وہ اس کے بستر پر کوئی نرم چیز بچھائے کیونکہ نرم بستر پر نیند میٹھی آتی ہے...

''میاں، ممکن ہے کہ کم بخت پیڑ جڑ ہی نہ پکڑے۔ بہرحال سب درخت جو لگائے جاتے ہیں جڑ تو نہیں پکڑ لیتے۔''

لیکن درخت نے جڑ پکڑلی۔ دوسری بہار میں ہی اس نے ایسے گھنے پتے نکالے کہ اس کو دیکھ کر بادیا چیریش اور چست و چالاک محسوس کرنے لگتا۔ اب اگر ایلینکا اس کو ساری شام برا بھلا کہتی تو وہ برداشت کر لیتا اور برا نہ مانتا۔ اس کے لئے وہ گھڑی کی مستقل کھٹ کھٹ کی طرح تھا۔ اب وہ انگور کی کسی ایسی بیل کے پاس سے لاپروائی سے گذر جاتا جسے ٹریکٹر نے کچل دیا تھا اور جب وہ دوسرے مسخروں کے درمیان ہوتا تو وہ ان کے مذاقوں میں اپنی ٹانگ نہ اڑاتا بلکہ سب کے ساتھ ان کے لطیفوں پر ھنستا، بس کبھی کبھی ایک آدھ لفظ، اگر ضرورت ہوتی تو کہدیتا۔

ایک بار اس نے خیال کیا جنگلی چیری کا پیڑ ناحق گھر کے سامنے کھڑا ہے اور فیصلہ کیا کہ اس کو خزاں میں وہاں سے ہٹا دیگا... اور پھر میز پر بیٹھتے ہی اس نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ ایلینکا

اس کی کیسے کیسے کھانوں سے خاطر کیا کرتی تھی:

''ارے، یاد ہے تم سانپ چھتریوں کا کیسا توکانا پکایا کرتی تھیں۔ اس کو پکانا بھول تو نہیں گئیں؟''

جب توکانا تیار ہو گیا تو بادیا چیریش نے کہا کہ اس کو وہ پلیٹ دی جائے جو پہلے دی جاتی تھی جس پر دو مرغے بنے تھے اور پھر میز پر وہ اپنی پرانی جگہ دروازے کی طرف سے پشت کرکے بیٹھ گیا... سب کچھ مزے میں گزر رہا تھا۔ بادیا چیریش کو جنگلی چیری کا پیڑ ہٹانے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ کافی وقت پڑا تھا۔ اس نے اب گھریلو کاموں کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ جو ہلکے پھلکے کام تھے وہ دل ہی دل میں ایلینکا کے سپرد کئے گئے اور جو ذرا سخت تھے ان کو آنےوالے سال کےلئے ملتوی کر دیا گیا۔ جو کام بہت ہی بھاری تھے ان کو بالکل دماغ سے نکال دیا کیونکہ ویسے تو ہر کام کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں...

ایک بار خزاں میں بادیا چیریش کوآپریٹیو کی دوکان سے جوتوں کا نیا جوڑا لایا، اس پر ایلینکا ناراض ہوئی:

''تمھارے پاس پہننے کو کچھ نہیں ہے؟''

گذرگاہ میں جوتوں سے بھرا پورا صندوق تھا۔ لیکن اگر بادیا چیریش نے ایک اور جوڑا خریدنے کا فیصلہ کیا تو اس کی وجہ وہ بخوبی جانتا تھا...

''او ایلینکا، جوتوں کا نیا جوڑا آدمی کو بشاش بناتا ہے، بھوک بڑھاتا...''

''جیسے بھوک تمہاری کم ہے !..''

''یاد کرو ایلینکا، میں تمہیں بتاؤں۔ بھوک تب کم لگتی ہے جب کھانے کو کچھ نہیں ہوتا اور ویسے خدا کا شکر ہے...''

دو دن بادیا چیریش نئے جوتے پہن کر گاؤں میں گھومتا رہا۔ پھر اس نے سوچا ''بھلا اس خوبصورتی کو برباد کرنے سے کیا فائدہ؟ آؤ، رشتے داروں کے یہاں چلوں، وہ میری خریداری تو دیکھیں...''

دو ہفتے وہ گاؤں سے غیرحاضر رہا کیونکہ پورے سوروکسکایا استیپ میں اس کے رشتے دار پھیلے ہوئے تھے۔ وہ وہاں سے بہت بشاش لوٹا اور پہلی شام کو ہی اس نے یہ دیکھ کر کہ اس کی بڑھیا اسٹوو کے اوپر لیٹی ہے کہا:

''ارے، ایلینکا، چھوڑ اس اسٹوو کو، بستر زیادہ نرم ہوتا ہے...''

ایلینکا ہنس پڑی لیکن لیٹی اسٹوو کے اوپر ہی۔

''ارے، ایلینکا مرجائے گی، اس دنیا میں اچھی چیزوں سے لطف اٹھائے بغیر مرجائے گی...''

اس نے دکھانے کو ٹھنڈی آہ بھری، لیکن وہ یہ دیکھ کر خوش تھا کہ ایلینکا ہنس رہی تھی۔ غالباً اس کو کچھ یاد آگیا تھا...

جنگلی چیری کا پیڑ جاڑے کے سارے موسم میں بادیا چیریش کی کھڑکی کے پاس سر بلند کئے کھڑا رہا۔ ہواؤں کے جھکڑ چلے لیکن اس کو نہ اکھاڑ پائے۔ پالے نے اس پر دھاوا بولا لیکن اس کو منجمد نہ کرسکا، برفانی طوفانوں نے اس کو گھیرا لیکن اس

کا گلا نہ گھونٹ سکے۔ جاڑوں میں چیریش کا دایاں
پیر ٹوٹ گیا۔ وہ اسٹوو کے سامنے بیٹھا اپنے پیر کو
دیکھ دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اب گاؤں بھر جان
جائے گا کہ وہ بوڑھا ہو گیا۔ ارے، خوش ہو لینے
دو ان کو۔ اس دوران میں وہ خوب آرام کر لیگا۔
جب بہار آئے گی تو سب انگور کے چمنوں میں جائیں گے۔
تب یہ دکھائی دیگا کہ کون کام کرسکتا ہے اور
کون نہیں...

بہار آئی اور بادیا چیریش پھر اپنے پیروں پر
تھا۔ وہ اس طرح کام کر رہا تھا کہ بیس بیس سال کے
جوان پچھڑ جاتے، ھانپنے لگتے اور وہ کبھی کبھی رومال
نکال کر اپنے چہرے سے چند قطرے پسینے کے صاف
کر لیتا۔ گاؤں سے انگور کے چمنوں تک اور وہاں
سے گاؤں تک کا راستہ خوشیوں سے ایسا بھرا رہتا جیسا
پہلے کبھی نہیں تھا۔ بادیا چیریش نے ان دو ھفتوں
میں جبکہ وہ سب انگوروں کو باڑوں سے باندھ رہے
تھے اتنے مذاق سوچ لئے تھے کہ دوسرا کوئی زندگی
بھر میں سوچ پاتا۔ گاؤں والے اس کو گھیرے رہتے،
ھنستے ھنستے بےحال ھو جاتے، اندر سانس نہ سماتی
لیکن بادیا چیریش ان کو دم نہ لینے دیتا۔ ابھی ایک
مذاق لنگڑے واسیلیکی تک پہنچ بھی نہ پاتا جو
سب سے پیچھے چلتا تھا کہ دوسرا، اس سے زیادہ تیز
واسیلیکی کی طرف روانہ کر دیا جاتا۔

ایک بار جمعہ کا دن تھا، بادیا چیریش کام پر
سے گھر لوٹا تو بھوکا بھیڑیا ہو رہا تھا۔ وہ اس
پر بالکل آمادہ تھا کہ اگر کھانا تیار نہ ھوا تو بس

وہ ایلینکا کو کاٹ کھائیگا اور اگر تیار ھوا تو اس کی تعریف کریگا۔ وہ صحن میں داخل ھوا تو یہ دیکھ کر ستون کی طرح گڑکر رہ گیا کہ وہ کم بخت چیری کا پیڑ جس کو وہ جنگل سے لایا تھا پھول رہا ھے۔

''اچھا بیٹا، تو تم مجھے پھل دوگے، میں تمھیں دوسری جگہ لگاؤنگا۔''

میز سجی ھوئی تھی۔ بادیا چیریش نے ھاتھ دھوئے۔ اتنے میں اس نے کسی بالٹی کا کنڈا بجنے کی آواز سنی۔ ماریاوتسا کنوئیں کی طرف جارھی تھی۔ بادیا چیریش نے جلدی سے اپنی بالٹی سنبھالی۔

''ذرا جاکر گپ لڑاؤنگا... اس سے باتیں کرنے میں کتنا لطف آتا ھے۔ ارے، کتنا لطف...'' اس نے سوچا۔

تیز تیز پھاٹک تک گیا اور پھر اچانک ٹھٹھک گیا۔ وہ مسکرایا، آگے بڑھنا چاھتا تھا لیکن نہ جاسکا۔

''ارے، ابھی ابھی تو میرے دو پیر تھے اور اب نہیں ھیں۔ غالباً ایلینکا نے ان کو گھر میں چھپا دیا تاکہ میں کہیں لگاوٹ کرنے نہ جا سکوں...''

اس نے جھک کر پیروں کو ٹٹولنا اور یہ دیکھنا چاھا کہ ان کو آخر ھوا کیا ھے لیکن اس کے بڑے بھدے ھاتھ دونوں طرف ٹنگے ھی رھے جیسے وہ بھی جاتے رھے تھے... اس کا دل زوروں سے دھڑک رھا تھا اور اس کے کانوں میں اس کے دھک دھک کی آواز گونج رھی تھی۔ بادیا چیریش زمین پر گر گیا۔ بہت دور سے اس نے ماریاوتسا کی ھلکی چیخ سنی:

''بادیا چیریش!''

بادیا چیریش مسکرایا ''بہرحال میں نے پورے گاؤں کو چرکا دیا، مذاق چل گیا۔ میں مدتوں ہوئے بوڑھا ہو گیا اور کسی کو پتہ نہ چلا...،، یہ اس کا آخری خیال تھا۔ مذاقوں کا فوارہ بند ہو گیا، سر ڈھلک گیا، اس کی بڑی عنابی ٹوپی قریب ہی پڑی تھی۔ چاروں طرف باغ سرسرا رہا تھا، چیری، آلوچے، ناشپاتی کے درخت سرگوشیاں کر رہے تھے، چھوٹا جنگلی چیری کا پیڑ اپنے دو پھولوں سمیت سرگوشیاں کر رہا تھا...

بہار میں اتوار کے صاف دن اس کو سپرد خاک کیا گیا۔ سارا گاؤں جنازے کے ساتھ تھا، سب رو رہے تھے کہ اب کوئی بادیا چیریش جیسا نہیں رہا، جوان اور طاقتور چیریش نہیں رہا۔ سب رو رہے تھے صرف بادیا چیریش کے چہرے پر مسکراہٹ جمی تھی جو اس کے آخری خیال کا نتیجہ تھی۔ اس کی آنکھیں مچی سی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی چلا کر اپنے گاؤں والوں سے کہنے والا ہے:

''ارے، روؤ مت! ارے، میں تو بوڑھا ہو چکا تھا۔ میرے لئے مرنا ہی ٹھیک تھا اور اگر میں نے چلتے چلتے ایک اور چٹکلا چھوڑ دیا تو کیا ہوا... میں تو مسخرہ پیدا ہی ہوا تھا...،،

واسیلی شو کشین

لاجواب ایکٹر، اعلی درجے کے فلم ڈائرکٹر اور ممتاز مصنف واسیلی شو کشین (۱۹۷۴ء — ۱۹۲۹ء) نے مختلف شعبوں میں اتنی تیزی سے ترقی شروع کی کہ ان کی اندرونی گہرائیوں نے نہ جانے کتنی درخشاں کامیابیوں کی حدیں پار کر لیں - یہ کہنا مشکل ھے کہ شو کشین کی شہرت کا بڑی حد تک کس بات نے تعین کیا ھے — ان کی کہانیوں نے یا ان کے پیش کردہ فلم ''ایسا نوجوان بھی ھے،، یا ان کے ناول ''لیوباوین لوگ،، یا ان کے مکالمہ فلم ''جھیل،، نے جسمیں انھوں نے ھیرو کا رول لاجواب طور پر ادا کیا ھے... بہرحال قصہ گو شو کشین کا جوھر مسلمہ ھے۔ وہ عوامی کرداروں سے، زندگی کے سارے ممکن واقعات و حالات سے بخوبی واقف ھیں - رسالہ ''ھمارا ھم‌عصر،، نے ان کے بارے میں لکھا ''شو کشین — عوامی ادیب ھیں ان الفاظ کے پرانے معنی کے لحاظ سے - ،،

گاؤں والے

''... ھاں، ساں، پرانی باتیں یاد کرنے، ماسکو اور ساری چیزیں دیکھنے کے لئے ھمارے یہاں آجاؤ نا؟ سفر خرچ کے لئے پیسے بھیج دونگا۔ اچھا تو یہ ھوگا کہ ھوائی جہاز سے آؤ۔ یہ سستا رھےگا۔ تار فوراً دے دینا تاکہ مجھے پتہ ھو جائے کہ کب تم کو لینے آنا ھے۔ بڑی بات تو یہ ھے کہ ڈرنا نہیں۔''

نانی مالانیا نے یہ پڑھکر اپنے خشک ھونٹ سکوڑے اور سوچنے لگی۔

''ارے، پاویل نے بلاوا بھیجا ھے''، اس نے شورکا سے کہا اور اس کو اپنی عینک کے اوپر سے دیکھنے لگی۔ شورکا اسکا نواسہ ھے۔ اس کی ماں کی شادی‌شدہ زندگی کامیاب نہیں رھی اور بڑھیا نے اصرار کرکے فی‌الحال اس کی نگرانی اپنے ذمے لےلی۔ وہ نواسے سے پیار ضرور کرتی تھی لیکن اس کی دیکھ‌بھال میں سخت بھی تھی۔

شورکا میز پر بیٹھا اسکول کا کام کر رھا تھا۔

نانی کی بات سن کر اس نے شانے جھٹکے جیسے کہہ رہا ہو — بلاتے ہیں، تو چلی جاؤ۔

''تمھاری بڑی چھٹیاں کب ہونگی؟،، نانی نے ذرا درشتی سے پوچھا۔

شورکا نے کان کھڑے کئے۔

''کونسی؟ جاڑے کی؟،،

''اور کونسی؟ کیا گرمیوں کی؟،،

''یکم جنوری سے۔ کیوں؟،،

بڑھیا نے پھر ہونٹ سکوڑے اور سوچنے لگی۔ اور شورکا کا دل پراشتیاق خوشی سے سکڑنے سا لگا۔

''کیوں؟،، اس نے پھر پوچھا۔

''کچھ نہیں، پڑھ، اپنا کام کر،، بڑھیا نے خط پیش بند کی جیب میں چھپا لیا اور بنگلے سے باھر چلی گئی۔

شورکا دوڑ کر کھڑکی پر پہنچا، یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔

نانی مالانیا کی مڈبھیڑ دروازے ھی پر پڑوسن سے ہوگئی اور وہ لگی زور زور سے اس کو بتانے۔

''پاویل نے ماسکو آنے کے لئے مدعو کیا ھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، عقل نہیں کام کرتی۔ کہتا ھے ''آجاؤ، ماں۔ میں تم کو بہت یاد کرتا ہوں۔،،

پڑوسن نے جواب میں کچھ کہا جو شورکا نہ سن سکا لیکن اس کی نانی پھر زور سے بولی:

''یہ ممکن ھے، اچھا، میں نے تو ابھی پاویل

کے بچوں کو بھی نہیں دیکھا ہے ۔ بس فوٹو میں دیکھا ہے ۔ میں تو بس سفر سے ڈرتی ہوں ۔،،

ان کے قریب دو اور عورتیں ٹھٹھک گئیں، پھر ایک اور آئی اور پھر ایک اور... اب جلد ہی نانی مالانیا کے گرد پوری بھیڑ لگ گئی اور وہ بار بار شروع سے بتانے لگی:

''پاویل اپنے یہاں ماسکو بلا رہا ہے ۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟،،

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب اس کو جانے ہی کی رائے دے رہے ہیں ۔

شورکا جیبوں میں ہاتھ ڈالکر بنگلے میں ٹہلنے لگا ۔ وہ بھی اپنی نانی کی طرح کسی خوابیدہ خیال میں ڈوب گیا ۔ وہ یوں بھی اپنی نانی سے بہت ملتاجلتا تھا ۔ ویسے ہی سوکھا سہما، وہی رخساروں کی اٹھی ہوئی ہڈیاں اور چھوٹی ذیفہم آنکھیں ۔ لیکن عادت و اطوار میں وہ بالکل یکساں نہ تھے ۔ نانی بڑی مستعد، قوت‌ور، بھاری آوازوالی اور بڑی کھوجی تھی ۔ شورکا بھی کھوجی تھا لیکن وہ اتنا شرمیلا تھا کہ بیوقوف لگتا تھا ۔ سیدھا سادہ ہونے کے ساتھ وہ تنکمزاج بھی تھا ۔

اس شام کو ماسکو بھیجنے کے لئے ایک تار لکھا گیا ۔ نانی بولتی گئی اور شورکا نے لکھ دیا ۔

''پیارے بیٹے پاشا، اگر تم چاہتے ہو کہ میں آجاؤں تو میں ضرور آؤنگی، اگرچہ بڑھاپے کی وجہ سے...،،

''خوب!،، شورکا بولا ''اس طرح کا تار کون لکھتا ہے؟،،

''اور تیرے خیال میں کیسا ہونا چاہئے؟،،

''آئیں گے، بس۔ یا پھر اس طرح: نوروز کے بعد آئیں گے، اور نیچے ''ماں،، لکھ دیا جائے۔ کافی ہے۔ ،،

نانی ناراض ہو گئی۔

''شورکا، چھٹے درجے میں پڑھتا ہے اور تو کچھ نہیں جانتا۔ ارے، کچھ تو عقل آتی!،،

شورکا بھی ناراض ہو گیا۔

''اچھا،، اس نے کہا ''یہ سب لکھنے کے جانتی ہو کتنے پیسے پڑ جائیں گے؟،،

نانی کے ہونٹ سکڑ گئے اور وہ سوچنے لگی۔

''اچھا، تو اس طرح لکھ دے: بیٹا، میں نے یہاں کچھ لوگوں سے صلاح لی...،،

شورکا نے قلم رکھ دیا۔

''میں اس طرح نہیں لکھ سکتا۔ کس کو اسکی پڑی ہے کہ تم نے یہاں کسی سے صلاح کی؟ ڈاک خانے میں سب ہم پر ہنسینگے۔ ،،

''لکھ، جیسا تجھ سے کہا جاتا ہے!،، نانی نے حکم لگایا ''کیا میں بیٹے کے لئے پیسے کی کنجوسی کرونگی؟،،

شورکا نے قلم اٹھایا اور عنایت فرمائی کے انداز میں تیوری چڑھا کر چپ چاپ کاغذ پر جھک گیا۔

''پیارے بیٹے پاشا، میں نے یہاں پڑوسیوں سے بات چیت کی اور سب نے یہی رائے دی کہ میں جاؤں۔ یہ سچ ہے کہ میں بوڑھی ہوں اور ذرا ڈرتی ہوں۔،،

''ڈاک خانے میں تو بہرحال پھر سے لکھا جائیگا،، شورکا بیچ میں بول اٹھا۔
''ذرا کر کے تو دیکھیں!،،
''تمھیں پتہ بھی نہ چلے گا۔،،
''اچھا، آگے لکھ: میں ذرا ڈرتی ہوں لیکن کوئی بات نہیں۔ نوروز کے بعد آؤنگی۔ وقفہ۔ شورکا کے ساتھ۔ اب وہ بڑا ہو گیا ہے۔ کوئی بات نہیں فرماں بردار لڑکا ہے...،،
شورکا نے یہ نہیں لکھا کہ وہ بڑا ہو گیا ہے اور فرماں بردار ہے۔
''اس کے ساتھ ہونے سے مجھے ڈر نہیں لگے گا۔ اچھا، اب خداحافظ۔ میں خود تمھیں بہت یاد کرتی ہوں۔ تمھارے بچوں کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہوں۔ وقفہ۔ ماں۔،،
''آؤ اب گن لیں،، شورکا نے طنزآمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور چپکے چپکے گننے لگا ''ایک، دو، تین، چار...،،
نانی اس کے پیچھے کھڑی انتظار کر رہی تھی۔
''اٹھاون، انسٹھ، ساٹھ! تو یہ رہا۔ اب ساٹھ کو تین سے ضرب دیں۔ ہے نا؟ تقریباً دو روبل ہوئے!،، شورکا نے زوروں میں اعلان کیا۔
نانی نے تار لیکر اپنی جیب میں ڈال لیا۔
''میں خود ڈاک خانے جاؤنگی۔ تو نے یہاں بہت حساب لگا دیا۔ بڑا پڑھا لکھا ہے۔،،
''اچھا، ضرور۔ اتنا ہی ہوگا۔ ممکن ہے کہ کہیں ایک آدھ کوپک کی غلطی ہوئی ہو۔،،

... گیارہ بجے کے قریب پڑوسی یگور لیزونوف آگیا جو اسکول میں سپلائی منیجر تھا کیونکہ نانی اس کے یہاں یہ پیغام چھوڑ آئی تھی کہ وہ کام کے بعد اس کے پاس آجائے۔ یگور اپنے زمانے میں کافی گھوم پھر چکا تھا، ہوائی جہاز پر اڑ چکا تھا۔

یگور نے اپنا اوورکوٹ اتار دیا اور پھر ٹوپی بھی۔ اس نے اپنے پسینے سے تر کھچڑی بال کھردرے ہاتھ سے سہلائے اور میز کے پاس بیٹھ گیا۔ بیٹھک میں سوکھی گھاس اور گھوڑے کے ساز کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

''تو ہوائی جہاز سے جانا چاہتی ہو؟،،

نانی نیچے تہہ‌خانے میں گئی اور شہد کی بیئر کا ایک ادھا لے آئی۔

''ہوائی جہاز سے، یگور، مجھے سب ٹھیک ٹھیک بتاؤ، کیسے اور کیا۔،،

''اسمیں بتانا کیا ہے؟،، بڑھیا اس کا گلاس بھر رہی تھی، وہ اس کی طرف حریصانہ نہیں بلکہ ذرا جھجک کر دیکھ رہا تھا۔ ''ایروفلوٹ تک جاؤ، وہاں ''بی‌ایسک تومسک،، ریلوےلائن سے نوواسیبیرسک تک جانا ہوگا اور پھر وہاں پوچھ لینا کہ ہوائی‌جہاز کا ٹکٹ گھر کہاں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سیدھی ہوائی اڈے چلی جاؤ...،،

''ارے، ٹھہرنا! ممکن ہے، ممکن ہے۔ یہ بتاؤ کہ کیا کرنا چاہئے۔ یہ نہیں کہ کیا ممکن ہے۔ اور اتنی تیزی سے نہیں۔ بس بوچھار کر دی۔،، بڑھیا نے یگور کے سامنے بیئر رکھدی اور اس کو گھور کر دیکھنے لگی۔

یگور نے گلاس کو انگلیوں سے چھوا۔ پھر رک کر بولا:

''اچھا، تو نوواسیبیرسک تک جاؤ اور وہاں پوچھ لو کہ ہوائی اڈے کیسے جانا ہوگا۔ شورکا، یاد رکھنا۔،،

''شورکا، لکھ لے،، نانی نے حکم دیا۔

شورکا نے اپنی کاپی سے ایک سادہ ورق پھاڑا اور لکھنے لگا۔

''تولماچیوا تک پہنچنے کے بعد پھر پوچھنا کہ ماسکو جانے کے لئے ٹکٹ کہاں ملتے ہیں۔ ٹکٹ لیکر ''تو-۱۰۴،، پر بیٹھ جانا اور پانچ گھنٹے بعد ماسکو میں ہوگے، ہمارے وطن کی راجدھانی میں۔،،

بڑھیا اب سوکھی چھوٹی سی مٹھی پر سر ٹیکے یگور کی بات غمگین انداز میں سنتی رہی۔ یگور جتنا زیادہ بتاتا جاتا اتنا ہی زیادہ سفر اس کے لئے آسان ہوتا جاتا لیکن بڑھیا کے چہرے پر اتنی ہی پریشانی پھیلتی جاتی۔

''سویردلوفسک میں البتہ تمھیں رکنا پڑیگا...،،

''کیوں؟،،

''رکنا پڑتا ہے۔ کوئی پوچھتا نہیں۔ بس اتار دیتے ہیں،، اب یگور نے فیصلہ کیا کہ کچھ پینا چاہئے ''اچھا، تو آرام سے سفر کے لئے؟،،

''لو۔ سویردلوفسک میں ہمیں ان سے کہنا پڑیگا کہ وہ ہمیں اتار دیں یا وہ سب کو اتار دیتے ہیں؟،،

یگور نے خوب اچھا گھونٹ لیکر، مزے میں چٹخارہ لیا، اپنی مونچھیں سہلائیں اور بولا:

''سب کو۔ خوب ہے یہ بیئر تمھاری مالانیا واسیلیونا۔ کیسے بناتی ہو اسکو؟ میری عورت کو بھی بتا دو...''

بڑھیا نے ایک اور گلاس اس کے لئے انڈیلا۔

''جب کنجوسی نہ کروگے تو بیئر اچھی ہوگی۔''

''یہ کیسے؟'' یگور نہیں سمجھا۔

''شکر زیادہ ڈالو۔ لوگ سستی چیز کی طرف جھکتے ہیں ہے نا؟ خمیر میں شکر زیادہ ڈالو اور لاجواب بیئر ہوگی۔ اور تمباکو سے اس کو تیز کرنا کیسی شرم کی بات ہے۔''

''ہاں'' یگور نے سوچتے ہوئے کہا۔ پھر گلاس اٹھایا، بڑھیا اور شورکا کی طرف دیکھ کر پی گیا اور پھر کہا ''ہاں، تو یہ رہا۔ جب نوواسیبیرسک پہنچنا تو کہیں غلطی نہ کر بیٹھنا۔''

''کیا؟''

''ہاں... سب کچھ ممکن ہے'' یگور نے اپنی تمباکو کی تھیلی نکالکر سگرٹ بنائی اور کش لیتے ہوئے دھوئیں کا ایک زوردار بادل اپنی مونچھوں کے نیچے سے چھوڑا۔ ''بڑی بات یہ ہے کہ جب تولماچیوا پہنچنا تو ٹکٹ گھر میں گڑبڑ نہ کرنا، نہیں تو ولادیواستوک بھی پہنچ سکتے ہو۔''

بڑھیا گھبرا گئی اور یگور کا گلاس تیسری بار بھر دیا۔

یگور اسکو فوراً پی گیا، ہونٹوں سے چٹخارا لیتے ہوئے اظہار خیال کرنے لگا:

''ایسا ہوتا ہے کہ آدمی نے آکر ٹکٹ گھر پر کہا 'ٹکٹ دے دو، اور کہاں کا ٹکٹ دے دو یہ نہیں کہا۔ تب وہ بالکل دوسری طرف اڑ جاتا ہے۔ تو اس کو دیکھنا ہے۔ ''

بڑھیا نے یگور کو چوتھا گلاس دے دیا اور وہ بالکل نرم پڑ گیا۔ اب وہ بڑے مزے میں باتیں کرنے لگا۔

''ہوائی جہاز پر اڑنے کےلئے بڑی ہمت کی ضرورت ہے۔ ادھر ہوائی‌جہاز ذرا اوپر اٹھا کہ فوراً مٹھائی دی گئی۔ ''

''مٹھائی؟''

''اور کیا۔ مطلب یہ کہ بھول جاؤ، توجہ نہ کرو... بہرحال، یہ سب سے خطرے کا لمحہ ہوتا ہے۔ یا مان لو تم سے یہ کہا جاتا ہے ''پیٹی باندھ لو، 'کیوں؟، ''یہی قاعدہ ہے، اوہ! قاعدہ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کچھ گڑبڑ ہو جائے۔ لیکن وہ اس کو قاعدہ کہتے ہیں۔ ''

''توبہ، توبہ!'' بڑھیا نے کہا ''اگر ایسا ہے تو اسمیں اڑاھی کیوں جائے...''

''اچھا، اگر بھیڑیوں کا ڈر ہے تو جنگل میں کیوں جاؤ'' یگور نے بیئر کے ادھے کی طرف دیکھا ''یوں تو جیٹ ہوائی جہاز بہت معتبر ہوتے ہیں۔ پراپلروالے تو کسی وقت ٹوٹ سکتے ہیں تو پھر... اکثر وہ جل بھی جاتے ہیں، ہوائی‌جہاز کے انجن۔ میں ایک بار ولادیواستوک سے اڑا...'' یگور آرام سے کرسی پر پھیل گیا، نئی سگرٹ جلائی، پھر بوتل

کی طرف دیکھا لیکن بڑھیا چپ‌چاپ بیٹھی رہی۔ ’’اڑ رہا تھا، ھاں، کھڑکی سے دیکھا تو آگ لگی تھی...،،

’’خدا بچائے، توبہ!،، بڑھیا نے کہا۔

شورکا کا تو یہ سنکر منھ کھل گیا۔

’’تو ظاھر ھے کہ میں چلایا۔ ایک ھواباز دوڑتا ھوا آیا۔ ویسے تو کچھ نہیں لیکن وہ مجھ پر ناراض ھوا اور خوب برا بھلا کہا ’کیوں سنسنی پیدا کر رھے ھو؟، وھاں جو آگ جل رھی ھے اس سے پریشان نہ ھو۔ بیٹھے رھو۔ اس ھوائی‌جہاز میں یہی ھوتا ھے۔ ،،

شورکا کو یہ بات ناقابل‌یقین معلوم ھوئی۔ وہ یہ سننا چاھتا تھا کہ ان شعلوں کو دور کرنے کےلئے ھواباز نے جہاز کی رفتار بڑھادی یا پھر مجبوراً اس کو زمین پر اتار دیا، نہ کہ وہ یگور پر ناراض ھوا۔ عجیب بات تھی۔

’’ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی،، یگور نے اپنی بات شورکا کو مخاطب کرکے جاری رکھی ’’مسافروں کو پیراشوٹ کیوں نہیں دیتے؟،،

شورکا نے شانے جھٹکے۔ اس کو یہ پتہ ھی نہیں تھا کہ مسافروں کو پیراشوٹ نہیں دئے جاتے۔ اگر واقعی ایسا تھا تو عجیب بات تھی۔

یگور نے پھول کے گملے میں دبا کر سگرٹ بجھا دی اور نیم قد اٹھکر بوتل سے اپنا گلاس بھر لیا۔

’’واہ، کیا بیئر ھے تمھاری، سالانیا!،،

’’زیادہ مت پیو، نشہ چڑھ جائیگا۔ ،،

''بیئر تو بس لاجواب ...،، یگور نے سر ہلا کر کہا اور گلاس چڑھا گیا۔

''اوہ، لیکن جیٹ ہوائی جہاز بھی خطرناک ہوتے ہیں۔ اگر کہیں ٹوٹ گیا تو بس سیدھا تیر کی طرح گرتا ہے۔ وہیں پر... پھر تو ہڈیاں بھی نہیں ملتیں۔ بس کپڑے وپڑے ملا کر آدمی ۳۰۰ گرام رہ جاتا ہے ،، یگور نے گھور کر بوتل کی طرف دیکھا۔ بڑھیا نے اسکو اٹھا لیا اور دوسرے کمرے میں لے گئی۔ یگور اس کے بعد ذرا دیر بیٹھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کچھ لڑکھڑا رہا تھا۔

''اور یوں تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں،، اس نے زور سے کہا ''بس ذرا کیبن سے دور دم کے قریب بیٹھنا اور اڑنا۔ اچھا، میں چلا...،،

وہ بھاری قدموں سے دروازے تک گیا، اپنا اوورکوٹ اور ٹوپی پہنی۔

''پاویل سیرگیئویچ کو میرا سلام دینا! ارے، مالانیا تمھاری بیئر تو بس لاجواب...،،

بڑھیا کو یہ بات اچھی نہیں لگی کہ یگور اتنی جلدی نشے میں ہو گیا اور تفصیل سے باتیں نہ کرسکا۔

''ارے، یگور تو کیسا کمزور ہو گیا ہے۔،،

''تھک گیا ہوں، اس وجہ سے،، یگور نے اپنے اوورکوٹ کے کالر سے ایک تنکا نکالتے ہوئے کہا ''میں نے اپنے کارکنوں سے کہا آؤ گرمیوں میں ہی سوکھی گھاس ڈھولی جائے۔ لیکن انھوں نے نہیں کیا۔ اب اس برفانی طوفان کے بعد سب راستے برف سے ڈھک گئے ہیں۔ آج سارے دن ہم ڈھوتے اور

کھینچتے رہے اور مشکل سے قریب والے ڈھیروں سے نبٹ سکے۔ ھاں اور تمھاری بیئر تو لاجواب ھے...،،
یگور نے سر ھلایا اور ھنسا۔
''اچھا، میں چلا۔ ھوائی جہاز سے جاؤ۔ کوئی ڈر کی بات نہیں۔ بس کیبن سے ذرا دور بیٹھنا۔ خدا حافظ۔،،
''خدا حافظ،، شورکا نے جواب دیا۔
یگور باھر نکل گیا۔ کس احتیاط کے ساتھ وہ اونچی برساتی سے اترا، پھاٹک تک گیا، اس کی چرچراھٹ ھوئی، یہ سب سنائی دے رہا تھا۔ پھر وہ آھستہ آھستہ گانے لگا:
''پھیلا تھا ھر طرف بحر ذخار...،،
اور پھر خاموش ھو گیا۔
بڑھیا نے سوچتے ھوئے غمگین انداز میں اندھیری کھڑکی کی طرف دیکھا۔ شورکا نے یگور کا بتایا ھوا جو کچھ لکھا تھا اس کو پھر پڑھ رہا تھا۔
''خوفناک، شورکا،، نانی نے کہا۔
''لوگ اڑتے ھیں...،،
''بہتر ھوگا ٹرین سے چلیں؟،،
''ٹرین سے، تو میری ساری چھٹیاں گاڑی پر ھی ختم ھو جائینگی۔،،
''خدایا، خدایا!،، بڑھیا نے آہ بھر کر کہا ''آؤ پاویل کو لکھیں۔ تار نہ دینگے۔،،
شورکا نے کاپی سے ایک اور ورق پھاڑ لیا۔ اس نے پوچھا:
''اچھا تو اڑینگے نہیں؟،،

''کہاں اڑینگے، میرے خدا کیا آفت ہے۔ بعد میں ۳۰۰ گرام جمع کرلیں گے...''
شورکا خیالوں میں ڈوب گیا۔
''لکھو، پیارے بیٹے پاشا، میں نے یہاں جانکار لوگوں سے مشورہ کیا...''
شورکا کاغذ پر جھک گیا۔
''... انھوں نے ہمیں ان ہوائی‌جہازوں پر اڑنے کے بارے میں بتایا ... اور ہم نے شورکا کے ساتھ ملکر یہ فیصلہ کیا: گرمیوں میں ٹرین سے آئیں گے۔ یہ اس وقت بھی ممکن ہے لیکن شورکا کی چھٹیاں تو اس کے لئے کم ہیں...''
شورکا ایک آدھ سکنڈ کے لئے ٹھٹھکا اور پھر لکھنے لگا۔
''اور اب ماموں پاویل، میں خود اپنی طرف سے آپ کو لکھ رہا ہوں۔ نانی کو چچا یگور لیزونوف، ہمارے سپلائی منیجر نے، اگر آپ کو یاد ہوں ڈرا دیا ہے۔ مثلاً انھوں نے یہ واقعہ بیان کر دیا کہ انھوں نے ہوائی‌جہاز کی کھڑکی سے دیکھا کہ اس کا انجن جل رہا ہے۔ انھوں نے جب ہواباز سے کہا تو وہ ان پر ناراض ہوا۔ میرے خیال میں اگر انجن جلتا ہوتا تو ہواباز نے شعلوں کو رفتار بڑھا کر بجھانے کی کوشش کی ہوتی جیسا کہ دستور ہے۔ میرے خیال میں انھوں نے گیس خارج ہونےوالے پائپ سے شعلہ نکلتے دیکھا اور چیخنے لگے۔ مہربانی کرکے آپ نانی کو لکھئے کہ یہ کوئی ڈرنےوالی بات نہیں ہے۔ لیکن میں جو کچھ آپ کو لکھ رہا ہوں اس کے

بارے میں نہ لکھئے گا نہیں تو وہ گرمیوں میں بھی نہیں آئیں گی۔ یہاں ترکاریوں کی باڑی ، سور ، مرغیاں، بطخیں ھیں ۔ انکی دیکھبھال کی وجہ سے وہ کبھی نہ آئیں گی۔ ھم تو گاؤں والے ھیں نا۔ میں ماسکو دیکھنے کا بےحد خواھش مند ھوں۔ میں نے اسکول میں جغرافیہ اور تاریخ میں اس کی بابت ضرور پڑھا ھے لیکن آپ خود سمجھتے ھوں گے کہ یہ دوسری بات ھے۔ ھاں، چچا یگور نے یہ بھی کہا کہ ھوائی جہاز کے مسافروں کو پیراشوٹ نہیں دئے جاتے۔ میرے خیال میں یہ بھی بیکار کی بات ھے۔ لیکن نانی کو اس پر یقین ھے۔ ماموں ذرا ان کو سمجھائیے بجھائیے۔ وہ آپ سے بےتحاشا محبت کرتی ھیں۔ آپ ان سے کچھ اس طرح کہئے: ماں، یہ کیا بات ھوئی، آپکا بیٹا خود ھواباز ھے، سوویت یونین کا ھیرو۔ بہت بار انعام پا چکا ھے اور آپ منحوس مسافر ھوائی جہاز میں سفر کرنے سے ڈرتی ھیں! اور ایسے زمانے میں جب ھم صوتی حدود کو پار کر چکے ھیں۔ اس طرح لکھئے کہ وہ فوراً پرواز کریں۔ ان کو آپ پر بہت فخر ھے اور یہ بالکل بجا بھی ھے۔ مجھے خود بھی فخر ھے آپ پر۔ مجھے ماسکو دیکھنے کا بےحد شوق ھے۔ اچھا تو اب خدا حافظ، آداب۔ الکساندر۔ ،،

اس دوران نانی اس سے لکھنے کو کہہ رہی تھی:

”... ھم کوئی خزاں کے قریب آئیں گے۔ تب سانپ چھتریاں ھونگی، نمکین گوشت بھی تیار کیا جا سکتا ھے اور جنگلی بیریوں کا مربہ بنایا جاسکتا ھے۔

ماسکو میں تو سب دوکانوں پر ملتا ہے۔ وہ ایسی چیزیں اس طرح نہیں بنا سکتے جیسے میں گھر پر تیار کرتی ہوں۔ تو یہ بات ہے بیٹا۔ اپنی بیوی اور بچوں کو میرا اور شورکا کا پیار۔ اچھا خدا حافظ۔،،

''لکھ دیا؟،،

''لکھ دیا،، شورکا نے جواب دیا۔

نانی نے ورق لیکر اس کو لفافے میں بند کیا اور خود پتہ لکھا ''ماسکو ـــ لیننسکی پروسپکٹ، مکان نمبر ۷۸، فلیٹ نمبر ۱۵۶ ۔

هیرو سوویت یونین لیوباوین پاویل ایگناتیویچ کو ۔

اس کی ماں کی طرف سے۔ سائبیریا سے۔ ،،

خطوں پر پتہ همیشه وہ خود لکھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح خط ضرور پہنچ جائیگا۔

''یہ رہا، شورکا! پریشان نہ ہو، ہم گرمیوں میں جائیں گے۔ ،،

''میں پریشان نہیں ہوں۔ لیکن تم تھوڑا تھوڑا کرکے جانے کا سامان کرو ۔ ممکن ہے کہ تم ہوائی جہاز سے ہی جانے کا ارادہ کرلو ۔ ،،

نانی نے کچھ کہے بغیر نواسے کو دیکھا۔

رات کو شورکا نے سنا کہ کیسے نانی اسٹوو پر لیٹی کروٹیں بدل رہی ہے، خاموشی سے آہیں بھر رہی ہے اور اپنے آپ کچھ بڑبڑا رہی ہے۔

شورکا کو بھی نیند نہیں آئی۔ وہ بھی پڑا سوچتا رہا۔ مستقبل قریب میں زندگی بہت سی غیرمعمولی باتوں کا وعدہ کر رہی تھی، ایسی جنکا اس نے خواب بھی نہ دیکھا ہو۔

''شورکا،، نانی نے پکارا۔
''ھاں؟،،
''غالباً پاویل کو کریملن میں جانے دیتے ہوں گے؟،،
''غالباً، تو کیا ھوا؟،،
''ارے، وھاں ایک بار جانے کو ملجائے... دیکھنے کے لئے۔ ،،
''وھاں تو اب سبکو جانے کی اجازت ھے۔ ،،
نانی تھوڑی دیر تک چپ رھی۔
''سب کو جانے دیتے ھیں؟،، نانی نے یقین نہ کرتے ہوئے کہا۔
''نکولائی واسیلیویچ نے ھمیں بتایا ھے۔ ،،
دونوں چند منٹ خاموش رھے۔
''نانی یوں تو تم بہت نڈر ھو اور اب ڈر گئیں،، شورکا نے خفگی سے کہا ''کس بات سے ڈر گئیں؟،،
''سو جا تو،، نانی نے حکم دیا ''بڑا بہادر بنتا ھے۔ پہلے ھی دم نکل جائیگا۔ ،،
''شرط بدلو۔ میں نہیں ڈرونگا؟،،
''سوجا۔ نہیں تو کل پھر اسکول نہ جاسکے گا۔،،
شورکا چپ ھو گیا۔

ولادیمیر دروزد

ولادیمیر دروزد (سال پیدائش ۱۹۳۹ء) انوکھی خوبیوں اور صلاحیتوں کے مصنف ہیں۔ ان کی کہانیوں کے پہلے ہی مجموعے ''مجھے نیلے ستاروں سے پیار ہے،، نے قارئین اور ناقدین کی توجہ اپنی طرف دلائی۔ یہ مجموعہ ۱۹۶۲ء میں شایع ہوا۔ نوجوان یوکرینی نثرنگار ولادیمیر دروزد کے جوہروں کے بارے میں بہت سی خوشگوار باتیں لکھی گئی ہیں اور انکی خصوصیات یعنی ہماری دھرتی کی ثروت مندی پر اظہار حیرت کرنے اور جرأت‌آمیز اور غیرمتوقع موضوعات ڈھونڈھ نکالنے کی صلاحیتوں کی طرف خاص طور سے اشارہ کیا گیا ہے۔ اپنی تخلیقات میں ولادیمیر دروزد اکثر داستانی موضوعات لیتے ہیں اور کہانیوں میں ایسے شیطانوں، جادوگرنیوں اور جل پریوں کے نمونے پیش کرتے ہیں جو یوکرینی لوک کہانیوں اور داستانوں میں روایتی مقام رکھتے ہیں۔ ولادیمیر دروزد حقیقت و داستان کو باہم شیروشکر کرکے تمثیلی شکل میں لوگوں کو ان باتوں کے لئے عظیم ذمے داریوں کا احساس دلاتے ہیں جو ہماری دنیا میں ہورہی ہیں۔

سورج

کبھی کبھی اسے خود بھی ایسا محسوس ہوتا کہ وہ بستی کی اس کنارے والی جھونپڑی میں اس وقت سے مقیم ہے جب بوڑھے دیوتا نے آسمان پر پہلی شمع جلائی تھی جسکو بعد میں ستارے کا نام دیا گیا۔

اور اب تو ان ستاروں کو خود شیطان بھی نہیں شمار کرسکتا تھا۔

ابتدا میں ہر رات کو کوئی نہ کوئی اسکے یہاں آتا تھا اور کھڑکی پر دستک دیتا تھا۔ بڑے سے منہ والا چہرہ کھڑکی کے شیشے سے لگاکر کہتا تھا:

"ارے، کل تجھے سورج کو اٹھانا ہے، تیری باری ..."

شیطان اپنے کونے میں دبکا چپ پڑا رہتا۔ پیغام بر یقین دھانی کےلئے پھر ایک بار فریم کو کھٹکھٹاتا۔ پھر مہمان کے پیروں کے نیچے گھاس کے چرمرانے کی آواز کم ہوتی جاتی۔

ایک وقت وہ آیا کہ اسکو پکارنا بند کر دیا گیا۔ شاید، وہ بھول گئے۔ کھڑکی تک آنے والی

پگڈنڈی پر گھاس پھوس اگ آیا اور گرمیوں کے ہر
موسم میں باہر دیوار کے قریب مٹی کے ڈھیر پر
افسنتین گھنی ہوتی رہی۔ جاڑے کی ہوائیں شیطان کی
رہائش گاہ کی چمنی کے پائپ کے اوپر تک برف کے ڈھیر
لگا دیتی تھیں جن سے شیطان بہت ناراض ہوتا تھا۔
اس زمانے میں بالکل سناٹا ہوجاتا۔ صرف چوہے سہمے
سہمے تہہ زمین سرسراتے۔ اور کبھی کبھی آدھی
رات کو چمنی کے اندر سے اڑ کر مقامی جادوگرنی
آجاتی — بوڑھی بدشکل عورت۔ شیطان اس سے محبت
نہیں کرتا تھا۔ جادوگرنی خوب شور کرتی، دوسروں
سے چھینے ہوئے سپاٹ پہاڑ سے الفاظ کی جھاڑ باندھ
دیتی، جھونپڑی میں دوڑتی پھرتی اور مکڑیوں کے جالے
نوچ کھسوٹ ڈالتی۔ اس چیخ پکار اور قہقہوں کے
درمیان موت کا تاریک خوف چھا جاتا — بڑھیا مرنے
سے ڈرتی تھی۔ بہرحال شیطان جادوگرنی کے ساتھ
تاش کھیلنے سے انکار نہ کرتا اور وقت محسوس کئے
بغیر گذر جاتا۔ وہ برف کی پریوں کو اشارہ کرتا۔ وہ
کھڑکی کے شیشے پر دھاوا بولتیں اور اپنی سفید
ہتھیلیوں میں چمکتے جگنو جیسی چنگاریاں لاتیں جن
سے جھونپڑی سرد اور نیلی جگمگاہٹ سے بھر جاتی۔
بوڑھی جادوگرنی تاش پھینٹ کر بےشرمی سے دھوکا
دینا چاہتی تاکہ کسی نہ کسی طرح میزبان سے جیت
جائے۔ مہمان کی اس مکاری سے شیطان خوش ہوتا
کیونکہ وہ تو پتوں کو آر پار دیکھتا تھا۔

اور سورج اسکے بغیر نکلتا رہا — نوخیز اور
گلابی۔

یہ سچ ہے کہ شیطان اسے ایسے ہی لمحات میں دیکھتا تھا جب اسکو نیند نہ آتی تھی۔ جب سے وہ اس جھونپڑی میں آکر مقیم ہوا تھا اسکو دھندلکا پسند تھا۔ صبح کے قریب سونے لیٹتا، جب آسمان پر سیٹیاں بجنے لگتیں یعنی ساری دنیا کے شیطان مشرق کی طرف اڑتے تاکہ سورج کو اٹھا کر بلند کریں۔ شام کو اسے جھینگر جگا دیتے۔ زبردستی آنکھیں کھولتا۔ لال پروں والی آخری چڑیاں جھونپڑی سے باھر جاتی ہوتیں، دیواریں دھندلی اور اداس ہوتیں، چولھے کا پیٹ پھولا نظر آتا۔ شیطان کھڑکی کی طرف دیکھتا۔ مغرب میں ابھی بھٹی جلتی ہوتی، لیکن کوئی بھی اس میں آگ دھونکنے والا نہ تھا۔ گرمی سرد پڑ چکی ہوتی اور بھوری راکھ کو ڈھانپ لیتی۔ لال چڑیاں آسمان میں بلند ہو جاتیں، ان کے پر گھل کر بے کنار نیلاھٹ میں گم ہو جاتے۔ جلد ہی نیلے دھندلکے میں ستاروں کے پھیکے چہرے جھلکنے لگتے اور کھیتوں سے بدیر واپس ہونے والی باربردار گاڑیاں شیطان کی رھائش سے کنائی کاٹ کر نکلتیں اور عورتیں کھسر پھسر کرتی ہوئی اپنے اوپر صلیب کا نشان بناتیں۔ سوکھے بید پر گوریاں ''ژیف! ژیف!،، کا شور کرتیں اور جھینگر بےشرمی سے رات کے گن گاتے۔

''بھاگ جاؤ!،، شیطان چلا کر گوریوں سے کہتا اور وہ سب ایک ساتھ ملکر شاخوں سے بستی کی طرف اڑجاتیں۔

''خاموش!،، وہ جھینگروں سے کہتا اور وہ سہم کر چپ ہو جاتے۔

تب سناٹا چھا جاتا اور شیطان خوب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شام کے دھندلکے کو دیکھتا۔ وہ کھیتوں سے ہلکا ہلکا سرمئی لہروں میں پھیلتا جاتا اور اسکا دل ایک میٹھا میٹھا، غم‌انگیز درد محسوس کرتا۔ دھندلکا جھونپڑی کو بھر دیتا، چولھا اور دیواریں اسمیں ڈوب جاتیں۔ شیطان اپنے آپ یکہ‌وتنہا رہ جاتا۔ پھر دروازہ چرچراتا اور نوجوان جادوگرنیاں ماروخا فرش پر ننگے پیر سرسراتی آتیں اور ہلال نو جیسی نوخیز سفید شمعیں لاتیں۔ شیطان پریشان ہوکر ہاتھ جھٹکتا اور جادوگرنیاں شمعوں کو بجھا کر غائب ہو جاتیں۔ نیند لمبی سفید قمیص میں ملبوس شیطان کی رہائش‌گاہ کے قریب چپکے سے آتی۔ اسکی جھونپڑی حسینۂ شب کے پھول کی طرح وا ہو جاتی۔ اب دیواریں سوکھے پیڑ سے نہ ڈھکی رہتیں اور چھت کے پار ستاروں کی روشنی آنے لگتی جو ابھی پھیکے اور ہلکے ہلکے چمک رہے تھے۔ وقت کے پر آہستگی سے حرکت کرتے اور اسکے بعد وہ بالکل رک کر جامد ہوجاتا۔

''زندہ سلامت ہوں...،، میٹھی آہ بھرتے ہوئے شیطان نے کہا اور خوشی کے دو آنسو اسکے بالدار گالوں پر بہتے ہوئے فرش پر گر گئے اور وہاں پر زمین سے دو خاردار پودے اگ کر مٹی کے ڈھیر پر چل دئے اور کھڑکی کے نیچے بالکل پہرے داروں کی طرح استادہ ہوگئے اور شیطان نے پھر کہا ''زندہ سلامت ہوں۔،،

یہ اسکی زندگی کے بہترین لمحات تھے — دن اور رات کی سرحد تھی یہ۔

اسکے بعد وہ سوکھے بید کے نیچے بیٹھ کر سیٹیاں بجانے لگا اور اتنی زور سے بجائیں سیٹیاں کہ دور بستی سے آنےوالے لڑکیوں کے گیت اور شور ڈوب گئے۔ ابھی ستاروں کے غنچے ذرا ذرا کھلنے لگے تھے اور شیطان کو ان کا دھندلاپن پسند تھا۔ بعد کو جب ستارے بھرپور چمکنے لگیں گے تو وہ انکی طرف آنکھ بھی نہ اٹھائے گا۔ چمگادڑ زمین تک جھک کر اڑنے لگے لیکن شیطان کی سیٹیاں سنکر وہ تیر کی طرح آسمان کی طرف اڑ گئے۔

شیطان بڑی خوشی اور آسودگی کے ساتھ مسکرایا۔

کوئی آدھی رات کے قریب شیطان قدم قدم بہ چلتا آٹا چکی تک پہنچا تاکہ اپنی تمباکو پیس سکے۔ اس نے نیند سے چلاکر کہا اور نیند نے اپنی ہتھیلی آٹا چکی کے مالک کی پیشانی پر رکھ دی۔ شیطان نے چکی کا پہیا گھما دیا۔ ڈولوں میں پانی کی کھلبلاہٹ سے مچھلیاں ڈر گئیں۔ آٹا چکی سے آٹے اور چوہوں کی بو آرہی تھی اور چکی کے پاٹ اپنے دانت پیس رہے تھے۔ شیطان نے اپنے دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اس پائپ کے نیچے لگا دیا جس سے آٹا نکلتا تھا اور ان کو لگائے رہا جب تک وہ چوٹی تک پسی ہوئی تمباکو سے نہ بھر گئے۔ پھر وہ چکی کے بند پر بیٹھ گیا اور اپنے بےایڑیوالے پیروں کو پانی میں لٹکا دیا۔ اس نے کچھ تمباکو راستے پر گرائی اور پھر چٹکی چٹکی لیکر اسکو سونگھنے اور بڑے مزے میں چھینکنے لگا۔

چاند، گول اور سفید، بالکل چکی کے پاٹ کی طرح ساکن زمین کے اوپر جھول رہا تھا۔ دریا کے کنارے قبرستان کی صلیبیں دھندلی پڑرہی تھیں۔ قبرستان سے کوئی گنہگار ہستی پھسلتی اور لڑکھڑاتی ہوئی پہاڑ کے اوپر ٹھیلا کھینچے لئے جا رہی تھی۔

''آخرکار سورج کی روشنی صرف لبھانےوالی لہر ہی تو ہے جسے تاریکی قطعی لے ڈوبتی ہے،، شیطان نے سوچا ''بھلا اس جلتے ہوئے توے کو آسمان میں اوپر اٹھاکر زندگی کو خطرے میں ڈالنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے اگر وہ چند گھنٹے بعد پھر لنڈھک کر نیچے آجاتا ہے؟ بھلا بتاؤ تو کیا مطلب ہوسکتا ہے ؟ اور وہ گاؤدی، پھر بھی دنیا کی ازسرنو تعمیر و تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ نہ تو زمین پر اور نہ آسمان پر دانائی کا ایک ذرہ بھی ڈھونڈھے ملیگا!،،

شیطانی تمباکو کی وجہ سے بوکھلا کر مچھلیاں دریا میں سطح پر آ گئی تھیں اور ٹھیک بدخو جنگ‌بازوں کی تلواروں کی طرح چمک رہی تھیں اور آئینے جیسے پانی میں ستاروں کے ہلکے عکس پر منہہ مار رہی تھیں۔

سبزی مائل کیکڑے تیزی کے ساتھ سفید ریت پر رینگ رہے تھے۔

کسی نے اسکو روز روشن میں جگا دیا۔ تیز روشنی اسکی آنکھوں میں جا پڑی اور وہ چوندھیا گیا۔

چوکھٹ پر ایک دبلا پتلا، مصیبت‌زدہ آدمی تنکوں کی ہیٹ ہاتھوں میں تھامے کھڑا تھا۔

''کیا چاہئے تجھے؟،، شیطان نے مشکل سے اپنے غصے کو روک کر بھاری آواز میں پوچھا۔

''شیطان صاحب آپ سے درخواست ھے کہ آپ ھمیں اپنے گھر میں جگہ دے دیں۔ ھم آگ کے مارے ھیں۔ سارا مزرعہ جل گیا۔ میں بیوی کے ساتھ ھوں اور بیوی حاملہ ھے، وہ جلد ھی ماں بننے والی ھے... زندہ درگور ھوں...،،

''میں کون ھوں تیرے لئے، سرائے کا مالک؟ لوگوں کے پاس جا، میں تجھے صلاح دونگا کہ شیطان کو نہ چھیڑ ورنہ جو کچھ رہ گیا ھے وہ بھی ہاتھ سے جاتا رھےگا۔،،

''اب تو میرے پاس کچھ ھے ھی نہیں، شیطان صاحب،، اس آدمی نے ملتجی انداز میں دروازے کی کنڈی پکڑے پکڑے کہا ''اور بیوی پر آپ قابو نہیں پا سکتے کیونکہ وہ پاکیزہ روح ھے۔،،

''جا، جا، کہاں سے آگیا،، شیطان نے ناراضگی سے کہا۔

اس گستاخی کےلئے آنے‌والے کو ذرا ڈرانا تھا لیکن شیطان پر نیند سوار تھی اور وہ دوسرے پہلو کروٹ لیکر فوراً سو گیا۔

اسے بادل کی گرج نے جگادیا۔ جھونپڑی کے اوپر بڑی کڑک تھی، سب کچھ تھرتھرا رہا تھا اور سنگین آسمان پر بھاری پتھر لنڈھک رھے تھے۔ ''یہ بوڑھا دیوتا پھر کڑکڑانے لگا،، شیطان نے سوچا ''غالباً

ہمارے بھائی نے پھر لنگڑی لگائی۔ شاید بے دم والوں کو بھگا رہا ہے اور ممکن ہے نشے میں بدمست ہو...''

کھڑکی کے پیچھے پانی دھاروں برس رہا تھا۔ بھورے شیشے کے پار سوکھے بید کے نیچے دو شکلیں بیٹھی تھیں۔ مرد ہیٹ لگائے ہوئے اور جوان عورت شال میں لپٹی ہوئی اور حاملہ۔ وہ درخت سے چمٹی ہوئی تھی اور اسکی ہتھیلیاں پیٹ پر تھیں۔ شیطان نے جلدی سے آنکھیں میچ لیں لیکن نکلے پیٹ پر ہاتھ رکھے ہوئے عورت سامنے سے نہ ہٹی۔ اس نے اپنا ہاتھ نیچے گرا دیا تو اسکی انگلیوں نے زمین کو بھی بالکل جوان عورت کے پیٹ کی طرح محسوس کیا اور زمین میں کچھ دھڑک رہا تھا، الٹ پلٹ رہا تھا اور پھر زور کرکے باھر روشنی میں آرہا تھا۔ ''اور زمین بھی حاملہ ہے،، شیطان نے سوچا ''یہ ہمیشہ حاملہ رہتی ہے، پھلتی رہتی ہے، پھل دیتی رہتی ہے اور شیطان اسکے لئے آسمان پر سورج کو لنڈھکاتا رہتا ہے، اپنے کو جلا لیتا ہے، جیسے سوکھی گھاس کا گٹھا ہو... لیکن یہ کیا بیوقوف ہے جو ایسی گرج چمک میں سوکھے بید کے نیچے کھڑا ہے؟ بوڑھا دیوتا کسی کو بھی نہیں چھوڑتا، ضرور چھاپہ مارتا ہے...'' اپنے آپ پر حیرت کرتے ہوئے شیطان نے کھڑکی کھول دی اور آسمان کی گرج اور بارش کے شور کے اوپر گلا پھاڑ کر چلایا:

''ارے، آدمی! تجھ کو کس نے گرج چمک میں سوکھے بید کے نیچے چھپنا بتایا ہے؟''

''پھر میں کہاں جاؤں،، آدمی نے افسردگی سے جواب دیا اور دوسری طرف مڑ گیا۔

''ارے... جھونپڑی میں آجاؤ،، منٹ بھر رک کر شیطان نے کہا، وہ جوان عورت کے پیٹ پر سے نظر نہیں ہٹا سکتا تھا۔ ''جب تک گرج چمک ہے بیٹھ جاؤ۔،،

آدمی نے اپنی چیزوں کا تھیلا اٹھایا اور عورت نے بید کے پیڑ کے نیچے سے لوہے کا برتن لیا اور وہ دونوں ڈیوڑھی میں داخل ہوگئے۔ جب وہ جھونپڑی میں آچکے تو آسمان ایک خوفناک گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ پھٹ گیا اور ایک آتشیں تیر بید کے درخت میں پیوست ہوگیا۔ مہمانوں نے اپنے اوپر صلیب کا نشان بنایا۔

''صلیب بنانے میں عجلت نہ کرو،، شیطان نے منہ بنا کر سردمہری سے کہا ''تم گرجے میں نہیں ہو۔،،

یکایک برتن عورت کے ہاتھ سے گر کر فرش سے ٹکرایا اور لنڈھک کر چولھے کے نیچے جا رہا۔ عورت نے اپنی کمر پکڑلی اور چوکھٹ پر بیٹھ گئی۔ تشنج نے اسکے خوبصورت، بالکل تصویر جیسے چہرے کو بگاڑ دیا تھا۔

''شروع ہوگیا!،، مرد چلایا اور عورت کو سنبھالنے لگا ''معاف کیجئے گا ہمیں، شیطان صاحب، لیکن شروع ہوگیا! کاتیرینا! کاتیرینا!..،،

اس نے تھیلے سے گدا نکال کر لیٹنے والے تختے پر بچھا دیا اور عورت کو اس پر لٹا دیا۔ پھر بے چینی سے جھونپڑی میں ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ عورت کراہ رہی تھی۔ ''یہ لوگ کتنے شور مچانے والے ہیں،،

شیطان کو افسوس ہونے لگا تھا کہ ان آگ کے ماروں پر اس نے کیوں ترس کھایا۔ اس نے حقارت سے کہا:

''مرد آدمی، اتنے بے چین کیوں ہو؟''

اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا:

''بچہ تو پیدا ہی ہونا ہے اور اب میں دایہ کہاں سے ڈھونڈھ کر لاؤں؟ پانی ہی گرم کر لیتا لیکن کیسے؟ سب تو بھیگا پڑا ہے، ایسی موسلادھار بارش ہے۔''

''ارے، ادھر اٹاری میں کہیں سوکھی گھاس پڑی تو تھی...''

''خدا تمھیں صحت عطا فرمائے، شیطان صاحب''، آدمی نے کہا اور جھونپڑی کے باہر جھپٹا۔

''ضرور عطا فرمائیگا''، شیطان ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرایا۔

مہمان نے اسٹوو کے اندر بارش کے پانی سے بھرا برتن رکھ دیا اور اسٹوو میں ایک مٹھی سوکھی گھاس کا گونجا دیا۔ جیب سے چقماق اور چیری کی لکڑی کا ٹکڑا نکالا اور چقماق کو پتھر پر مارا۔ چنگاریاں تو اڑیں لیکن نم لکڑی نے آگ کو پکڑنا نہ چاہا۔ ''ارے، یہ لوگ کیسے لاچار ہیں''، شیطان نے سوچا اور ڈیوڑھی میں چلایا:

''ماروخا، آگ چاہئے!''

اور اسی لمحے سوکھی گھاس جل اٹھی اور اسٹوو کے جبڑے میں آگ کی لہریں اچھلنے لگیں۔ عورت کراہتی رہی۔ ''جس طرح چاہیں کریں''، شیطان اپنے کونے میں گڑمڑا گیا جیسے وہ سو رہا ہو ''جس طرح چاہیں کریں۔ مجھے انکی کیا پڑی ہے؟''

پتہ نہیں کتنا وقت گذر گیا۔ ممکن ہے کہ شیطان سچ مچ سو گیا ہو۔ اچانک سوتے میں اسکو عجیب سا احساس ہوا، تشویش ناک اور اذیت دہ۔ اسکو لگا جیسے کسی نے جھونپڑی اور ڈیوڑھی کے دروازے کھول دئے۔ فضائی افعی فرش پر اتر آئے ھیں اور اسکے کونے میں پہنچ کر اسکے جسم کو برما رہے ھیں۔ سانپ بہت سے ہو گئے اور درد ھونے لگا۔ ابتدا میں تو صرف وحشت ھوئی لیکن بعد میں درد گہرا اور تیز ہوگیا، گویا شیطان کو اینٹھ کر رسی بنا دیا گیا ہو۔ شیطان نے آنکھیں کھول دیں۔ اب اندھیرا ہو چکا تھا اور اسٹوو کے نیچے انتھک جھینگر جھنک رہے تھے۔ اچانک ایسی چیخ گونجی جو شیطان نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی اور رات کی ساری آوازیں اس میں ڈوب گئیں۔ جہنم کی تہہ میں گناہ گار بھی اس طرح نہ چیخ رہے ہوں گے۔ اس چیخ سے شیطان تھرا گیا اور پھر سانپ اسکے جسم کو برمانے لگے۔ وہ اپنے چنگلوں سے مٹی کھرچنے اور فرش پر لوٹنے لگا۔

''ماروخا، شمعیں جلاؤ...،، اس نے مشکل سے کہا۔

اور کھڑکی کی سل، اسٹوو اور الماری پر چراغ جھلملانے لگے۔ شیطان نے عورت کا زرد اور پسینہ آلود چہرہ دیکھا۔ اس نے اپنے ھونٹ کاٹ لئے تھے اور اسکی آنکھیں نکلی پڑی تھیں۔ اسکی اینٹھی ھوئی انگلیاں بالوں میں پھنسی تھیں۔ مرد ھیٹ ھاتھ میں لئے اسکو سل رہا تھا اور شکایت آمیز انداز میں صاحب خانہ کو دیکھ رہا تھا۔

''شیطان صاحب، میں اسکے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا - بھلا میں کبھی دایہ رہا ہوں ؟ اور اسکے لئے تو زچگی کا پہلا اتفاق ھے...''

اسی منٹ عورت کی انگلیاں جسم پر رینگتی ہوئی پیٹ کے نصف گولے پر پہنچ گئیں - اس سست رفتار حرکت میں کوئی چیز آگاہ کرنے والی اور ڈراؤنی تھی - عورت کا چہرہ اور جسم کھنچ گیا اور پھر جسم اس طرح سے اچھلا جیسے مچھلی اونچی اچھلتی ھے اور ایک چیخ نیلگوں کھڑکی سے ٹکرا گئی - ''ان کو بچے کی پیدائش میں کتنی تکلیف ھوتی ھے...'' شیطان کو اس درد سے الجھن ھو رھی تھی کیونکہ درد میں مبتلا عورت اس سے زیادہ قریب تھی - اس نے ان آتش زدہ لوگوں کو اپنے گھر کی چوکھٹ پار کرنے کی اجازت دیکر غلطی کی تھی - جو کچھ اس نے اپنی جھونپڑی کے لئے روا رکھا وھی خود اسکے لئے بھی تھا - کیا وہ اور اسکا گھر ایک ھی نہ تھے؟ ''لیکن آخر یہ سب کس لئے؟ کیا یہ مصیبتیں برداشت کرنے والیاں یہ نہیں جانتیں کہ سب کو بہرحال مرنا ھے، وہ جو جنتی ھیں اور وہ جو جنے جاتے ھیں؟''

جوان عورت مرد کے ھاتھوں میں کانپ رھی تھی، شمعیں بھی جو چولھے پر رکھی تھیں ھل کر پیچھے ھٹ گئیں - شیطان پھر اینٹھنے مڑنے لگا - وہ ایسا ٹوٹا، پارہ پارہ اور دبا ھوا محسوس کر رھا تھا جیسے وھی تو بچہ جن رھا تھا - وہ چولھے تک رینگ کر گیا اور پھر اپنے گھٹنوں پر اٹھا - اسی لمحے شمعیں بجھ گئیں اور جھونپڑی میں تاریکی اور خاموشی چھا

گئی جیسے تاریکی کا دیوتا آگیا ہو۔ حتی کہ بچہ جنتی ہوئی عورت خاموش ہو گئی۔ صرف اتنا سنائی دے رہا تھا کہ چھجوں کی جھالروں سے بارش کا پانی کس طرح ٹپک رہا ہے۔ شیطان نے چولھے میں چند الفاظ کہے۔ ایک منٹ بعد کھڑکی لال بھبھوکا ہو کر چمکنے لگی، پائپ بجنے لگا اور گھر کے بیچوں بیچ شیطان کی پرانی شناسا جادو گرنی کی شکل جھلملانے لگی۔

''تو کبھی دایہ رہی ہے؟،، شیطان نے بالکل سوکھے ہونٹوں سے کھسر پھسر کرتے ہوئے پوچھا۔

''رہی ہوں، رہی ہوں، صرف جوانی میں، حضوروالا،، بڑ ھانکتے ہوئے جادو گرنی بولی ''تمھارے خیال میں ہمیشہ سے بھڑبھونجی رہی ہوں؟ ہاں، کبھی ساری بستی...،،

''اچھا، جو ضروری ہے وہ کرو،، شیطان نے اسکی بات کاٹ دی اور ایک کنارے لیٹی ہوئی عورت کی طرف اشارہ کیا ''صرف گڑبڑ نہ کرنا...،،

''آپ جو کہیں، حضوروالا۔،،

پھر شمعیں جل اٹھیں۔ جادو گرنی جب بچہ جنتی ہوئی عورت کی طرف بڑھی تو اسکے چہرے پر جوانی اور نیکی کھیل رہی تھی۔ شیطان اپنے کونے میں چلا گیا اور جادو گرنی نے مرد کو نکال دیا، وہ چوکھٹ کے پاس منڈلا رہا تھا۔ جادو گرنی نے نوجوان عورت کے پیٹ پر اپنا سوکھا ہاتھ رکھا۔ عورت خاموش ہو گئی۔ جادو گرنی نے بلاؤز کی آستینیں چڑھائیں۔ شیطان اطمینان سے کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ چاند نکل آیا تھا اور آٹا چکی پر لٹک رہا تھا۔ اب تمباکو

پیسنے کا وقت آگیا تھا۔ آج تو اسے دھندلکا دیکھنا ھی نہیں نصیب ھوا۔ مہمانوں نے گڑبڑ کی۔ ارے، جلدی سے بچہ جن چکے تو رخصت کر دے ان کو اور پھر پرانے سکون کی طرف واپس جائیے۔ خود پھلیں بڑھیں۔ وہ کام کاج کرتے ھیں اور مرجاتے ھیں اور شیطان کو تو یہ بستی کے کنارے کی جھونپڑی اور شاموں کا دھندلکا ھی کافی ھے۔

اچانک پھر ایک چیخ گونجی جو پہلے والی سب چیخوں سے زیادہ برمانے والی، دردآمیز اور خوفناک تھی، اس سے تو گھر ھل گیا۔ ایسا لگا کہ جیسے دیواریں گر گئیں اور زمین کا ذرہ ذرہ لرز اٹھا اور خود شیطان بھی الٹ پلٹ گیا۔ کند آرے اسکی کمر کے پرخچے اڑائے دے رھے تھے۔ یہ محسوس کرتے ھوئے کہ وہ زیادہ برداشت نہیں کر سکتا، کہ وہ ابھی بچہ جننے والی سے بھی زیادہ زوروں سے چیخنے لگے گا، شیطان اپنے پیروں پر کھڑا ھو گیا اور بےچینی سے چلایا ''نیند! نیند!،، اور بالکل جڑ سے کٹے ھوئے پیڑ کی طرح نیند کی محافظ ھتھیلیوں میں جا گرا۔

اور نیند ھی نے اسکو جگایا بھی۔ شیطان کو ایسا لگا جیسے اسکا بھیڑ کی کھال کا گرم اوورکوٹ کھینچ لیا گیا ھو۔ اسکو سردی لگ رھی تھی۔

''ھاتھ سن ھو گیا،، چپکے سے نیند نے کہا ''کیسی نہ ختم ھونے والی رات ھے۔ مجھے بڑی دیر سے آرام کرنے کی ضرورت ھے۔ لیکن ابھی میں تجھے ایک بار اور سلا دوں۔،،

''ضرورت نہیں ہے،، شیطان نے جواب میں کہا۔
شیطان کا جسم ایک خوشگوار تکان اور ہلکے پن کے ساتھ آرام کر رہا تھا جیسے کسی سخت جدوجہد میں اس نے فتح پائی ہو۔ گھر میں بھی خاموشی اور سکون تھا۔ جوان عورت سکون کی سانسیں لے رہی تھی۔ چاند کی ہتھیلی اس طشت کو سہلا رہی تھی جو چھت کے نیچے لٹکا تھا۔ شیطان اٹھا اور طشت کے قریب آگیا۔ طشت میں سفید کپڑے میں لپٹی کوئی چھوٹی چیز لیٹی تھی اور کسی برتن جیسا اسکا سر باہر نکلا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے قد اور بےچارگی کے لحاظ سے مضحکہ‌انگیز تھی۔ وہ تو چپکے چپکے شمع کی طرح سانس لے رہی تھی۔

''اور اس مٹھی بھر گوشت کے لئے یہ پریشانی؟ کیسے بیوقوف ہیں لوگ...،، شیطان حسب‌عادت یہی سوچنا چاہتا تھا۔

لیکن اس نے حسب‌عادت نہیں سوچا۔

''عارضی لمحہ، سمندر میں ایک لہر... لیکن گرم،، شیطان کے دانت نکل پڑے ''انکھوا...،،

پھر اس نے اپنے ہاتھ طشت کے اوپر لا کر گرم کئے۔ اس چھوٹے سے، ابھی پیدا ہونےوالے جسم سے جاندار، صاف اور بالکل سرخ گلاب کے شعلے جیسی گرمی نکل رہی تھی۔ اس گرمی نے ہلکے سے شیطان کی ہتھیلی کو سہلایا اور اس کے پورے جسم میں پھیل گئی، اس نے شیطان کی روح کی لافانی بیخ کو پگھلا دیا۔ کوئی نئی، انجانی اور حیرت‌انگیز چیز شیطان کو گدگدا رہی تھی، بےچین کر رہی تھی۔

وہ صحن میں نکل گیا اور بالکل جانے بغیر اوپر دیکھنے لگا۔ آسمان صاف تھا اور تارے ایسے کھلے تھے جیسے کنول ہوں۔ شیطان کو طرح طرح کی گھاسوں، پانی اور نرسل کی مہک نے گھیر لیا... شیطان کی رہائش گاہ پوری دھرتی بن گئی جو بہار سے جاگ کر، رس سے بھر گئی تھی۔ اس نے بید کے سوکھے درخت کے نیچے بیٹھ کر ہوا کے ساتھ سیٹیاں بجانا نہ چاہا۔ وہ لال بیریوں کی جھاڑی کے پاس سے گذر کر کھیت میں پہنچ گیا اور گرم بارش سے تھکی ہوئی زمین پر چلنے لگا۔ پھر نہ جانے کیوں اسکو سوتی ہوئی جوان عورت کا پرمسرت چہرہ یاد آگیا۔ اس نے محسوس کیا کہ کیسے ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں انکھوے، جیسا وہاں، اسکے گھر میں ہے زمین کو توڑ کر روز روشنی میں آجاتے ہیں۔

''کتنے ہیں وہ، اور سبھی سورج کے پیاسے،، اس نے حیرت سے سوچا ''اور سب کو انتظار رہتا ہے کہ صبح سویرے کوئی سورج کو لنڈھکا کر لائے۔،،

اس نے محسوس کیا کہ جیسے خاردار چیونٹیاں اسکے پیروں پر رینگ رہی ہیں اور کہیں اسکے اندر گہرائیوں میں درد پیدا ہو رہا ہے۔

''زمین بھی درد محسوس کرتی ہے جب جنتی ہے،، شیطان نے سوچا ''اس اذیت کا تصور کرنا بھی تکلیف دہ ہے نہ کہ جننا...،،

درد اور اذیت کے درمیان اس نے زمین کی خوشی محسوس کی جو جنتی ہے اور ان انکھوؤں کی خوشی بھی جو جنم لیتے ہیں اور ایک خوشگوار رشک نے اسکے دل کو افسردگی سے بھر دیا۔

وہ گھر کو لوٹ آیا۔ باہر مٹی کے ڈھیر پر تھیلا اپنے اوپر ڈالے آدمی سردی سے کانپ رہا تھا۔

''اچھا، بنالیا تمھیں اپنا کرایہ‌دار،، شیطان نے بید کے درخت کی طرف دیکھتے ہوئے چپکے سے کہا۔ اس بہار کی رات میں صرف یہ پیڑ ہی سوکھا اور بےجان رہ گیا تھا۔ ''اور ہفتے بھر کا کرایہ ایک مٹھی پسی ہوئی تمباکو ہوگا۔ صرف بیوی سے یہ کہہ دے کہ وہ میرے کونے میں سفیدی نہ کرے۔،،

''شیطان صاحب، خدا آپکی مدد کرے،، مرد نے ڈھیر پر سے اترکر سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''کیسا خدا...،، شیطان نے زور سے سانس لیکر کہا۔

وہ گھر میں پنجوں کے بل چل رہا تھا کہ کہیں زچہ اور بچہ جاگ نہ پڑیں۔ لیکن طشت میں کچھ آواز اور کلبلاہٹ ہورہی تھی۔ شیطان زمین پر بیٹھ کر پالنے کو ہلکے ہلکے ہلانے لگا۔ پالنے سے آہستہ آہستہ چوں چوں کی آواز نکل رہی تھی، ننھا چپ ہوگیا۔ پھر سو گیا۔ نیند کام کی وجہ سے بالکل خستہ حال زیادہ قریب کھسک آئی تھی۔

''کیسی لمبی رات ہے،، پھر نیند نے شکایت کی ''اب تو دم نہیں رہا۔ کاشکہ جلدھی صبح ہوجاتی۔،،

اور وہ بھاگی کیونکہ پھر اسکا کہیں سے بلاوا آگیا تھا۔ شیطان پالتی مارکر فرش پر بیٹھ گیا اور پالنے کو ہلانے لگا۔ مدتوں سے اس نے ایسا لطف

نہیں محسوس کیا تھا۔ اچانک اس نے بھاری اور تیز قدم سنے اور اس کے سینے میں ایک ناخوشگوار سرد احساس پیدا ہوا، شانے جھک گئے۔

کھڑکی میں ایک آواز گونجی:

''کم شیطان جمع ہوئے ہیں۔ بہت سے اپنے اپنے کونوں میں دبکے ہوئے ہیں۔ اور سورج کو دیر ہوئے اوپر اٹھانے کا وقت ہوچکا ہے۔،،

ہرکارے نے جواب کا انتظار کیا، پھر گہری سانس لیکر آگے بڑھ گیا۔ شیطان سمٹ گیا۔ اچانک ایک غمآگیں خوف نے اسکا گلا دبوچ لیا جیسے اس نے بجلی دیکھ لی ہو جس سے بوڑھے دیوتا نے اسکے بید کے درخت کو نشانہ بنایا تھا۔ ننھا رونے لگا۔

''اوں، اوں!،، شیطان نے کہا اور ایسے سوکھے ہاتھوں سے پالنا ہلانے لگا جیسے وہ کسی دوسرے کے ہوں۔

اسی منٹ تختے پر لیٹی ہوئی عورت جاگ اٹھی۔ اس نے شیطان کو آنکھیں پھاڑکر دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے جلدی سے بچے کو اٹھا لیا۔ شیطان گھر سے نکل گیا۔ وہ تمباکو کا ناس لینا چاہتا تھا۔ گھسٹتا ہوا آٹا چکی پہنچا۔ اسکو اپنے پیروں تلے زمین خاص طور سے سخت معلوم ہو رہی تھی۔ چاند زرد اور رنجور لگ رہا تھا اور افق تک جھک آیا تھا۔

اور مشرق میں ابھی گلابی رنگ نہیں پھیلا تھا۔ آٹا چکی کا مالک ابھی کٹھرے کے اندر ہی پیر مار رہا تھا۔ نیند نظر نہیں آرہی تھی۔ شیطان دریا کے کنارے کنارے چل پڑا۔ نرسلوں کے پیچھے، کنارے

کے قریب جل پریاں نہا رہی تھیں۔ یہ دراز زلفوں والی شیطان سے ملنے دوڑ آئیں، انھوں نے لمبی گھاس کی بیندیاں سر میں لگا رکھی تھیں۔ انھوں نے شیطان کو چاروں طرف سے سبزی مائل سراب کی طرح گھیر لیا۔

''لڑکیو، گھر جانے کا وقت ہوگیا،، کسی نے پانی کے اوپر آہستگی سے کہا۔

''سورج ہونا چاہئے۔ اب تو سورج نظر ہی نہیں آتا...،،

''کیسی سردی ہے، سردی، سردی!،، جل پریوں نے کہا۔

ایک سرسراہٹ ہوئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ پانی پر صرف سیاہ لہریں نظر آرہی تھیں اور آسمان سے سفید چڑیاں گرنے لگیں، وہ وحشت سے چلا رہی تھیں اور سبزہ‌زار میں غولوں کی شکل میں گر کر اس طرح جامد ہوجاتی تھیں جیسے برف کے ڈھیر ہوں۔ آبی گھاس کی نئی کونپلیں جو پانی پر پڑی تھیں نظر آرہی تھیں۔ شیطان آہستہ گھر کو واپس گیا۔ اسکے پیروں کے نیچے مرتی ہوئی دھرتی افسردگی سے کراہ رہی تھی۔

''آؤ آج ہم سورج کو اوپر لنڈھکا دیں، آؤ...،، شیطان بڑبڑایا ''لیکن یہ بھی تو زندگی کا ایک لمحہ ہی ہے ــ یہ دن۔ وقت کے سمندر میں ایک قطرہ۔ اسکا یقین کہاں سے ہو کہ سورج پھر کل بلند ہوگا؟ شیطان تو اب مٹھی بھر رہ گئے ہیں اور آج اگر زیادہ نہیں تو خاصے نصف شیطان ختم ہو کر ہڈیوں

13—190

کے ڈھانچے ہو جائیں گے۔ میں تو مرنے کے لئے تیار ہوں اگر بوڑھا دیوتا یہ کہے 'جوانو، بس ایک بار سورج کو اور اوپر اٹھا دو، ہمیشہ کے لئے اور پھر رات کبھی نہ آئے گی، ہمیشہ سورج والے ہی دن ہوں گے، لیکن بوڑھا دیوتا یہ نہیں کہے گا۔ آسمان تو خاموش ہی رہے گا جیسا کہ ابھی تک رہا ہے۔ اور شیطان کو اپنا پرسکون کونہ چھوڑ کر اپنی زندگی خطرے میں ڈالنا چاہئے جیسے زندگی اسکے لئے کوڑی مول کی بھی نہیں ہے، جیسے اسکے پاس کوئی دوسری فاضل زندگی ہے...''

شیطان کا دل خود اپنے اوپر افسوس سے رونے لگا۔

چبھنے والی تاریکی کے درمیان گھر کی کھڑکی گرم اور سرخ ہوگئی تھی۔ شیطان نے دروازہ کھولا — اسٹوو کے جبڑوں کو شعلے چاٹ رہے تھے۔ نوجوان عورت آگ کے قریب بیٹھی نوزائیدہ کو دودھ پلا رہی تھی اور اسکے سینے پر شعلوں کے سائے لہرا رہے تھے۔ شوہر نے اس کے شانے کو شال سے ڈھک دیا۔ شیطان اپنے کونے میں گھس گیا۔ گھر بھی جامد اور مردہ ہوگیا۔ بارش سے بھیگی ہوئی چھت یخ بستہ ہوگئی، دیواریں سکڑ گئیں اور اسٹوو کے نیچے جھینگر سرسرانے لگے، ان سب نے شیطان کی روح میں ایک سرد درد پیدا کر دیا۔ کھڑکی کے نیچے قدموں کی چاپ ہوئی اور ہرکارے کی تشویشناک آواز کھڑکی سے ٹکرائی۔

''شیطان تو کم پڑ گئے، ہم میں سورج اٹھانے کی قوت نہیں ہے۔ اگر چاہتے ہو کہ رات ختم

ہوجائے، جلدی سے اڑ کر مدد کرنے آؤ۔ میں آخری بار آیا ہوں...،،

''ارے، بچے کو آگ کے اتنے قریب نہ لاؤ،، مرد نے کہا۔

''یہ کبھی سورج نہ دیکھے گا،، عورت رو پڑی ''کم از کم گرمی تو محسوس کرنے دو...،،

''بہرحال کبھی نہ کبھی مریگا،، مرد نے ہونٹوں کو مشکل سے حرکت دیتے ہوئے جواب دیا۔ ''جیسے کہ ہم کو مرنا ہے۔،،

''لیکن ہم نے تو سورج دیکھا ہے۔ کاشکہ ہمارا بچہ ایک دن ہی دیکھ لیتا... رات میں پیدا ہوا اور رات ہی میں مریگا... آخر میں نے کس لئے اتنا دکھ درد سہا؟،،

شیطان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے سینے میں کچھ پگھل گیا۔ عورت کے قریب سے گذرتے ہوئے اس نے درشتی سے کہا:

''اگر واپس نہ ہوں تو جھونپڑی تیرے بچے کی ہوگی۔،،

عورت نے شیطان کی طرف آنسو بھری آنکھیں اٹھائیں۔ ان میں امید جھلک رہی تھی۔ گھر میں بھی جان آ گئی۔ شیطان نے بچے کی شکن آلود سرخ پیشانی کو نرم انگلیوں سے سہلایا اور پھر زوروں کی آہ بھر کر باہر نکل گیا۔ آسمان پر نہ تو چاند تھا اور نہ تارے، صرف تاریکی چھائی تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھائے، سیٹی بجائی اور بے کنار تاریکی میں بلند ہوگیا۔

اسے ایسا لگا جیسے وہ ابدیت میں پرواز کررہا ہے اور آگے کوئی روشنی نہیں ہے۔ شیطان پریشان ہوکر سوچنے لگا ''کہیں راستہ تو نہیں بھٹک گیا میں؟،، کوئی ہزار سال سے اس نے آٹا چکی کے آگے قدم نہیں دھرا تھا۔ لیکن افق پر ایسا لگا جیسے انار پک گیا ہو — سرخی مائل بنفشئی شفق پھوٹ رہی تھی۔ شفق بڑھتی اور پھیلتی گئی، وہ دھرتی کے کونوں تک پھیل گئی۔ آسمان کا لافانی سمندر ان‌دیکھی لہروں سے بےچین تھا۔ ان کے شور نے تو برج بابل کے زبردست شوروغوغے کو مات کر دیا تھا۔ یکدم گرمی ہوگئی اور پھر شدید گرمی کے خطرناک جھونکے آنے لگے۔ ایک گرم بگولا آسمان تک بلند ہوگیا اور شیطان اس سے لپٹا گھومتا نیچے زمین تک پھسل آیا۔ سمندر کے قریب ایک اتھاہ غار سے آگ بلند ہو رہی تھی۔

اسکی سمجھ میں آگیا کہ کہیں یہیں نیچے سورج ہے۔

اردگرد کے شیطانوں میں بلا کی قوت تھی — زندہ اور مردہ دونوں میں۔ جلے ہوئے جسموں سے جن پر سرخ سائے تھے اس اتھاہ غار کے گرد سارا میدان خون آلود تھا۔ جہنم کے باسیوں کا — شیطانوں، روحوں اور صحرائی بھوتوں کا ایک مجمع لمبی لمبی آنکڑےدار بلیوں اور رسیوں کے قریب ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہا تھا۔

''کیا سب شیطان جمع ہو گئے؟،، اچانک مجمع کے اوپر کوئی حاکمانہ آواز گونجی۔

''سب، سب!،، ہر طرف سے غالباً ہرکاروں کی آوازیں آئیں۔

''کام پر چلو، بھائیو!،،

اور میدان میں سناٹا ہوگیا۔ صرف سمندر شور کررہا تھا، وہ پتھریلے ساحل سے برابر ٹکرا رہا تھا۔ شیطانوں نے خاموشی سے آنکڑےدار بلیاں اور رسیاں اٹھا لیں اور اتھاہ غار کی طرف چل پڑے۔ جو آگے تھے وہ دھاوا بولنےوالوں کے پیروں کے نیچے فوراً گر گئے لیکن دھاوا بولنےوالوں نے کوئی توجہ نہ کی اور آگے ہی بڑھتے رہے۔ سرخ میدان میں ہر طرف سیاہ سائے بیقرار تھے۔

عجیب بات یہ تھی کہ شیطان کو ذرا بھی ڈر نہیں لگ رہا تھا، حتی کہ جب اس نے یہ سوچا کہ سورج سے بالکل آنکھیں چار کئے کھڑا ہے۔ اس پر جیسے کوئی زبردست طاقت طاری ہوگئی اور اس کو اوپر لے گئی، زیادہ سے زیادہ بلندی پر۔ اور اس نے اس بلندی سے وہ کچھ دیکھا کہ اسکا دل سینے میں جم گیا اور اسکی آنکھوں سے ایسے احساس مسرت سے آنسو نکل پڑے جو اسکو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے قربانی کے لئے کوئی خیال نہیں تلاش کیا اور یہ نہیں سوچا کہ کل کون سورج کو اوپر اٹھاکر بلند کریگا۔ اسکو تو صرف ایک ہی بات معلوم تھی کہ اسے آج سورج کو اوپر اٹھانا چاهئے تاکہ وہ بچہ جو رات کو پیدا ہوا ہے روشنی دیکھ لے، اس کے بعد جو چاہے ہو۔

بالآخر بلیاں کسی سخت چیز سے لگیں ۔ شیطانوں کی قطاریں اتھاہ غار کے کنارے سے قریب ہو گئیں اور آگ ان کو جلانے لگی ۔

''بھائیو، ایک ساتھ ملکر !،، پھر میدان پر آواز گونجی ۔

لیکن سورج ٹس سے مس نہ ہوا ۔

''بھائیو، ایک ساتھ ملکر !،، ساحل کے اوپر زوردار آواز گونجی جس نے سمندر کے شور کو ڈبو دیا ۔

شیطان نے دونوں ہاتھوں سے بلی پکڑلی اور پورے جسم سے اس پر لیٹ گیا ۔ وہ محسوس کررہا تھا کہ اس کے اردگرد لکھوکہا بھائی ٹھیک اسی طرح کررہے ہیں ۔ اس نے اس مشترکہ عمل میں اپنی قوت کا آخری قطرہ تک لگا دیا، تہہ تک، آخری سانس تک ۔ اب نہ تو اس کے دل میں کوئی شبہ تھا اور نہ دھندلکے کے لئے کوئی پرمسرت خیال ۔ اب تو وہ خود بھی پہلا جیسا نہیں رہا تھا ۔ اب اسکی جگہ ایک نئے شیطان کا وجود ہوچکا تھا جسکے لکھوکہا ہاتھ تھے ۔ وہ آخری ذرے تک مجمع میں مدغم ہو گیا تھا ۔

اور اب کسی چیز کی آواز ہوئی، کچھ ابلنے، کھلبلانے لگا ۔ سرخی مائل عنابی گولہ نیلے غلاف میں اتھاہ غار سے نکل آیا ۔ آتشیں سمندر کراہ کر پیچھے ہٹ گیا اور غار کو خالی چھوڑ دیا ۔ اب شیطانوں کی پہلی قطاریں گرپڑیں، ان کو شعلوں کی زبانوں نے اس طرح کاٹ دیا جیسے

درانتی گھاس کاٹتی ہے۔ سورج قائم ہوکر زمین کے اوپر لنڈھکنے لگا، وہ ہر منٹ اپنے اتھاہ غار میں واپس جانے کے لئے تیار تھا۔

''وہ گر رہا ہے! سنبھالنا!،، شیطان نے چلا کر کہا۔ وہ اپنی آواز نہیں پہچان رہا تھا۔ وہ اتنی زوردار اور جذبات سے بھری ہوئی تھی۔

شیطان نے بلی کا دستہ اور زوروں سے دبایا۔ میدان میں وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے جن میں کھڑے ہونے کی قوت تھی۔ اب شیطان آگے تھا۔ ہر قدم پر آتشیں لہریں زیادہ گرم ہوتی جا رہی تھیں اور جب اسکے ہاتھ ڈھیلے پڑجاتے اور پیر جواب دینے لگتے تو وہ اس جوان عورت کا خیال کرتا جس نے کیسی تکلیف کے ساتھ رات میں بچے کو جنم دیا تھا... ''یہ ہوئی کچھ بات — جنم دینا اور سورج کو اوپر اٹھانا... زندگی... زندگی...،، اسکی کنپٹیاں دھڑک رہی تھیں۔

جسم رفتہ رفتہ جل رہا تھا اور درد کی تو کوئی حد نہ تھی۔

ہزاروں بلیاں سورج کے گولے کو اوپر اٹھارہی تھیں جسکی سانس آتشیں تھی۔ وہ سب ملکر سورج کو اوپر دھکیل لائے۔ مشتعل سورج، ساحل پر آتشیں قطرے بکھیرتا آسمان پر لنڈھکنے لگا۔

زمین خوشی سے ناچ اٹھی۔

شیطان جلے ہوئے جسموں پر پڑا مررہا تھا۔ جانتا تھا کہ وہ مررہا ہے، محسوس کررہا تھا کہ کیسے زمین قطرہ قطرہ کرکے اسکو چوس رہی

ہے۔ وہ شیطان جو زندہ بچ گئے تھے، لڑکھڑاتے ہوئے سمندر تک گئے، کھولتا ہوا پانی چلو میں لیکر اپنی پیٹھوں پر ڈالنے لگے اور ہر قطرے سے ایک چھوٹا شیطان پیدا ہوگیا۔ ساحل پر شیطانوں کی نئی صفیں بن گئیں۔ ''یہ رہا زندگی کا عظیم خیال،، آخری بار شیطان نے سوچا ''اور میں ڈر رہا تھا کہ کل کوئی بھی سورج کو اوپر اٹھانےوالا نہ ہوگا۔ بوڑھا دیوتا اپنا کام خوب جانتا تھا جب اس نے دنیا کی تخلیق کی تھی...،،

جلے ہوئے خاک سیاہ شیطان نے اپنی آخری قوت جمع کی اور نارنجی ریت پر لڑکھڑاتا ہوا گیا اور اپنے کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیا...

فاضل اسکندر
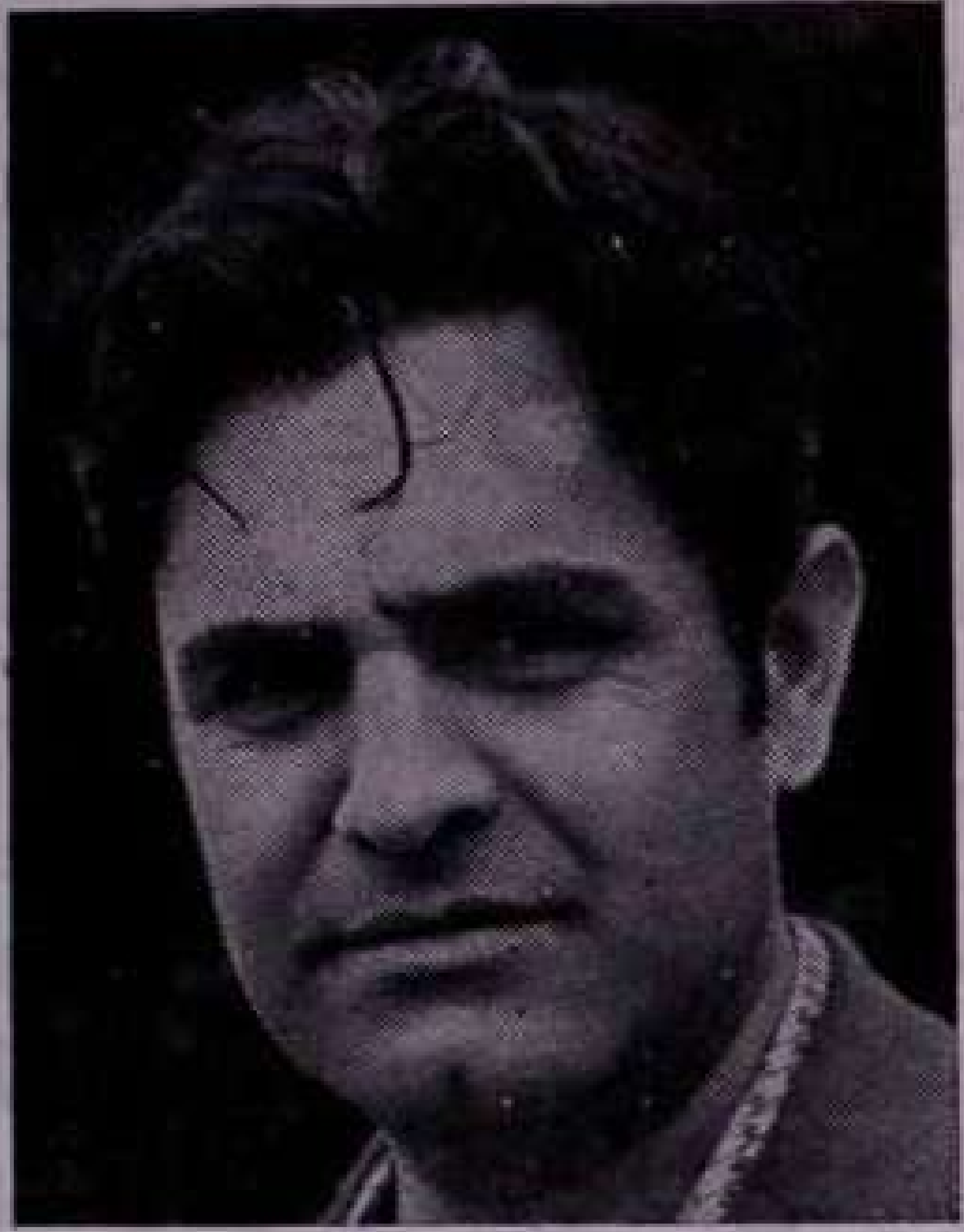
فاضل اسکندر (سال پیدائش ۱۹۲۹ء) بحیرۂ اسود کے کنارے واقع سرسبز اور دھوپ سے روشن جنوبی سوویت رپبلک ابخازیہ میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔

فاضل اسکندر باجوہر شاعر اور نثرنگار ہیں۔ وہ نظموں، کہانیوں اور قصوں کے کئی مجموعوں کے مصنف ہیں۔ اسکندر کی زیادہ‌تر کہانیاں اپنے وطن ابخازیہ سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے ہیرو بہت سے دلچسپ اور پرتفریح واقعات سے دوچار ہوتے ہیں اور اس طرح مصنف اپنے ہیروؤں کو خود اپنے اور اپنے اردگرد کے ماحول سے کافی مزاحیہ انداز میں نبٹنا سکھاتے ہیں۔ اسکندر کے مزاح میں بھرپور سنجیدگی ہوتی ہے۔ وہ انسانی صلاحیتوں، جرأت، اعتماد، ایثار اور بہت سی دوسری اہم باتوں کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔

اسکندر کی کہانی ''ھتھ ٹوٹٹا،، کو قارئین اور ناقد دونوں ان کی بہترین کہانی تسلیم کرتے ہیں۔

بہتہ ٹوٹا

میں اس کے بارے میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ کس طرح بچپن میں ایک بار رات کے وقت کسی رشتےدار کے گھر جاتے ہوئے میں بھٹک کر ایک قبر میں جاگرا جو تازہ تازہ کھو دی گئی تھی اور وھاں مجھے کئی گھنٹے ایک بکری کی صحبت میں گذارنا پڑے۔ وہ بھی راستہ بھولکر اس گڈھے میں آن پڑی تھی۔ ادھر سے گذرتے ہوئے ایک کسان نے مجھے اس گڈھے سے نکالا۔ یہ واقعہ جنگ کے زمانے کا ہے۔

میرے اس رات والے حادثے کے کچھ عرصے بعد ہی ہم یعنی میری ماں، بہن اور میں اسی گاؤں میں رھنے لگے۔ ابتدا میں تو ہم اپنی خالہ کے یہاں رہے۔ پھر ہم نے ایک اور گھر میں کمرہ لےلیا اور اس میں اٹھ گئے۔

اس گھر میں جنگ سے پہلے تین بھائی رھتے تھے۔ اب وہ سب فوج میں چلے گئے تھے۔ ان بھائیوں

میں سے صرف ایک ہی شادی کرسکا تھا اور اب اس پورے گھر میں اس کی نوجوان اور پرشباب بیوی ہی رہتی تھی جس کو پچھلی یادیں کچھ ایسی زیادہ نہیں ستاتی تھیں۔ اس کو یاد کرکے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس عورت کو جس کا شوہر باہر گیا ہو ''پھوس بیوہ،، اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ بھی سوکھی گھاس کی طرح جلد ہی آگ پکڑ لیتی ہے۔

وہاں ہمارے قیام کے دوران ایک بھائی گھر آیا۔ ہاں، وہی جس کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ گھر بہت ہی خاموشی کے ساتھ آیا تھا۔ ایک صبح ہم نے اسے باورچی‌خانے میں دیکھا۔ وہ آگ کے سامنے بیٹھا سلاخ پر ایک بھٹا بھون رہا تھا جیسے وہ اپنے جنگ سے پہلے والے بچپن کا اعادہ کرنے کی کوشش کررہا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا اس وقت واپس آنا ٹھیک نہ تھا یا ممکن ہے اس کو تھوڑا عرصہ بعد شادی کرنا چاہئے تھا کیونکہ مجھے ایسا لگا کہ اس کو بیوی کی یاد نے ستایا اور وہ جلدی واپس آگیا۔

کوئی ایک ہفتے تک وہ بڑے شوق کے ساتھ باغ میں چہل قدمی کرتا رہا اور پھر اس کو گرفتار کرلیا گیا اور تھوڑے دن بعد ہمیں پتہ چلا کہ وہ فوج سے بھاگ کر آیا تھا۔ وہ اسی خاموشی سے لے جایا گیا جس طرح وہ آیا تھا۔

رفتہ رفتہ ہم نئی جگہ پر جمتے گئے۔ میری بہن کو مقامی پنچائتی فارم میں حاضری نویس کی

ملازمت مل گئی۔ ہمیں ایک قطعۂ آراضی الاٹ کر دیا گیا۔ اس پر ہم خربوزے اور مکئی کی کاشت کرنے لگے۔ ہم کدو بھی پیدا کرتے تھے اور کھیرے اور ٹماٹر بھی اگاتے تھے۔ اس زمانے میں تو ہم ہر چیز بونے لگے تھے۔

اور معلوم ہوا کہ ہم اس آدمی کے قریب ہی رہتے ہیں میں جس کی قبر کے گڈھے میں گرچکا تھا۔ اس گڈھے کے بارے میں گاؤں میں یہ کہا جاتا تھا کہ اس میں سبھی گرچکے ہیں سوائے اس آدمی کے جس کے لئے یہ کھودا گیا تھا۔ اس کا قصہ بہت طول طویل اور الجھا ہوا تھا۔ اس کا مستقبل کا مالک، اگر اس کے بارے میں یوں کہا جا سکے، بوڑھا شعبان لاربا تھا جس کو لوگ ''ہتھ ٹوٹٹا،، کے نام سے پکارتے تھے۔ اس کو اپنڈیسائیٹس یا ورم فتق ہوگیا تھا اور وہ اسپتال میں تھا (اس کو ''سوکھ ہتھا،، کہنا زیادہ صحیح ہوتا لیکن ''ہتھ ٹوٹٹے،، کا نام معنی کے لحاظ سے زیادہ موزوں تھا)۔ ہاں تو ہتھ ٹوٹٹے کا آپریشن ہوا اور وہ ابھی اسپتال میں ہی مزے کے ساتھ شفایاب ہو رہا تھا کہ کسی نے وہاں سے ہماری دیہی سوویت کو ٹیلیفون کردیا کہ مریض تو گذر گیا اور اس کی لاش کو جلد از جلد گھر لے جانا چاہئے کیونکہ اس کو مرے دوسرا دن ہوچکا ہے۔

ان دنوں اس کا کوئی عزیز بھی اسپتال نہیں گیا تھا کیونکہ وہ تو خود ہی اسپتال سے نکلنے والا تھا۔ درحقیقت اسی گاؤں کا ایک شخص مصطفے انہیں

دنوں اپنے کسی کام سے شہر گیا تھا اور برسر راہے اس کو یہ کام بھی سپرد کر دیا گیا کہ وہ اسپتال جاکر یہ معلوم کرے کہ ہتھ ٹوٹا کیوں نہیں واپس آ رہا ہے اور آیا اس نے اپنی اپنڈی‌سائیٹس یا ورم فتق کے ساتھ ساتھ ٹوٹے ہاتھ سے بھی نجات پانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ پھر اچانک یہ غیرمتوقع خبر آ گئی۔

ہمارے رواج کے مطابق مرحوم کے رشتے داروں نے یہ اندوہ‌گیں خبر پیغام‌بروں کے ذریعہ پڑوسی گاؤں کو بھیجی۔ مرحوم کے مکان کے صحن میں ایک بڑا فوجی شامیانہ لگا دیا گیا جہاں فاتحے کا کھانا ہونےوالا تھا اور قبرستان میں ایک قبر بھی کھودی گئی۔

پنچائتی فارم نے اپنی واحد ٹرک مرحوم کو لینے کے لئے روانہ کردی کیونکہ جنگ کے زمانے میں اس کو نجی طور پر کرنا مشکل تھا۔ مختصر یہ کہ سب کچھ اسی طرح کیا گیا جیسے سب لوگوں کے یہاں ہوتا ہے۔ سب کچھ اسی طرح ہوا، سوائے مرحوم شعبان لاربا کے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے زندگی میں کسی کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا تھا اور مرنے کے بعد تو بالکل ہی ہاتھ سے جاتا رہا تھا۔

اس افسوسناک خبر کے دوسرے دن ٹرک مرحوم کو لیکر واپس آگئی جو زندہ سلامت تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ہتھ ٹوٹا جس کو مصطفے ہلکے سے سنبھالے تھا، خوب زور سے ناراض ہوتا

ہوا اپنے صحن سے گذرا۔ وہ اس وجہ سے ناراض نہیں تھا کہ اس کے مرنے کی خبر پھیلائی گئی اور اس کے دفن کفن کا انتظام کیا گیا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ فوجی شامیانہ لگانے کے لئے اس کے دو سیب کے درختوں کی شاخیں کاٹ دی گئی تھیں۔ ہتھ ٹوٹے نے وہیں یہ دکھا دیا کہ شامیانے کو اس طرح لگایا جا سکتا تھا کہ درختوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد وہ اپنے مہمانوں کے پاس جاکر ان سے مصافحہ کرنے لگا اور ہر ایک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر دیکھتا جاتا تھا کہ اس کی موت اور پھر اس کی اچانک اور غیرمتوقع زندگی کا ان پر کیا اثر ہوا ہے۔

کہاجاتا ہے کہ اس کے بعد اس نے اپنا سوکھا ہوا ہاتھ، جو بیس سال سے سوکھ رہا تھا اور کسی طرح سوکھتا ہی نہیں تھا، اٹھا کر اپنی آنکھوں پر سایہ کیا اور بدتمیزی سے ان بکائی عورتوں کو اس طرح دیکھنے لگا جو اس کی موت پر رونے کے لئے بلائی گئی تھیں جیسے وہ ان کی موجودگی کی وجہ نہ سمجھ رہا ہو۔

''تم کیا چاہتی ہو؟،، اس نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''ہم کچھ نہیں...،، انھوں نے سہم کر جواب دیا ''ہم تو تم کو رونے آئے تھے۔،،

''اچھا، تو شروع کردو،، ہتھ ٹوٹے نے کہا اور کان ہاتھ پر اس طرح رکھے کہ وہ اپنے لئے آہ و زاری کو بخوبی سن سکے۔ لیکن کوئی وہاں

بیچ میں کود پڑا اور اس نے بکائیوں کو چلتا کیا۔

رشتے داروں کے لائے ہوئے ہدیوں کو دیکھ کر ہتھ ٹوٹٹا ٹھٹھک کر سوچنے لگا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں ہر طرح کی فاتحہ اتنے بڑے پیمانے پر ہوتی ہے کہ اگر سب کچھ مرنےوالے کے خاندان کے متھے کیا جائے تو زندوں کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہ جائے کہ بس وہ گر کر ختم ہو جائیں۔

اسی لئے ایسی صورت میں سارے رشتے دار اور ہمسائے مدد کرتے ہیں۔ کوئی شراب لاتا ہے تو کوئی بھنے ہوئے مرغ، کوئی کھاجاپوریاں لاتا ہے اور کوئی پوری بچھڑی لیکر آجاتا ہے۔ اور یہاں بھی ایک رشتے دار پڑوسی گاؤں سے ایک اچھی بچھڑی لایا تھا جو ہتھ ٹوٹٹے کو خاص طور سے پسند آئی۔ برسبیل تذکرہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسی رشتے دار کی ناپ پر قبر کا گڈھا کھودا گیا تھا کیونکہ وہ ہتھ ٹوٹٹے ہی کے قد کا تھا۔ چنانچہ جب ان نوجوانوں میں سے ایک جن کو قبر کی کھدائی کا کام سپرد تھا اس شخص کے پاس ناپنے کا فیتہ لیکر آیا تو وہ ناراض ہوگیا اور یہ یقین دلانے لگا کہ اس کے لئے دوسرے لوگ زیادہ موزوں ہیں اور وہ ہتھ ٹوٹٹے سے زیادہ قدآور ہے اور ہتھ ٹوٹٹا اس سے زیادہ موٹا ہے۔

اس طرح وہ پیمائش کے فیتے سے اپنی جان چھڑانا چاہتا تھا ایکن یہ نوجوان بھلا اس کا پیچھا

چھوڑنے والا تھا۔ سارے گورکنوں کی طرح وہ بھی بڑا مسخرہ تھا۔ اس نے کہا کہ ھتھ ٹوٹے کے موٹاپے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر ھتھ ٹوٹا اس قبر میں فٹ نہ ہوا تو وہ اسی رشتے دار کے بارے میں سوچیں گے۔

کہتے ھیں کہ رشتے دار نے اس مذاق پر بے دلی سے دانت تو نکالدئے لیکن صاف ظاھر تھا کہ اس کو برا لگا ھے کیونکہ وہ اپنے گاؤں والوں کے درمیان جا کر کھڑا ھو گیا اور خفگی سے اپنی بچھڑی کی طرف دیکھنے لگا جو باڑ سے بندھی ھوئی تھی۔

ان سارے ھدیوں کو دیکھ کر ھتھ ٹوٹے نے اعلان کردیا کہ ابھی خوشیاں منانے کا وقت نہیں آیا ھے، کہ وہ ابھی بہت بیمار ھے اور اس کو اسپتال سے محض اس لئے چھوڑ دیا گیا ھے کہ اسپتال میں نہ مرے کیونکہ اس طرح ڈاکٹروں پر جرمانہ ھو جاتا ھے جیسے پنچائتی فارم میں پیداوار خراب ھونے سے کسانوں پر جرمانہ ھوتا ھے۔ پھر وہ سیدھا بستر پر چلا گیا اور یہ ھدایت کردی کہ قبر کو ھرگز بند نہ کیا جائے بلکہ اس کو تیار رکھا جائے۔ کہا جاتا ھے کہ رشتے دار چار نا چار اپنی اپنی طرف چلے گئے۔ وہ عزیز جو بچھڑی لیکر آیا تھا خاص طور سے ناراض تھا۔ لیکن ھتھ ٹوٹے نے یہ یقین دلا کر اسے ٹھنڈا کیا کہ اس کو بہت دن تک انتظار نہیں کرنا پڑیگا، کہ اگر بچھڑی کو صحن کے باھر بھی نہ نکالا گیا تو وہ دبلی نہ ھوگی۔

ہتھ ٹوٹٹا ہفتے بھر تک بستر پر لیٹا رہا۔ آنے کے دو دن بعد اس پر متجسس لوگ چھاپہ مارنے لگے کیونکہ اس وقت تک افواہ پھیل چکی تھی کہ ہتھ ٹوٹٹا جو اسپتال میں مر گیا تھا، گھر لائے جانے کے دوران راستے میں پھر جی اٹھا اور خود اپنے کفن دفن کی رسم میں موجود تھا۔ دوسرے لوگ یہ کہتے تھے کہ وہ مرا نہیں تھا بلکہ ابدی خواب میں مبتلا ہوگیا تھا اور ڈاکٹر اس کو کسی طرح جگا نہ سکے لیکن سفر میں اتنے ہچکولے لگے کہ وہ خود بخود جاگ پڑا۔

پہلے تو وہ ملاقاتیوں سے ملتا رہا، خصوصاً جب تک وہ اس کے لئے سابق مردہ اور فی الحال پوری طرح زندہ نہ ہونے کی حیثیت سے طرح طرح کی مزیدار چیزیں لاتے رہے۔ پھر وہ ان سے عاجز آ گیا اور پنچائتی فارم کے صدر نے اس کو کام پر بھی طلب کر لیا۔ کہتے ہیں کہ وہ دروازے کی چرچراہٹ سنتے ہی برآمدے کی طرف بھاگتا اور زور سے چلاتا:

"بھاگ جاؤ، مفت خورو، نہیں تو کتا چھوڑ دونگا تم پر!"

بہرحال اس کے نوجیون کی افواہیں خودبخود بڑھتی اور پھیلتی رہیں اور ایک سال بعد میں نے ایک پڑوسی گاؤں میں سنا کہ ہتھ ٹوٹٹے میں اسپتال سے گھر آتے ہوئے راستے میں دوبارہ جان نہیں آئی تھی بلکہ قبر میں دفنائے جانے کے کئی دن بعد وہ اٹھ بیٹھا تھا اور اس کی آواز کسی لڑکے نے سنی تھی جو قبرستان میں شام کو اپنی بکری ڈھونڈھنے

گیا تھا۔ اس طرح اس کو کھود کر نکالا گیا۔ اگر اس کی آواز اتنی بھاری نہ ہوتی تو وہ بھوک پیاس سے مر جاتا کیونکہ جو جگہ اس کے لئے منتخب کی گئی تھی وہ اچھی اور کافی خشک تھی۔

تو اس طرح ہوا یہ کہ ھتھ ٹوٹٹا زندہ رہا یا کم از کم اس نے اپنے کفن دفن کو روک دیا اگرچہ یہ سچ ہے کہ اس نے اپنی قبر کو پوری طرح تیار حالت میں رکھا۔

ھتھ ٹوٹٹے کو زندہ دیکھ کر گاؤں میں پہلے یہ بات اڑی کہ دیہی سوویت کے سکریٹری نے ان کے ساتھ یہ مذاق کیا تھا کیونکہ اسی نے کہا تھا کہ اس نے اسپتال سے یا کسی ایسے شخص سے بات کی ہے جو اسپتال والا بن گیا تھا۔ لیکن سکریٹری نے کہا:

''بھلا جنگ کے زمانے میں ایسا مذاق میں کیسے کر سکتا تھا؟،،

اور سب نے اس کی بات کا یقین کرلیا کیونکہ جنگ کے زمانے میں ایسا مذاق واقعی بڑی حماقت ہوتی۔ آخر میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ اسپتال میں کسی سے غلطی ہوگئی ، کوئی دوسرا بوڑھا مرا تھا، ممکن ہے ھتھ ٹوٹٹے اور اس کے خاندانی نام ایک سے ہوں کیونکہ ابخازیہ میں ایک سے خاندانی نام بہت ہیں۔

''پھوس بیوہ،، کے گھر میں اپنے قیام کے پہلے ہی دن ہم نے ھتھ ٹوٹٹے کی آواز سن لی تھی اگرچہ اس کو آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔

ٹھیک دوپہر کو پنچائتی فارم کے کام سے کھانے کے لئے گھر آتے ہوئے وہ اپنے گھر سے تین سو میٹر کی دوری ہی سے اپنی بڑھیا کو برا بھلا کہنا اور غصے سے پوچھنا شروع کر دیتا کہ اس نے مکئی کا دلیا تیار کیا ہے یا نہیں۔

اس کی چیخ پکار کا جواب بڑھیا بھی اسی طرح غصیلی چیخ سے دیتی اور ان کی آوازیں اپنی قوت اور صفائی کو کھوئے بغیر رفتہ رفتہ قریب ہوتی جاتیں، ایک دوسرے سے آگے نکل جاتیں اور آخر میں خاموش ہو جاتیں۔ تھوڑی دیر بعد بڑھیا کی آواز خاموشی کو فاتحانہ چیرتی ہوئی بلند ہوتی لیکن ہتھ ٹوٹا چپ رہتا۔ بعد کو جب میں ان کے یہاں جانے لگا تب میری سمجھ میں آیا کہ بوڑھا محض اس وجہ سے خاموش رہتا تھا کہ اس کا منہ کھانے سے بھرا ہوتا تھا کیونکہ وہ اتنا ٹوٹ کر کھانے لگتا تھا کہ پھر اسکے ساتھ ہی بکنا جھکنا ممکن نہ تھا۔

شام کو کام سے واپس ہوتے ہوئے وہ اسی لہجے میں اپنے گھوڑے یا اپنے پوتے یاشکا کے بارے میں پوچھتا اور پھر دریافت کرتا کہ آیا رات کے کھانے کے لئے مکئی کی دلیا ہے۔

اس کے بعد میں نے یاشکا سے جان پہچان اور دوستی بڑھالی۔ وہ بھی اپنے دادا کی طرح بھاری آوازوالا تھا لیکن فرق یہ تھا کہ وہ نیک اور شرمیلا تھا۔ ہتھ ٹوٹا عام طور سے اس کو اپنے گھوڑے پر اسکول لے جاتا اور راستے بھر وہ بڑبڑاتا رہتا کہ

اس کوڑ مغز کے لئے اس کو اپنا قیمتی وقت ضایع کرنا پڑتا ہے۔ یاشکا دادا کے پیچھے اس کی پیٹی پکڑے بیٹھا رہتا اور ادھر ادھر دیکھ کر کھسیانی ہنسی ہنستا جاتا۔

اگر دادا نہ ہوتا تو اسی گھوڑے پر دادی اس کو اسکول پہنچاتی اور وہ اسی ڈھنگ سے دادی کے پیچھے بھی بیٹھتا۔ صرف یاشکا دادی کو اسکول تک نہ جانے دیتا کیونکہ بچے اس کے اوپر ہنستے۔

یاشکا اور میں مختلف شفٹوں میں پڑھتے تھے۔ اسکول سے گھر جاتے ہوئے میں ان سے کوئی آدھے راستے پر ملتا اور یاشکا اپنا سر گھما کر مجھے دیر تک افسردگی سے دیکھتا رہتا جس کی وجہ سے اس کے دادا پر غصے کا ایک اور دورہ پڑ جاتا۔ یاشکا کو اسکول پہنچانا پڑتا کیونکہ وہ اس کے گھر سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور یاشکا کچھ ایسا خود فراموش تھا کہ وہ اکثر یہ بھول جاتا کہ کدھر جارہا ہے اور کسی اور طرف ہو رہتا۔

پہلے دنوں ہتھ ٹوٹا مجھے سڑک پر دیکھ کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کرتا اور پوچھتا:

''تم کس کے بیٹے ہو؟،،

''میں فلاں کا بیٹا ہوں،، میں شائستگی سے اس کو جواب دیتا اور اپنی ماں کا نام بتاتا جن کو وہ مدتوں سے جانتا تھا۔

''اور وہ کون ہے؟،، وہ گرج کر پوچھتا اور اپنی مڑی ہوئی ہتھیلی کے نیچے سے گھور کر میرا جائزہ لیتا۔

''وہ چچا مقصود کی بیوی کی بہن ہے،، میں وضاحت کرتا حالانکہ میں سمجھتا تھا کہ خواہ مخواہ کو بن رہا ہے۔

''اچھا تو تم وہی شہری مفت خورے ہو؟،، وہ ہمارے گھر کی طرف اشارہ کرکے کہتا۔

''ہاں،، میں ہچکچاتے ہوئے تصدیق کرتا کہ ہم وہیں رہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی چار نا چار یہ بھی مان لیتا کہ ہم مفت خورے ہیں۔

وہ میرے سامنے کھڑا اپنی برمانے والی آنکھوں سے مجھے حیرت کے ساتھ گھورتا رہتا۔ وہ پستہ قد اور موٹا تھا۔ اس کی گردن بھاری اور مرغ کی گردن کی طرح سرخ تھی۔ اور جب وہ وہاں کھڑے ہوکر مجھ کو حیرت سے اس طرح گھورتا جیسے اپنے ذہن میں میری مکمل تصویر کھینچ لینا چاہتا ہو تو اس کے ساتھ ہی وہ کچھ اور بھی سنتا رہتا تھا، اس بات کو جو باڑ کے پار، اس کے مکئی کے قطعہ پر ہو رہی ہوتی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے کانوں تک پہنچنے والی کھسرپھسر، کھٹ پٹ اور صرف اس کی سماعت میں آنے والی کسی آواز سے ٹھیک ٹھیک یہ پتہ لگا لیتا ہے کہ اسکے خانہ باغ میں کیا ہو رہا ہے اور ممکن ہے کہ گھر کے اندر کے بارے میں بھی یہی صورت تھی۔

''اچھا تو تم ہی میری قبر میں گر پڑے تھے؟،، وہ اچانک پوچھتا، ساتھ ہی اس کے کان لگے رہتے، کہ اس کے خانہ باغ میں کیا ہورہا

ہے اور وہ کوئی چیز غلط پکڑ بھی لیتا جس پر وہ خفگی سے پھنکارتا تھا۔
''ہاں''، میں جواب دیتا اور اس کو چھپے ہوئے خوف سے دیکھتا کیونکہ مجھے محسوس ہوتا کہ جیسے وہ کسی پھٹنے والی طاقت سے بھرا ہے۔
''اچھا، تو تمہیں وہاں کیسا لگا؟''، وہ پوچھتا۔ لیکن وہ اب بھی سنتا رہتا اور جو کچھ وہاں ہو رہا ہوتا اس پر اس کا تاؤ بڑھتا جاتا۔ اور پھر وہ خودبخود بڑبڑانے لگتا ''ارے، کیا مر گئی، یہ بڑھیا... کیا اندھی ہو گئی... یہ بیوقوف بڑھیا مجھے ایک دن لے ڈوبے گی۔''
''بہت اچھا''، میں اس کے سوال کا جواب دیتا اور اس مہمان نوازی کے لئے اپنی شکر گذاری کا اظہار کرنا چاہتا۔ بہرحال قبر تو اسی کی تھی۔
''جگہ اچھی اور خشک ہے''، وہ اتفاق کرتا، اس کے خانہ باغ میں جو کچھ ہو رہا ہوتا اس پر وہ بھناتا رہتا اور پھر اچانک وہ پھوٹ پڑتا اور اسی جگہ سے اپنی بڑھیا پر چیختا، وہ یکدم اپنی آواز کی چوٹی تک پہنچ جاتا۔ ''ارے، دیکھ، گھر کی باڑی میں کیا کھڑبڑ ہو رہی ہے، کھڑبڑ! کیا تیرے کان بہرے ہوگئے ہیں، بکریاں ہیں، بکریاں!''
''ارے، کیا میں ان کو تمہارے ساتھ تمہاری قبر میں دفن کردوں! تمہیں تو ہمیشہ بکریاں ہی نظر آتی ہیں!''، بڑھیا نے فوراً جواب پھینک مارا۔
''ارے، میں تو سن رہا ہوں، چبا رہی ہیں اور

پھن پھنا رہی ہیں، چبا رہی ہیں اور پھن پھنا رہی ہیں!،، وہ مجھ کو بھول کر زور سے چیختا اور ان دونوں کی آوازیں لڑ جاتیں۔ جیسے وہ بڑھیا کی چیخ کا آخری حصہ پکڑ کر اس کی کشش سے تیزی کے ساتھ گھر کی طرف جا رہا ہو۔ وہ اپنی گرجتی ہوئی آواز سے بڑھیا پر برس رہتا۔ رفتہ رفتہ ہم اس کی آواز کے عادی ہوتے گئے اور اس کی طرف ہماری توجہ نہیں رہی۔ جب وہ کہیں چند دن کے لئے چلا بھی جاتا اور چاروں طرف خاموشی چھا جاتی، کچھ عجیب سا معلوم ہونے لگتا جیسے کسی بات کی کمی ہے، تب بھی کوئی کھوکھلی سی آواز کانوں میں بجتی رہتی۔

اس کی بیوی بالاقد تھی، ہتھ ٹوٹنے سے اونچی اور بہت ہی دبلی پتلی بڑھیا۔ جب وہ گھر پر نہ ہوتا تو بڑھیا ماں کے پاس گپ لڑانے آجاتی۔ ہوتا یہ کہ وہ پنیر کا ایک چکہ یا پیالہ بھر مکئی کا آٹا یا پھر الاؤ کی آگ پر سکھائے ہوئے گوشت کا کوئی مہک‌دار ٹکڑا اپنے ساتھ لاتی۔ وہ شرما کر ہلکے سے ہنستی ہوئی کہتی کہ جو کچھ وہ لائی ہے اس کو چھپا لیا جائے اور خدا کے لئے اس کا شکریہ نہ ادا کیا جائے۔ بس یہ ہے کہ اس کے ہڑبونگ کرنے‌والے شوہر کو پتہ نہ چلے۔

وہ اور میری ماں گھنٹوں باتیں کرتی رہتیں اور ہتھ ٹوٹنے کی بیوی متواتر سگرٹ پر سگرٹ پھونکتی جاتی۔ اچانک ہتھ ٹوٹنے کی آواز گونجتی۔ وہ اپنے گھر کی طرف منہ کرکے کچھ چیختا اور

بڑھیا کے کان کھڑے ہو جاتے۔ وہ اس کی آواز پر خاموش ہنسی سے لرزنے لگتی جیسے وہ زور سے ہنستے ڈرتی ہو کہ کہیں ہتھ ٹوٹا اس کی آواز نہ سن لے اور اس کے لئے یہ بات بھی تفریح کی تھی کہ ہتھ ٹوٹا غلط سمت میں چیخ رہا تھا۔

''ارے، کیا ہے، میں یہاں ہوں!،، آخر میں وہ بھی چیختی۔

''اہا، مفت خورے مل گئے ایک دوسرے کو! تم دونوں لگیں بڑبڑ کرنے، باتونی کہیں کی!،، وہ ذرا وقفے کے بعد چیخا۔ غالباً اس وقفے کی وجہ یہ تھی کہ وہ بڑھیا کی اس دغابازی پر ایک لمحے کے لئے سکتے میں رہ گیا تھا۔

ایک دن وہ گھوڑے پر ہمارے پھاٹک تک آیا اور زور سے چیخ کر کہا کہ میں کوئی بورا لے آؤں۔ وہ زور زور سے مفت خوروں پر بگڑ رہا تھا کہ وہ سب کچھ چبا اور نگل جاتے ہیں جو ان کے لئے لایا جاتا ہے۔ اس نے آدھا بورا مکئی کے آٹے سے بھر دیا۔ وہ اب بھی گرج رہا تھا کہ اول تو وہ اپنی مکئی دیتا ہے، پھر اس کو پسوانے کے لئے اپنے ہی گھوڑے پر آٹا چکی لے جاتا ہے۔ اس نے اپنا بورا پھر کاٹھی میں باندھا اور چل پڑا لیکن پیچھے مڑکر زور زور سے کہتا رہا کہ بڑھیا سے آٹے کے بارے میں کچھ نہ کہا جائے۔ ویسے ہی اس کی چیخ پکار سے ہتھ ٹوٹے کی جان و بال ہے۔

وقت گذرتا گیا اور بظاہر ہتھ ٹوٹے کا مرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ ہتھ ٹوٹے کے مرنے کی مدت

جتنی ھی بڑھتی گئی اتنی ھی زیادہ اس کی بچھڑی تگڑی پڑتی گئی اور اسی مناسبت سے بچھڑی کا سابق مالک زیادہ غمگین ھوتا گیا۔ آخرکار اس نے ھتھ ٹوٹٹے کے پاس ایک آدمی بچھڑی کے بارے میں یاد دلانے کے لئے روانہ کیا یعنی کہ خدا کا شکر ھے کہ وہ ابھی زندہ ھے لیکن بچھڑی کو واپس کر دینا چاھئے کیونکہ وہ ھتھ ٹوٹٹے کو بطور تحفہ نہیں دی گئی تھی بلکہ وہ اچھے رشتےدار کی حیثیت سے بچھڑی اس کے فاتحے کے لئے لایا تھا۔

''لایا تھا انڈا اور لےجانا چاھتا ھے مرغی،، ھتھ ٹوٹٹے نے پیامبر کی بات سنکر جواب دیا۔ اس کے بعد اس نے ذرا سوچ کر کہا ''اس سے کہہ دینا کہ اگر میں جلد مرجاؤں تو وہ بغیر ھدئے کے ھی آ سکتا ھے اور اگر وہ پہلے مر جائیگا تو میں اس کے گھر آؤنگا اور اچھے رشتےدار کی طرح اس کی بچھڑی کی بچھڑی لاؤنگا۔،،

کہتے ھیں کہ رشتےدار ھتھ ٹوٹٹے کی شرائط جان کر اتنا ناراض ھوا کہ پیامبر سے بلا کسی اشارے کے صاف صاف کہلایا کہ اس کو اپنی بچھڑی کی کوئی بچھڑی نہ چاھئے، کہ وہ اپنی زندگی میں وہ بچھڑی واپس چاھتا ھے جو وہ اچھے رشتےدار کی حیثیت سے اس کے فاتحے میں ھنکا کر لے گیا تھا اور چونکہ ھتھ ٹوٹٹا ابھی تک نہیں مرا تھا اس لئے بچھڑی مالک کو واپس کر دینی چاھئے۔ اس صورت میں، اس نے قول دیا کہ اگرچہ اس کو ھتھ ٹوٹٹے کے گھر میں فیتے سے ناپ کر

ذلیل کیا گیا تھا پھر بھی اگر ھتھ ٹوٹنا واقعی مرگیا تو وہ پھر یہ بچھڑی لائے گا۔

''یہ آدمی اپنی بچھڑی کے ساتھ مجھے قبر میں لیٹنے کے لئے مجبور کر رہا ہے،، نئی شرط کو سن کر ھتھ ٹوٹنے نے کہا اور پھر اضافہ کیا ''اس سے کہہ دینا کہ اس کو زیادہ دن انتظار نہ کرنا پڑیگا۔ اس لئے اس بےچارے جانور کو کیوں پریشان کیا جائے۔،،

اس بات چیت کے چند دن بعد ھتھ ٹوٹنے نے اپنے خانہ باغ سے شفتالو کے دو پودے لیکر اپنی قبر پر لگا دئے۔ ممکن ہے کہ اس نے یہ اپنے فانی ہونے کے خیال کی تجدید کے لئے کیا ہو۔ میں نے اور یاشکا نے اس کی مدد کی۔ لیکن غالباً اس کو شفتالو کے دو پودے ناکافی معلوم ہوئے۔ چند دن بعد اس نے رات کو فارم کے باغ میں گھس کر تونگ کا ایک پیڑ کھود لیا اور دونوں شفتالو کے پودوں کے بیچ میں لگا دیا۔ اس کے بارے میں سبھی کو جلد ہی پتہ چل گیا۔ پنچائتی کسان ہنس ہنس کر آپس میں چرچا کرنے لگے کہ ھتھ ٹوٹنا مردوں کو تونگ کے پھلوں کے ذریعہ زہر دینا چاہتا ہے۔ کسی نے بھی اس حرکت کو کوئی اہمیت نہ دی کیونکہ کسی نے بھی نہ تو اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد تونگ کا پیڑ چرایا، وہ کسانوں کے کسی کام کا نہ تھا اور تونگ کے پھل تو مہلک طور پر زہریلے اور ایک حد تک خطرناک ہوتے ہیں۔

بچھڑی کا سابق مالک بھی خاموش ہو گیا۔ یا تو اس کو یقین ہو گیا کہ ہتھ ٹوٹا اپنی قبر پر تونگ کا پیڑ لگا کر موت کے قریب پہنچ گیا ہے یا پھر اس بوڑھے کی زبان سے ڈر کر جو تونگ کے پھل سے کچھ کم زہرآلود نہ تھی، اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔

برسبیل تذکرہ، بیان کیا جاتا ہے کہ نوجوانی میں اس کی زبان ہی نے اس کو ہتھ ٹوٹا بنا دیا تھا۔ یہ اس طرح ہوا۔

کہتے ہیں کہ کسی دعوت یا تقریب کے بعد مقامی نواب بہت سے مہمانوں سے گھرا ہوا صاحب خانہ کے صحن میں جلوہ فرما تھا۔ نواب اپنے چھوٹے قلم‌تراش سے جس میں چاندی کی زنجیر لگی تھی شفتالو چھیل کر کھا رہا تھا۔ اگرچہ اس قلم‌تراش اور اس سے منسلک چاندی کی زنجیر کا تعلق ان واقعات سے نہیں ہے جو بعد کو ہوئے لیکن اس قصے کے سارے بیان کرنے‌والوں نے اس چاقو کا ذکر ضرور کیا ہے اور اس کے ساتھ اس کا بھی برابر اضافہ کیا ہے کہ اس میں چاندی کی زنجیر تھی۔ اس واقعہ کو دوبارہ بیان کرتے وقت میں اس چاقو اور اس کی چاندی کی زنجیر کے ذکر سے پرہیز کرنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس کا ذکر کرنا چاہئے، کہ اس میں کچھ نہ کچھ سچ تو ہے ہی اور اس کے بغیر کوئی کمی رہ جائے گی۔ حالانکہ مجھے پتہ نہیں کہ کیا۔

مختصر یہ کہ نواب صاحب شفتالو کھا رہے تھے اور اطمینان سے اپنی عاشقانہ زندگی کو یاد کر رہے تھے۔ آخرکار انھوں نے صاحب خانے کے صحن کا جائزہ لیتے ہوئے آہ بھر کر کہا:

"اپنے زمانے میں میرے پاس اتنی عورتیں تھیں کہ وہ سب اس صحن میں نہ سماتیں۔"

کہتے ھیں کہ اپنی کم‌سنی کے باوجود اس زمانے میں بھی ھتھ ٹوٹتا کسی کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ چنانچہ وہ نہ جانے کہاں سے آکر کود پڑا اور بولا:

"ھاں، واقعی نہ جانے کتنی گدھیاں اس صحن میں رینگتی ھوتیں؟"

یہ کافی مسن نواب صنف‌نازک کے حسن کا بڑا قدرداں تھا۔ اور اس کے علاوہ، کہا جاتا ھے کہ اس کو اس بات پر بھی کچھ غرور تھا کہ وہ پھل کو اس طرح چھیل سکتا ھے کہ اس کے چھلکے کا فیتہ نہ ٹوٹے اور اس کا یہ ھنر بےخواب رات اور دیر تک مےخواری کے بعد بھی برقرار رھتا تھا۔ کہتے ھیں کہ چاھے جتنا گھور کر اس کو دیکھا جاتا یا اس کا دھیان ھٹانے کے لئے چاھے جو کچھ کیا جاتا وہ پھل چھیلنے میں ذرا بھی لغزش نہ کرتا۔ کبھی کبھی لوگ اس کو بہت ٹیڑھا میڑھا پھل دے کر اس کا امتحان لیتے لیکن وہ پھل کا ھر طرف سے جائزہ لیتا اور چاندی کی زنجیروالا اپنا قلم‌تراش نکالتا اور پھر ذرا بھی غلطی

کئے بغیر اپنے واحد اور صحیح راستے پر چالو ہو جاتا۔

اس طرح وہ پھل کے چھلکے کا ھار بنا کر عام طور پر حاضرین جلسہ کو دکھاتا اور اگر وھاں کوئی خوبصورت لڑکی ھوتی تو اس کو بلا کر یہ ھار اس کے کان میں لٹکا دیتا۔

مجھے ایسا لگتا ھے کہ ھتھ ٹوٹٹا نواب کے اس آرٹ کو ناپسند کرتا تھا۔ میرے خیال میں وہ اس کو بڑی دیر سے دیکھ رھا تھا اور اس کو یقین تھا کہ جلد یا بدیر پھل کا یہ فیتہ ٹوٹ جائیگا۔ ممکن ھے کہ اس نے کسی خاص شفتالو سے یہ توقع لگائی ھو لیکن نواب نے حسب معمول اپنا کارنامہ کامیابی سے دکھایا اور پھر اپنی عورتوں کے بارے میں ڈینگ مارنے لگا۔ آپ غالباً اتفاق کریں گے کہ وھاں کوئی نہ کوئی بات ایسی تھی جس نے ھتھ ٹوٹٹے کو جو ابھی نوجوان تھا بھڑکا دیا۔

کہا جاتا ھے کہ ھتھ ٹوٹٹے کے متذکرہ بالا غیرمتوقع جملے سے نواب سرخ ھوگیا اور خاموشی سے اس کو گھورنے لگا، اس کی آنکھیں نکلی پڑ رھی تھیں، اس کے دائیں ھاتھ میں چھلا اور رس سے بھرا شفتالو اب بھی تھا اور بائیں میں وھی چاندی کی زنجیروالا چاقو۔

ھر شخص کے منہ پر خوف نے مہرسکوت لگا دی تھی لیکن نواب ھتھ ٹوٹٹے کی طرف پلک مارے بغیر گھورے جا رھا تھا اور نواب کا وہ ھاتھ جس میں شفتالو تھا بےچینی سے ھوا میں حرکت

کررہا تھا جیسے اس کو شفتالو پکڑے رہنے میں
تکلیف محسوس ہو رہی ہے اور اس کے علاوہ
شفتالو کو ھاتھ میں پکڑ کر پستول نکالنا مشکل ہے
خصوصاً جب شفتالو چھلا ہوا ہو۔ کہتے ہیں کہ
اس کا ھاتھ شفتالو سے پیچھا چھڑانے کے لئے زمین
تک گیا لیکن آخری لمحے وہ ایسا نہ کرسکا۔ بہرحال
شفتالو تو چھیلا جا چکا تھا اور ایک اچھے تربیت یافتہ
نواب کے ھاتھ نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ اس کو
زمین پر نہیں رکھا جا سکتا۔ چنانچہ یہ ھاتھ پھر
اٹھا، ایک اذیت بھرے لمحے تک ہوا میں کسی
ان دیکھی پلیٹ کی تلاش کرتا اور یہ محسوس کرتا
رہا کہ کوئی نہ کوئی تو پلیٹ مہیا کرنے کا
احساس کریگا لیکن ہر شخص خوف سے اتنا شل تھا
کہ کسی ذہن میں یہ نہ آیا کہ وہ نواب کو
اس بدتمیز ننگے شفتالو سے نجات دلائے۔ چنانچہ
بیان کیا جاتا ہے کہ اس لمحے خود ھتھ ٹوٹے نے
نواب کی مدد کی۔

''منہ میں رکھ لو اسے!،، اس نے نواب کو بتایا۔

ابھی مہمانوں کو اتنا وقت بھی نہیں ملا تھا
کہ وہ اس نئی بدتمیزی سے سنبھالا لے سکیں کہ ان
کو نواب کی ناقابل بیان تذلیل بالذات کا منظر
دیکھنا پڑا۔ نواب شرمناک عجلت کے ساتھ رس بھرا
اور ٹپکتا ہوا شفتالو اپنے منہ میں بھرنے کی کوشش
کر رہا تھا لیکن نفرت بھری آنکھوں سے ھتھ ٹوٹے
کو گھورے جا رہا تھا۔ آخرکار اس نے شفتالو
سے کسی طرح نبٹا کر اپنا پستول ٹٹولا۔ وہ اب بھی

ہتھ ٹوٹٹے کو نکلی ہوئی، نفرت بھری آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اس نے اپنی پیٹی کے اطراف میں کچھ ٹٹولا لیکن انتہائی جوش اور غصے میں ہونے کی وجہ سے یا جیسا کہ دوسرے لوگوں نے بجا طور پر سمجھا کہ اس کے ہاتھ شفتالو کے رس سے چپکدار ہوگئے اور وہ اپنے پستول کے خانے کے بٹن نہ کھول سکا۔

شاید کسی کو ہوش آگیا ہوتا، شاید کوئی نواب کا ہاتھ روک لیتا یا بہرنوع ہتھ ٹوٹٹے کو کسی طرف ہٹا دیتا تاکہ اس پر گولی چلانا ممکن نہ ہوتا جو دوسروں کے لئے بھی خطرناک تھا لیکن ہوا یہ کہ خاموشی کو آخری بار شعبان کی آواز نے توڑا۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے بعد اس کی آواز کبھی نہیں سنائی دی۔ نہیں، اس کے برعکس وہ زیادہ اونچی اور حقارت آمیز ہوگئی۔ لیکن یہاں مطلب یہ ہے کہ شعبان ذیل کا جملہ کہنے کے بعد صرف شعبان نہیں رہا بلکہ شعبان ہتھ ٹوٹٹا ہوگیا۔

''وہاں تو وہ غالباً سب کچھ تیز کرتا ہے،، شعبان نے کہا ''کیونکہ ہماری گدھیاں...،،

کہتے ہیں کہ ہتھ ٹوٹٹا گدھیوں کے بارے میں اپنی بات ختم نہ کرسکا کیونکہ بوڑھے نواب نے بالآخر اپنے پستول کے خانے سے نبٹ لیا۔ گولی چلنے کی آواز ہوئی، عورتیں چیخ اٹھیں اور جب دھواں صاف ہوا تو ہتھ ٹوٹٹے کی قسمت کا لکھا پورا ہوچکا تھا یعنی وہ ہتھ ٹوٹٹا بن چکا تھا۔ بعد

کو جب اس سے پوچھا گیا کہ آخر پہلی بار نواب کی توہین کرنے کے بعد اس نے اپنے کچوکے جاری کیوں رکھے تو اس نے جواب دیا:

"پھر رکا نہ گیا۔"

بعد میں جب نواب منشویکوں سے مل گیا اور سوویت حکومت مختتم اور اٹل طور پر ہمارے علاقے میں قائم ہوگئی تو ہتھ ٹوٹے نے زور شور سے یہ کہنا شروع کردیا کہ اس کو نواب سے اپنا ایک جھگڑا چکانا تھا۔ کوئی چھاپہ ماروں کو قضیہ تھا اور یہ چھیڑ چھاڑ محض بہانہ یا دوسری زیادہ اہم باتوں کا شاخسانہ تھی۔

مختصر یہ کہ نواب کی گولی کے باوجود، ہتھ ٹوٹا سب پر اپنے مذاق کی بارش کرتا رہا اور اس کے مذاق کی کاٹ کم نہیں ہوئی۔

گاؤں میں گھومتے ہوئے میں اس کو اکثر تمباکو یا چائے کے کھیتوں میں یا پھر مکئی کے کھیتوں میں گھاس پھوس کی صفائی کرتے ہوئے دیکھتا۔ اگر وہ خوش ہوتا تو وہ طرح طرح کی مضحکہ انگیز باتیں کرتا جن سے اس کے چاروں طرف لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوجاتے۔

وہ جان پہچان کے لوگوں اور جانوروں کی آوازوں کی نقل خوب کر لیتا تھا خصوصاً مرغے کی ککڑوں کی۔

کبھی کبھی اپنی کدال زمین پر ڈال دیتا، کمر سیدھی کرتا اور چاروں طرف دیکھ کر زوردار ککڑوں کوں کی آواز بلند کردیتا۔ قریب کے گھروں

سے مرغ اس کی آواز کا فوراً جواب دیتے۔ اس کے اردگرد سب قہقہے لگاتے اور جب کوئی قریب والا مرغ اس کو پکارتا ہوتا، وہ اپنی کدال اٹھاتا اور کہتا:

''ارے، تو بڑا سمجھدار ہے، احمق کہیں کا۔''

ہمارے یہاں اور غالباً سب کہیں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرغوں کی ککڑوں کوں بامعنی ہوتی ہے اور وہ اپنے مالکوں کی تقدیر کی پیش بینی تک کرتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہتھ ٹوٹا مرغوں کا بھانڈا پھوڑتا تھا جو دیہاتی عالم الغیب سمجھے جاتے تھے۔ اور یہ بھی تھا کہ وہ اپنے سوکھے، ٹوٹے ہاتھ کے باوجود کام کے معاملے میں بھوت تھا۔ یہ سچ ہے کہ جب یہ خبر پھیلتی کہ کسی نئے قومی قرض کی اسکیم شروع ہو رہی ہے یا جو مرد باقی رہ گئے ہیں درخت کاٹنے کے لئے ان کی بھرتی ہو رہی ہے تو وہ اپنا بایاں ہاتھ ایک صاف سرخ پٹی میں ڈالکر پھرنے لگتا اور جب تک ضروری سمجھتا یہی صورت بنائے رہتا۔ میرے خیال میں یہ سرخ پٹی اس کی زیادہ مدد نہیں کرتی تھی خصوصاً قرض کی اسکیم کے سلسلے میں۔ پھر بھی بہانے پیش کرنے کے لئے ایک اور سہارا مل جاتا تھا۔

میرے خیال میں یہ سرخ پٹی وہ خود اپنے لئے استعمال کرتا تھا تاکہ اس کا بیکار ہاتھ کسی فوجی چھاپہ مار کا لگے۔ اگر اس کو فارم کے دفتر بلایا جاتا تو وہ فوراً اپنا ہاتھ پٹی میں ڈالتا اور گھوڑے پر سوار ہو کر جاتا۔ بھیڑ کی کھال

کا سیاہ اوورکوٹ کندھوں پر پڑا ہوا، سرخ پٹی میں ہاتھ اور گھوڑے پر سوار — اس طرح وہ سچ مچ فوجی چھاپہ‌مار لگتا تھا۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ اچانک یہ خبر پھیل گئی کہ دیہی سوویت کے صدر کو ہتھ ٹوٹے کے خلاف کوئی گمنام خط ملا ہے۔ اس خط میں کہا گیا تھا کہ تونگ کے پیڑ کو قبر پر لگانا اس نئی صنعتی پود کی توہین اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تونگ کے پیڑ زندہ پنچائتی کسانوں کے لئے بیکار ہیں اور ان کی صحیح جگہ گاؤں کا قبرستان ہے۔

دیہی سوویت کے صدر نے یہ خط پنچائتی فارم کے صدر کو دکھایا اور کہا جاتا ہے کہ وہ اس کو دیکھ کر واقعی ڈر گیا کیونکہ یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ اس نے، پنچائتی فارم کے صدر نے ہتھ ٹوٹے کو یہ سکھایا کہ وہ تونگ کا پیڑ اپنی قبر پر نصب کرے۔

اس وقت میں یہ کسی طرح نہ سمجھ سکا کہ آخر یہ سب اتنا خطرناک کیوں ہوگیا کیونکہ اس خط سے پہلے سبھی کو یہ معلوم تھا کہ اس نے اپنی قبر پر تونگ کا پیڑ لگایا ہے۔ میں اس وقت یہ نہیں جانتا تھا کہ خط مستند کاغذ ہوتا ہے اور اس کو پیش کرکے جواب طلب کیا جا سکتا ہے۔

یہ سچ ہے، بعض لوگ کہتے تھے، کہ دیہی سوویت کے صدر کے لئے اسے دوسروں کو دینا

ضروری نہ تھا لیکن وہ ہتھ ٹوٹے پر دانت لگائے تھا اور اسی وجہ سے اس نے یہ خط پنچائتی فارم کے صدر کو دکھایا۔

مختصر یہ کہ خط ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ گیا اور ایک دن اضلاعی مرکز سے کوئی آگیا تاکہ صحیح واقعہ کی جانچ کرے۔ کہتے ہیں کہ ہتھ ٹوٹے نے معاملے کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی لیکن یہ بات صاف تھی کہ وہ گھبرا گیا ہے کیونکہ بعد کو اس نے شیو کیا، اپنا ہاتھ سرخ پٹی میں ڈالا اور گاؤں بھر میں پھر کر ہاتھ کو اس طرح دیکھتا رہا جیسے اب وہ بم کی طرح پھٹ والا ہے اور اردگرد کے لوگوں کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ اس بم کے خطرناک ٹکڑوں سے بچیں۔

''اچھا، ہو گیا سب،، بوڑھے سائیس مصطفے نے کہا جو ہتھ ٹوٹے کا دوست اور مستقل مدمقابل تھا ''اب تونگ کے پھل بھرو اور اپنی قبر میں لیٹ جاؤ، نہیں تو تجھ کو سائبیریا بھیج دینگے۔،،

''سائبیریا سے میں نہیں ڈرتا۔ ڈر یہ ہے کہ تو میری قبر پر قبضہ جمالیگا،، ہتھ ٹوٹے نے جواب دیا۔

''کہتے ہیں کہ سائبیریا میں کتوں پر سواری کی جاتی ہے،، مصطفے نے اس کو ڈرانے کے لئے کہا ''تو کوئی لگام اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ ممکن ہے کوئی کتا اپنی سواری کے لئے سدھا سکو۔،،

ہتھ ٹوٹے اور مصطفے کے درمیان گھوڑوں اور گھوڑسواری کے بارے میں مدتوں سے رقابت

تھی ۔ ان میں سے ہر ایک کے اپنے کارنامے اور ناکامیاں تھیں ۔ ہتھ ٹوٹے نے ہزاروں آدمیوں کے بھرے مجمع میں گھڑدوڑ کے میدان سے ایک مشہور گھوڑا چرا کر نام پیدا کیا تھا ۔ اگرچہ مجھے شبہ ہے کہ وہاں ہزاروں آدمی تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ خود ہتھ ٹوٹا ایسے مریل گھوڑے پر سوار تھا اور خود بھی ایسا مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا کہ جب اس نے گھوڑے کے مالک سے اس بات کی اجازت چاہی کہ وہ اس کے گھوڑے کو ذرا چلا کر دیکھے تو محض مذاق کے لئے مالک نے اجازت دے دی ۔ اس کو یقین تھا کہ ایک منٹ کے اندر اس کا گھوڑا ہتھ ٹوٹے کو زمین پر پھینک دیگا اور اس طرح اور بھی شہرت حاصل کرے گا ۔

کہتے ہیں کہ ہتھ ٹوٹے نے ہچک کر اپنے مریل گھوڑے سے اترتے ہوئے اس کی لگام دوسرے گھوڑے کے مالک کو تھمائی اور کہا :

''یہ سمجھو کہ ہم نے تبادلہ کرلیا ۔ ،،

''اچھا،، مالک نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور لگام اس سے لے لی ۔

''بڑی بات یہ ہے کہ یہ پہلی ہی بار تم کو اپنی پیٹھ سے گرا نہ پائے ورنہ ٹاپوں سے کچل ڈالیگا،، ہتھ ٹوٹے نے اپنے مریل گھوڑے کے بارے میں انتباہ کیا اور عمدہ گھوڑے کی طرف چل پڑا ۔

''کوشش کرونگا،، مالک نے مزاحیہ انداز میں جواب دیا اور جیسے ہی ہتھ ٹوٹا عمدہ گھوڑے پر بیٹھا مالک نے پیچھے کھڑے ایک لڑکے کو

اشارہ کردیا اور اس نے گھوڑے کے ایک زوردار چابک رسید کردی۔

گھوڑا پچھلے پیروں پر کھڑا ہوگیا اور پھر دریائے کودور کی طرف بھاگا اور کہتے ہیں کہ پہلے تو ہتھ ٹوٹنا گھوڑے کو اس طرح پکڑے رہا جیسے کوئی بدمست شرابی گدھے کی سواری کے دوران کرتا ہے۔

ہر ایک کو یہ توقع تھی کہ وہ اب گرا اور تب گرا لیکن وہ آگے بڑھتا گیا اور مالک کا چہرہ فق ہوگیا جب گھوڑا گھڑدوڑ کے میدان کے سرے پر پہنچا اور مڑنے کے بجائے سیدھا دریا کی طرف فراٹے بھرتا چلا۔ چند منٹ اور انتظار ہوتا رہا۔ لوگوں نے سوچا کہ گھوڑا بےلگام ہو گیا ہے اور ہتھ ٹوٹنا اس کو موڑ نہیں پاتا لیکن بعد کو سمجھ میں آگیا کہ یہ گھوڑے کی چوری کی بےنظیر مثال ہے۔

پندرہ منٹ کے بعد اس کے پیچھے درجن بھر گھڑسوار دوڑ پڑے لیکن کچھ بھی نہ ہوسکا۔

ہتھ ٹوٹنا سیدھا پہاڑی سے دریا میں کود پڑا اور جب پیچھا کرنےوالے پہاڑی تک پہنچے تو وہ دوسرے کنارے پر تھا۔ ایک لمحے کے لئے دریا کے کنارے بید مجنوں کے جھنڈ میں گھوڑے کی بھیگی ہوئی دمچی چمکی۔ گولیاں ہر طرف پھیل گئیں لیکن نشانے تک نہ پہنچیں، اور کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ وہ سیدھا پہاڑی سے کود پڑے۔ اسی دن سے اس پہاڑی کا نام ہتھ ٹوٹنے کی پہاڑی

پڑ گیا۔ ھتھ ٹوٹٹے نے یہ قصہ میرے سامنے کبھی نہیں بیان کیا البتہ دوسروں کو بیان کرنے دیا۔ وہ اس کو بڑے شوق سے سنتا اور کچھ تصحیح بھی کرتا جاتا۔ اور اگر وہاں مصطفے قریب ہوتا تو اس کی طرف دیکھ کر آنکھ مارتا جاتا۔ اور مصطفے ایسا بن جاتا جیسے وہ کچھ نہیں سن رہا ھے لیکن بالآخر اس سے برداشت نہ ہوتا اور کسی نہ کسی طرح وہ اس کارنامے کو حقیر یا مضحکہ‌خیز بنانے کی کوشش کرتا۔

مصطفے کہتا کہ ایک ھاتھ کا آدمی تو ٹوٹا آدمی ھوتا ھی ھے اس لئے ھمت دکھا کر وہ کیا خطرہ مول لیتا ھے۔ اور اگر ھتھ‌ٹوٹٹا پہاڑی سے کودا تو اول ڈر کی وجہ سے اور پھر اس کے سوا وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا کیونکہ اگر پیچھا کرنےوالے اس کو پکڑ لیتے تو بہرحال گولی مار دیتے۔

مختصر یہ کہ ان دونوں میں مدتوں سے رقابت تھی۔ نوجوانی میں تو وہ اپنی بھڑاس گھڑدوڑوں کے دوران نکال لیتے تھے اور اب بڑھاپے میں، اگرچہ وہ گھوڑے رکھتے تھے لیکن اپنے جھگڑے زبانی طے کرتے تھے اور ان کے دوران وہ طرح طرح کے گورکھ دھندوں میں الجھ جاتے تھے۔

”اگر کوئی تم پر پہلو سے گولی چلاتا ھے اور مان لو کہ تم اس راستے پر جا رہے ھو تو گولی چلنے کی آواز پر تم کس طرف گھوڑا موڑوگے اور یہ بھی ھے کہ چاروں طرف کوئی درخت نہیں

ہے؟،، ان دونوں میں سے ایک سوال کر دیتا۔

''بتاؤ تم پہاڑ سے نیچے آرہے ہو اور کوئی تمہارا پیچھا کر رہا ہے، اور آگے دائیں طرف چھوٹا سا جنگل ہے اور بائیں طرف گھاٹی۔ تم گھوڑا کس طرف موڑو گے؟،، دوسرا پوچھتا۔

اس طرح کی بحثیں دونوں میں ہوتی رہتیں جب وہ اپنی کدالیں یا کلہاڑیاں کاندھوں پر رکھے، پورے دن کام کرنے کے بعد لوٹتے ہوتے۔ یہ بحثیں برسوں تک جاری رہیں اگرچہ گرد و نواح میں مدتوں سے گولی چلنے کے واقعات نہیں ہوئے تھے اور ان دونوں پر تو بالکل ہی نہیں، کیونکہ لوگوں نے ناراضگی کا بدلہ لینے کے ایسے طریقے سیکھ لئے تھے جو خطرناک نہ تھے۔ اور انہیں غیرخطرناک طریقوں میں سے وہ گمنام خط تھا جس کی طرف ہمیں واپس جانا چاہئے۔

اضلاعی مرکز سے آنے والے نے بڈھے سے یہ اگلوانے کی کوشش کی کہ تونگ کے پیڑ کو لگانے کا اصل مقصد کیا تھا اور بڑی بات یہ ہے کہ کس نے اس کو سکھایا پڑھایا تھا کہ وہ ایسا کرے۔ ہتھ ٹوٹے نے جواب میں کہا کہ اس کو کسی نے سکھایا پڑھایا نہ تھا اور وہ خود یہ چاہتا تھا کہ اس کی موت کے بعد اس کے سر پر تونگ کا سایہ ہو کیونکہ اس نے مدتوں ہوئے اس درخت کو پسند کرلیا تھا جو حال تک اس علاقے میں نایاب تھا۔ آنے والے نے اس کی بات کا یقین نہ کیا۔

تب جاکر ہتھ ٹوٹٹے نے قبولا کہ وہ نہ صرف
اس درخت کے پھلوں کی بلکہ جڑ کی زہریلی صفات
پر بھی بھروسہ کرتا تھا اور اس کو امید تھی
کہ اس کی جڑیں قبر کے سارے کیڑے مکوڑوں کو
ختم کر دینگی اور اس کا مطلب یہاں کتوں کی
کانیوں سے اور ان مرغیوں کے پسوؤں سے گڈمڈ
نہ کرنا چاہئے جو اس کو زیادہ پریشان نہیں کرتے
اور یہی صورت بھینسوں کی چچڑیوں کی ہے۔ اور
اگر اس کو کوئی پریشان کرتا ہے تو وہ گھوڑوں
کی مکھیاں ہیں اور وہ گرمی میں مٹھی دو مٹھی
سوپرفاسفیٹ گھوڑے کی دم کے نیچے لگا دیتا ہے
تو اس سے پنچائتی فارم کو کوئی نقصان نہیں
ہوتا اور گھوڑے کو مکھیوں سے آرام ملتا ہے۔
آنے والا سمجھ گیا کہ اس پہلو سے اس کی مطلب برآری
نہ ہوگی اس لئے وہ پھر تونگ کے پیڑ کی طرف
واپس ہوا۔

مختصر یہ کہ ہتھ ٹوٹٹے نے بات کو چاہے
جتنا گھمایا پھرایا مگر معاملے نے اس کے لئے خطرناک
صورت اختیار کرلی۔ دوسرے دن تو اس کو اضلاعی
مرکز کے کامریڈ کے سامنے طلب بھی نہیں کیا
گیا۔ ہر بات کے لئے تیار وہ دفتر کے صحن میں
شہتوت کے درخت کے زیر سایہ بیٹھا تھا اور اپنا
ہاتھ سرخ پٹی سے نہیں جدا کر رہا تھا۔ اپنی
قسمت کے فیصلے کے انتظار میں کش پر کش لگا
رہا تھا۔ پھر مصطفے آ گیا اور وہ سیدھا دفتر کے
اندر چلا گیا جہاں پنچائتی فارم کا صدر، دیہی

سوویت کا صدر اور اضلاعی مرکز سے آنے والا باہم مشورہ کررہے تھے۔ ہتھ ٹوٹٹے کے پاس سے گذرتے ہوئے مصطفے نے اس کی طرف دیکھ کر کہا:

"میں نے کچھ سوچا ہے، اگر اس سے کام نہ چلے گا تو تم چپکے سے اپنی قبر میں اسی طرح اپنی پٹی سمیت لیٹ جانا جیسے ہو اور تونگ کے کچھ پھل میں تمہارے اوپر ہلا کر گرا دونگا۔"

ہتھ ٹوٹٹے نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے صرف افسردگی سے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ وہ اپنے اوپر ہر طرح کی مصیبت لینے کو تیار ہے لیکن اس کا ہاتھ کیوں تکلیف برداشت کرے، وہ تو منشویک کی گولی کی اذیت برداشت کرچکا ہے۔

یہ بتا دوں کہ مقامی ذمے داران میں مصطفے کی بڑی عزت تھی اور اس کو پنچائتی فارم کا بہت ہی دانا آدمی خیال کیا جاتا تھا۔ اس کا گھر گاؤں میں سب سے بڑا اور خوبصورت تھا۔ اگر کوئی بڑا سرکاری آدمی آجاتا تو اس کو مصطفے کے مہمان نواز گھر بھیج دیا جاتا۔

مصطفے نے بڑی لاجواب ترکیب سوچی تھی۔ یہ اضلاعی مرکز سے آنے والا ابخازیہ کا تھا اور ابخازی خواہ وہ ملک حبش سے کیوں نہ آئے اس کو ابخازیہ میں رشتے دار ضرور مل جائیں گے۔

ہوا یہ کہ رات کو مصطفے نے خفیہ طور پر گاؤں کے سارے بوڑھوں کو جمع کرکے ان کی خاطر تواضع کی اور ان کی مدد سے اضلاعی مرکز کے

کامریڈ کے خاندان کے حالات معلوم کرلئے۔ احتیاط کے ساتھ ہمہ‌رخی تجزئے نے یہ بات صاف کردی کہ اضلاعی مرکز کا کامریڈ اپنی بڑی چچی کے رشتے سے، جو شہری لڑکی تھی لیکن اب میرخیول گاؤں میں رہتی تھی میرے چچا مقصود کا قریبی رشتےدار ھے۔ مصطفے کو اس تجزئے کے نتائج سے بڑا اطمینان ہوا۔

اس ترپ کو اپنی جیب میں رکھ کر وہ ھتھ ٹوٹٹے کے پاس سے گذرتا ھوا دفتر میں گھس گیا۔ کہتے ھیں کہ جب مصطفے نے اضلاعی مرکز کے کامریڈ کو اس بات سے مطلع کیا تو وہ زرد پڑ گیا اور لگا اس بات سے انکار کرنے کہ وہ میرخیول گاؤں کی بڑی چچی اور خصوصاً چچا مقصود سے کوئی رشتےداری رکھتا ھے۔ لیکن تیر نشانے پر لگا تھا۔ مصطفے اس کے انکار پر ذرا ھنس کر کہنے لگا:

''ارے، اگر وہ آپ کا رشتےدار نہیں ھے تو آپ زرد کیوں پڑگئے؟''

پھر مصطفے نے کچھ نہیں کہا اور اطمینان کے ساتھ دفتر سے نکل آیا۔

''کیا ھوگا؟'' ھتھ ٹوٹٹے نے مصطفے کو دیکھ کر پوچھا۔

''شام تک انتظار کرلو''، مصطفے نے جواب دیا۔

''جلدی فیصلہ کرلو''، ھتھ ٹوٹٹا بولا ''ورنہ میرا ھاتھ تو اس پٹی میں بالکل ھی شل ھو جائیگا۔''

''شام تک''، مصطفے نے پھر کہا اور وھاں سے چلا گیا۔

دراصل اضلاعی مرکز کے اس کامریڈ نے چچا مقصود کے ساتھ رشتے داری سے انکار کر کے ان کی انتہائی سخت توہین کی تھی لیکن چچا مقصود نے متحمل مزاجی سے کام لیا اور انہوں نے کسی سے ایک لفظ کہے بغیر اپنا گھوڑا کھینچا اور میرخیول گاؤں کو روانہ ہو گئے۔

چچا مقصود شام تک واپس آئے۔ ان کا گھوڑا پسینے سے تربتر تھا۔ انہوں نے دفتر کے سامنے اپنا گھوڑا روکا اور لگام ہتھ ٹوٹے کو تھما دی جو ابھی تک اپنی قسمت کے فیصلے کا منتظر تھا۔ صدر برآمدے میں کھڑا سگرٹ پی رہا تھا اور ہتھ ٹوٹے اور مناظر قدرت کا جائزہ لے رہا تھا۔

''آجاؤ،، صدر نے چچا مقصود کو دیکھ کر کہا۔

''ابھی آیا،، چچا مقصود نے جواب دیا اور زینوں پر چڑھنے سے پہلے اس نے ہتھ ٹوٹے کی سرخ پٹی ہاتھ سے نوچ کر خاموشی سے اسکی جیب میں رکھ دی۔

کہتے ہیں کہ ہتھ ٹوٹے کا ہاتھ اسی طرح ٹنگا کا ٹنگا رہ گیا جیسے وہ اس علامتی اشارے کو نہ سمجھ سکا ہو۔

چچا مقصود نے اضلاعی مرکز کے کامریڈ کے سامنے میرخیول کی بڑی چچی کی پیدائش کا زرد اور فرسودہ سرٹیفکٹ رکھ دیا جو انقلاب سے پہلے سوخوبی علاقے کے رجسٹرار کے دفتر نے جاری کیا تھا۔

کہتے ہیں کہ اس سرٹیفکٹ کو دیکھ کر

اضلاعی مرکز کا کامریڈ پھر زرد پڑگیا لیکن اس بار کسی بات سے انکار نہ کرسکا۔

''یا میں گھوڑے پر بٹھاکر تمھاری بڑی چچی کو یہاں لاؤں؟،، چچا مقصود نے پوچھا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے،، اضلاعی مرکز کے کامریڈ نے چپکے سے جواب دیا۔

''اپنا دفتری تھیلا ساتھ لے چلوگے یا یہاں تجوری میں رکھ جاؤگے؟،، پھر چچا مقصود نے پوچھا۔

''میں اپنے ساتھ لے جاؤنگا،، کامریڈ موصوف نے جواب دیا۔

''تو آؤ چلیں،، چچا مقصود نے کہا اور وہ دونوں دفتر سے چل پڑے۔

اس شام چچا مقصود کے یہاں نان و نمک کا انتظام ہوا اور سب نے ملکر دماغ لڑائے۔ دوسرے دن صبح کو چچا مقصود کے گھر میں ہی طویل بحث مباحثے کے بعد روسی — قفقازی — قانونی زبان میں ایک بیان مجھے ذاتی طور پر بولکر لکھوایا گیا۔

''آخرکار یہ طفیل خورا بھی کارآمد ثابت ہوا،، ہتھ ٹوٹے نے کہا جب میں نے دوات اپنے قریب کھسکائی اور جو کچھ بولا جانے والا تھا اس کو لکھنے کے لئے تیار ہوگیا۔

پنچائتی فارم کے رہنماؤں نے اس بیان پر اضلاعی مرکز کے کامریڈ کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا۔ ہتھ ٹوٹے نے اس کو بڑی توجہ سے سنا اور

مطالبہ کیا کہ ہر جملے کا ترجمہ ابخازی زبان میں کیا جائے۔ مزید برآں اس نے عبارت میں کئی ترمیمیں بھی پیش کیں جو اس کی معاشرتی اور کاروباری خوبیوں کو بڑھانے والی تھیں۔

اس جگہ پر زوروں کا مباحثہ ہوا جہاں اس کے ٹوٹے ہاتھ کی وضاحت کی گئی تھی۔ ہتھ ٹوٹے کا یہ مطالبہ تھا کہ یہ ضرور لکھا جائیگا کہ وہ ایک بھاڑے کے ٹٹو منشویک کی گولی کا شکار ہوا تھا کیونکہ جس نواب نے اسے زخمی کیا تھا وہ بعد میں منشویکوں کے ساتھ چلا گیا۔ اضلاعی مرکز کے کامریڈ نے اپنا سر پکڑلیا اور التجا کی کہ صحیح راستے پر قائم رہا جائے کیونکہ اسے بھی تو اپنے اوپروالے لوگوں کے سامنے جواب دینا ہے، اگرچہ وہ اپنے عزیزوں کی عزت کرتا ہے۔ آخرکار وہ ایسی عبارت تک پہنچے جس پر سبھی مطمئن تھے۔

یہ بیان اتنی دیر میں تخلیق کیا گیا کہ اپنی ٹیڑھی میڑھی طرز تحریر میں لکھتے ہوئے مجھے یہ زبانی یاد ہوگیا۔ اس کے خالقوں نے مجھ سے یہ فرمائش کی کہ میں اس کو زور سے پڑھ دوں جو میں نے بہت ہی مؤثر لہجے میں کیا۔ اس کے بعد وہ دو بارہ لکھنے کے لئے دیہی سوویت کے سکریٹری کو دیا گیا۔ بیان میں یہ کہا گیا تھا:

''بوڑھا شعبان لاربا ملقب بہ ہتھ ٹوٹا، جس نے یہ لقب انقلاب سے پہلے اس نواب کی گولی کے ذریعہ پایا تھا جو بعد کو منشویک کی گولی بن گئی، جزوی طور پر اپنے سوکھے ہاتھ (بائیں) کے باوجود

پنچائتی فارم کے پہلے دن سے بڑی سرگرمی کے ساتھ فارم پر کام کررہا ہے۔

''بوڑھا شعبان لاربا ملقب بہ ھتھ ٹوٹٹا، ایک بیٹا رکھتا ہے جو اس وقت حب وطنی کی جنگ میں محاذ پر برسرپیکار ہے اور اس کو سرکاری انعامات مل چکے ہیں (بریکٹ میں اس کے میدانی ڈاک خانے کا پتہ درج تھا)۔

''بوڑھا شعبان لاربا ملقب بہ ھتھ ٹوٹٹا، اپنی کبرسنی کے باوجود اس مشکل زمانے میں اپنے ھاتھ روکے بغیر متواتر پنچائتی فارم کے کھیتوں پر کام کررہا ہے اور اپنے متذکرہ بالا ھاتھ کا ذرا بھی خیال نہیں کرتا ہے۔ ہر سال وہ چار سو محنت کے دنوں سے کم کام نہیں کرتا۔

''پنچائتی فارم کا ادارہ معہ دیہی سوویت کے صدر کے اس کی تصدیق کرتا ہے کہ تونگ کا پیڑ اس نے اپنی نقلی قبر پر غلطی سے لگالیا کیونکہ وہ انقلاب سے پہلے کا کم پڑھا لکھا بوڑھا آدمی ہے۔ اس کے لئے اس پر پنچائتی فارم کے قواعد کے مطابق جرمانہ کیا جائیگا۔ پنچائتی فارم کا ادارہ تصدیق کرتا ہے کہ پنچائتی فارم کے باغ سے تونگ کے پیڑوں کا عام قبرستان میں لگایا جانا اور خصوصاً گھر کے ذاتی قطعۂ آراضی پر لگایا جانا بڑے پیمانے پر کبھی رائج نہیں رہا ہے اور اس واقعہ کی نوعیت انفرادی اور وجہ شعور کی کمی ہے۔

''پنچائتی فارم کا ادارہ تصدیق کرتا ہے کہ بوڑھا شعبان لاربا ملقب بہ ھتھ ٹوٹٹا نے کبھی بھی

پنچائتی فارم کے معاملات کو حقارت سے نہیں دیکھا ہے لیکن اپنی زندہ‌دلی اور ابخازی مرچ کی طرح تیز کردار کے مطابق کچھ افراد کا ضرور مذاق اڑایا ہے جو پنچائتی فارم کے کھیتوں پر مفت خوری کرتے ہیں اور جو واوین کے اندر وہاں ''ہیرو،، کہلاتے ہیں اور اپنے گھر کے قطعات آراضی پر بغیر واوین کے اگوا کار ہوتے ہیں۔ لیکن ہم ایسے ''ہیروؤں،، اور ''اگوا کاروں،، کو اپنے یہاں سے اکھاڑ کر پھینک رہے ہیں اور اس کو پنچائتی فارم کے قانون قاعدوں کے مطابق جاری رکھیں گے اور اس میں پنچائتی فارم سے اخراج اور گھریلو قطعات آراضی کی ضبطی تک ہوگی۔

''بوڑھا شعبان لاربا اپنی لوک خوبیوں کی وجہ سے مقامی مرغوں کی لاجواب نقل کرتا ہے اور اس طرح پرانے زمانے کے انتہائی مضرت رساں رسم و رواج کا بھانڈا پھوڑتا ہے اور اس کے ساتھ ہی کھیتوں کے کام میں گڑبڑ ڈالے بغیر پنچائتی کسانوں کے لئے تفریح کا سامان بھی کرتا ہے۔،،

اس بیان پر پنچائتی فارم اور دیہی سوویت کے صدروں نے دستخط کئے اور اس کو مہر بند کردیا گیا۔

جب یہ کام ختم ہوا تو مہمان برآمدے میں گئے جہاں ''ایزابیلا،، کے الوداعی گلاس نوش کئے گئے اور اضلاعی مرکز کے کامریڈ نے پنچائتی فارم کے ادارے کے ایک ممبر کے ذریعہ یہ اشارہ دیا کہ ہتھ ٹوٹے کو مرغے کی نقل کرتے ہوئے سننے

میں اس کو کوئی اعتراض نہ ہوگا اور ہتھ ٹوٹے سے اصرار کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر اتنے زور کی ککڑوں کوں کی بانگ لگائی کہ اڑوس پڑوس کے سارے مرغ بے لگام ہو گئے۔ صرف میزبان کا مرغ جس کی آنکھوں کے سامنے ہی یہ فریب کیا گیا تھا، پہلے تو اس بدتمیزی پر حیران سا کھڑا رہا پھر یکدم ایسا پھوٹ پڑا کہ اس کو صحن سے مکان کی باڑی میں ہنکانا پڑا کیونکہ اس کی ککڑوں کوں اضلاعی مرکز کے کامریڈ کے کانوں پر بار ہونے لگی اور ان کی بات چیت میں خلل انداز ہوئی۔

''اس کا اثر سارے مرغوں پر ہوتا ہے یا صرف مقامی مرغوں پر؟''، اضلاعی مرکز کے کامریڈ نے دریافت کیا جب مرغ کو ہنکایا جا چکا۔

''سب پر''، ہتھ ٹوٹے نے فوراً جواب دیا ''جہاں چاہیں آزما کر دیکھ سکتے ہیں۔''

''واقعی یہ تو بڑا فن ہے''، اس نے کہا۔ پھر سب چچا مقصود سے رخصت ہونے لگے جو ان لوگوں کو پھاٹک بلکہ کچھ اس سے آگے تک چھوڑنے گئے۔

اس بیان میں جو کچھ وعدہ کیا گیا تھا اس پر پنچائتی فارم کے صدر نے حرف بحرف عمل کیا۔ اس نے ہتھ ٹوٹے پر کام کے بیس دنوں کا جرمانہ کیا اور اس کے علاوہ یہ حکم دیا کہ تونگ کے پیڑ کو واپس لا کر باغ میں لگایا جائے اور قبر کو ہمیشہ کے لئے پاٹ دیا جائے تاکہ جانوروں

کو حادثات کا خطرہ نہ رہے۔ ہتھ ٹوٹے نے پھر توتنگ کے پیڑ کو کھودا اور باغ میں لگا دیا لیکن پیڑ یہ ساری مصیبتیں نہ برداشت کرسکا اور کافی عرصے تک سوکھا سا رہا۔

''میرے ہاتھ کی طرح،، ہتھ ٹوٹے نے کہا۔ اس نے اپنی قبر کو برقرار رکھا اور اس کے گرد کافی خوبصورت باڑ گھیر دی جس میں کنڈی دار دروازہ بھی لگا دیا۔

جب گمنام خط والا معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا تو ہتھ ٹوٹے کے رشتےدار نے پھر زور باندھا اور ایک شخص کے ذریعہ احتیاط کے ساتھ اس کو بچھڑی کی یاد دلائی۔

ہتھ ٹوٹے نے جواب دیا کہ اب اس کو بچھڑی کے بارے میں نہ پریشان کرنا چاہئے کیونکہ اس کی کافی توہین اور بدنامی ہو چکی اور اب وہ دن رات اپنے بدنام کرنےوالے کی تلاش میں مصروف ہے حتی کہ کام پر بھی بندوق لے کر جاتا ہے اور وہ اس وقت تک چین نہ لیگا جب تک اس کو پیوند زمین نہ کرلے اور وہ اس آدمی کو اپنی ذاتی قبر میں بھی دفن کرنے سے باک نہ کریگا بشرطیکہ وہ اس کی ناپ سے بڑا نہ نکلے۔ آخر میں اس نے یہ کہلوایا کہ اس کے رشتےدار کو گردوپیش کے لئے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے چاہئیں اور ذرا سے بھی شبہ پر اس کو ہتھ ٹوٹے کو اشارہ کر دینا چاہئے اور وہ اپنا کام کر گذرے گا۔ اور وہ اس مردانہ فریضے کی ادائیگی کے بعد بچھڑی کا

معاملہ اور دوسری چھوٹی چھوٹی غلط فہمیاں ختم کر سکے گا جو قریبی لوگوں کے معاملات میں قدرتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد یہ رشتے دار ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا، اس نے بچھڑی کو بالکل بھلا دیا اور کوشش کی کہ اس کی مڈبھیڑ ہتھ ٹوٹنے سے نہ ہو۔

پھر بھی ایک تقریب میں ان کا سامنا ہو ہی گیا۔ رات بڑھ چکی تھی اور ہتھ ٹوٹنے نے کافی چڑھالی تھی اور نشے کی حالت میں وہ گا رہا تھا اور گیت میں کچھ تبدیلیاں کرکے باربار یہی دھرا رہا تھا:

او، رائدا، سیوا رائدا، اے،
بچھڑی کے لئے بیچا اپنا رشتے دار...

اپنے رشتے دار کی طرف دیکھے بغیر وہ یہ گاتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا رشتے دار رفتہ رفتہ سنجیدہ ہو گیا اور آخرکار اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ چنانچہ اس نے میز کے پار ہتھ ٹوٹنے سے پوچھا:

''اس طرح تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''کچھ نہیں'' ہتھ ٹوٹنے نے جواب دیا اور اس کو اس طرح گھور کر دیکھا جیسے اس کی پیمائش کر رہا ہو ''میں تو گارہا ہوں، بس۔''

''ہاں، لیکن کیا عجیب ہے گیت تمھارا''، رشتے دار نے کہا۔

''ہمارے گاؤں میں''، ہتھ ٹوٹنے نے وضاحت کی ''آج کل سب اسی طرح گاتے ہیں سوائے ایک شخص کے...''

''کون شخص؟،، رشتےدار نے پوچھا۔
''بوجھو تو،، ہتھ ٹوٹے نے تجویز پیش کی۔
''میں پہیلیاں بوجھنا نہیں چاھتا،، رشتےدار نے ھاتھ جھٹک کر کہا۔
''اچھا، تو میں خود بتاتا ہوں،، ہتھ ٹوٹے نے دھمکی دی۔
''بتاؤ!،، رشتےدار نے للکارا۔
''دیہی سوویت کا صدر،، ہتھ ٹوٹے نے کہا۔
''وہ یہ گیت کیوں نہیں گاتا؟،، رشتےدار نے دھڑ سے سوال کردیا۔
''اس کو اشارےبازی کی اجازت نہیں ھے،، ہتھ ٹوٹے نے وضاحت کی۔
''تم ثابت کرسکتے ہو؟،، رشتےدار نے پوچھا۔
''ثابت نہیں کرسکتا، اسی لئے ابھی گاتا ھی ہوں،، ہتھ ٹوٹے نے کہا اور پھر رشتےدار پر اس طرح نظر ڈالی جیسے اس کی پیمائش کررھا ہو۔
اب ان کی طرف گھبرائے ہوئے صاحب‌خانہ کی توجہ گئی۔ اس کو ڈر ہوا کہ کہیں یہ لوگ اس کی تقریب نہ خراب کر دیں جو اس نے اپنے بیٹے کے سرخ پرچم کا آرڈر پانے کے موقع پر کی تھی۔
پھر گیت گونجا اور سب گانے لگے۔ ہتھ ٹوٹا بھی دوسروں کے ساتھ گا رھا تھا لیکن گیت میں اب کوئی خاص تبدیلی نہیں کی گئی کیونکہ اس نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ صاحب‌خانہ کی نگاہ اس پر ھے۔ لیکن بعد میں صاحب‌خانہ کے غافل ہوتے ھی ہتھ ٹوٹے نے گیت میں ایک جدت فرمائی:

او ، رائدا، سیوا رائدا، اے ،
پیارے کو باڑوں سے گھیرا...

لیکن صاحب‌خانے نے یہ گیت سن لیا اور اس نے ایک سینگ شراب سے بھرا اور ھتھ ٹوٹے کے پاس آیا۔

''ھتھ ٹوٹے!،، اس نے زور سے کہا ''آؤ ہمارے ان بیٹوں کی قسم کھاؤ جو ملک کی حفاظت کےلئے اپنا خون بہا رہے ھیں کہ تم اس میز کے پاس بیٹھ کر ہمیشہ ھمیشہ کےلئے صلح کر لوگے۔ ،،

''میں بچھڑی کے بارے میں بھول گیا ہوں،، رشتےدار نے کہا۔

''یہ تو تم کو مدتوں پہلے کرنا چاہئے تھا،، ھتھ ٹوٹے نے ٹکڑا لگایا اور پھر صاحب‌خانہ کی طرف مڑکر کہنے لگا ''اپنے بچوں کے لئے تو میں زمین تک چاٹنے کو تیار ہوں، جیسی آپ کی مرضی۔ آمین۔ ،،

اور پھر اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف تانا اور اس پورے لیٹروالے سینگ سے غٹاغٹ شراب پینے لگا۔ اس نے سینگ اپنے منہ سے نہیں ہٹائی اور زیادہ پیچھے کی طرف تنتا گیا۔ اس کو ساری آوازیں کورس میں ''ھرا ، ھرا ، ھرا ، ھر... ا... ا،، کرکے پورے سینگ ختم کرنے میں مدد دے رہی تھیں۔

پھر ساری میز کے اوپر گیت گونجا اور رشتےدار بےچینی سے اس کا منتظر تھا کہ ھتھ ٹوٹا گیت کے اس حصے کو کس طرح گائیگا جہاں اس میں تبدیلی کی جاسکتی ہے اور جب ھتھ ٹوٹے نے یوں گایا :

او، رائدا، سیوا راندا، اے،
ارے آگ سے گذرنے والے سورماؤ...

رشتے دار چند لمحوں تک سنتا رہا، اس نے ہر طرف سے گیت کے مطلب کے بارے میں سوچا اور آخرکار جب اس کے لئے یہ بات صاف ہوگئی کہ وہ کسی ایسے سورما سے ذرا بھی مشابہہ نہیں ہے جو آگ سے گذر رہا ہو تو وہ قطعی طور پر مطمئن ہو گیا اور سب کے ساتھ گانے لگا۔

خزاں میں ہم نے اپنے قطعۂ آراضی سے بڑی اچھی فصل حاصل کی اور مکئی، کدو، اخروٹ اور بہت بڑی مقدار میں خشک پھل لیکر شہر واپس ہوئے۔ اس کے علاوہ ہم نے بیس بوتل پھلوں کا شہد بیکمیز تیار کیا جس میں اس بار سیب استعمال کئے گئے تھے۔

بات یہ ہوئی کہ ہم نے محنتی جتھوں میں سے ایک کے کامدار سے یہ سمجھوتہ کر لیا کہ ہم ایک پرانے باغ کے سیب جمع کریں گے اور آدھی فصل پنچائتی فارم کو دینگے اور آدھی خود لے لیں گے۔

پنچائتی فارم میں کام کرنے والے کافی نہ تھے اور کوئی سیب جمع کرنے والا نہ تھا کیونکہ سب لوگ خاص کاشت یعنی چائے، تمباکو اور تونگ کی کاشت میں لگے تھے۔

سیب جمع کرنے کی اجازت پاکر اماں نے مزدور بٹالین کے تین فوجیوں سے سمجھوتہ کیا کہ وہ ہمیں سیب چننے، ان کو کچلنے اور ان سے بیکمیز تیار

کرنے میں مدد دیں گے اور ہماری آدھی فصل میں سے آدھا حصہ پائیں گے۔

ایک ہفتے میں یہ کام بہت عمدہ طریقے سے کر لیا گیا۔ ہم نے گاڑھے، سنہرے بیکمیز کے بیس بوتل خالص نفع میں پائے جو آئندہ موسم سرما بھر ہمارے لئے بطور شکر کام آئے۔

اس طرح کاروبار میں ہم ایک شاندار سبق دیکر پنچائتی فارم سے رخصت ہوئے اور ہتھ ٹوٹنے کی آواز کہیں دور پیچھے ہی رہ گئی۔

* * *

بہت برسوں بعد میں شکار کے سلسلے میں پھر اس گاؤں پہنچ گیا۔

میں کسی گزرنے والی موٹر لاری کے انتظار میں پنچائتی فارم کے دفتر کے سامنے اسی پرانے شہتوت کے درخت کے سائے میں کھڑا تھا۔ یہ اگست کا گرم دن تھا۔ میں اسکول کی خالی عمارت اور سرسبز گھاس سے ڈھکے ہوئے صحن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ گھاس پہلی جیسی لگ رہی تھی۔ یوکلپٹس کے وہ درخت جو ہم نے خود کبھی لگائے تھے، جمناسٹک کی وہ پرانی سلاخ جس کی طرف ہم سبقوں کے وقفوں کے دوران جھپٹتے تھے، سب میری نگاہوں کے سامنے تھے اور روایتی افسوس کے جذبات کے ساتھ گزرے ہوئے برسوں کی مہک میں سانس لے رہا تھا۔

ادھر سے اکادکا گزرنے والے دیہات کے دستور کے مطابق مجھ سے صاحب سلامت کر رہے تھے

اگرچہ ہم ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ دفتر سے ایک لڑکی شیشے کی دو صراحیاں لیکر نکلی، آہستہ آہستہ اس نے ڈول کنوئیں میں ڈالکر پانی بھرا اور ڈول کو باہر رساں رساں کھینچ کر صراحیوں میں پانی انڈیلنے لگی جو کنوئیں کے کاٹھ پر رکھی تھیں۔ وہ ایک ساتھ دونوں صراحیوں کو بھر رہی تھی اور ان کے اوپر پانی اس طرح اچھال رہی تھی جیسے اس کو پانی کی ٹھنڈک سے لطف آرہا ہو۔ پھر اس نے بچا ہوا پانی گھاس پر انڈیل دیا اور بھیگی ہوئی صراحیاں لیکر دفتر واپس گئی۔

جب وہ زینوں پر چڑھکر دروازے سے اندر گئی تو اس کے خیرمقدم میں اندر آوازوں کی جو لہر اٹھی وہ مجھ تک پہنچی اور پھر ختم ہوگئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ کبھی پہلے کی بات ہے۔

ایک نوجوان زنگ آلود چرخ چوں کرتی سائیکل پر سوار میرے پاس سے گذرا۔ وہ کوٹ پہنے تھا اور اس کی پتلون کا ایک پائنچا اوپر کو چڑھا تھا۔ نوجوان کچھ سوچتا ہوا میری طرف مڑا اور پاس آکر مجھ سے سگرٹ مانگی۔

اس کی سائیکل کے کیریر میں دو بڑی ڈبل روٹیاں بندھی تھیں۔ میں نے اس کو سگرٹ دی اور اس سے پوچھا کہ آیا وہ ہتھ ٹوٹڑے کے پوتے یاشکا کو جانتا ہے۔

''کیوں نہیں!،، اس نے جواب دیا ''پوسٹ مین۔ یاشکا۔ یہیں ٹھہرو وہ جلد ہی اپنی موٹرسائیکل پر ادھر سے گذرے گا۔،،

میں کھڑا سڑک کی طرف تکتا رہا اور واقعی جلد ہی مجھے موٹرسائیکل کی آواز سنائی دی ۔ میں نے یاشکا کو محض اس لئے پہچان لیا کیونکہ اس کا منتظر تھا ۔ اپنی ہلکی موٹر سائیکل پر وہ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی دیو بچوں کی سائیکل پر ۔

''یاشکا!،، میں نے ھانک لگائی ۔ اس نے میری طرف دیکھا اور گھبرا کر موٹر سائیکل روک لی ۔ پھر اس نے موٹرسائیکل کو زمین کی طرف دبایا اور اس کا انجن بالکل رک گیا ۔

یاشکا نے موٹرسائیکل کو اپنے نیچے سے نکالا اور ہم سڑک سے پرے مڑ گئے ۔ پندرہ منٹ بعد ہم فرن کی گھنی اور سایہ‌دار جھاڑیوں میں لیٹے تھے ۔

ایک بڑا، موٹا تازہ آدمی جس کے چہرے پر پھیکی سی مسکراھٹ تھی میرے برابر لیٹا تھا ۔ وہ اب بھی اسی یاشکا جیسا تھا جو اپنے دادا کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ کر حیرت سے اپنے چاروں طرف دیکھتا رہتا تھا ۔ معلوم ھوا کہ وہ تھوڑے دن پہلے تک پنچائتی فارم کے کامداروں میں سے تھا، پھر وہ کہیں کھسک گیا اور اب اس کو ڈاکئے کی ملازمت دی گئی ۔ اس نے مجھے یہ سب اپنی اسی پھیکی مسکراھٹ کے ساتھ بتایا ۔ اسکول ھی میں یہ بات صاف ھو گئی تھی کہ شہرت کی طلب اس کی کمزوری نہ تھی ۔

معلوم ھوتا تھا کہ اس کے دادا نے سارا خاندانی غصہ اور تاؤ خود ھی خرچ کر ڈالا تھا اور یاشکا کے لئے کچھ نہیں چھوڑا تھا اور ممکن ھے کہ اس نے اس کو اپنے اوپر اس لئے خرچ کر ڈالا ھو

تا کہ یاشکا کے پاس غصہ کرنے کو کچھ رہ ہی نہ جائے ۔ کامدار ہو یا ڈاکیہ، یاشکا کےلئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا ۔ بہرنوع اس کی آواز ویسے ہی بھاری اور زوردار تھی جیسی دادا کی لیکن اس میں وہ زبردست جھکولے نہ تھے ۔ قدرتی بات تھی کہ میں نے اس سے دادا کے بارے میں پوچھا ۔

''ارے ، تم نے کچھ بھی نہیں سنا؟،، یاشکا نے حیرت سے پوچھا اور اپنی بڑی بڑی گول آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا ۔

''ارے، کیا؟،، میں نے پوچھا ۔

''سب یہ قصہ جانتے ہیں، اور تم کہاں تھے؟،،

''میں ماسکو میں تھا،، میں نے جواب دیا ۔

''اچھا، اس کا یہ مطلب ہے کہ ماسکو تک نہیں پہنچا،، یاشکا نے جملے کو کھینچتے ہوئے کہا جیسے وہ ابخازیہ اور ماسکو کے درمیان فاصلے کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہو ۔ اگر یہ قصہ وہاں تک نہیں پہنچا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ماسکو کو بہت دور ہونا چاہئے ۔

یاشکا نے فرن کی ٹہنیاں توڑ کر اپنے نیچے ڈالیں اور اپنے ڈاکئے والے تھیلے پر آرام سے سر ٹکا کر اپنے انتھک دادا کے آخری کارنامے کے بارے میں بتانے لگا ۔ اس کے بعد میں نے یہ کہانی کئی بار دوسروں سے بھی سنی ۔ لیکن پہلی بار تو مجھے یاشکا نے ہی سنائی ۔

میں ابھی دل ہی دل میں ہتھ ٹوٹے کی آخری اور زبردست پرواز خیال کی داد دے رہا تھا کہ اچانک...

یاشکا نے اٹھے بغیر اور اپنی کہانی کے بعد ذرا وقفہ دئے بغیر ''ژوژونا، ژوژونا!،، کی ھانکیں لگانا شروع کر دیں۔

''ارے، کیا ھے؟،، کہیں سے ایک لڑکی کی آواز آئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ فرن کی جھاڑیوں کے پیچھے بیچ کے درختوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ تھا۔ درختوں کے درمیان سے میں نے ایک باڑ اور اس کے پار مکئی کا کھیت دیکھا۔ آواز وھاں سے آئی تھی۔

''خط ھے، ژوژونا! خط!،، یاشکا نے پھر زور سے کہا اور میری طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔

''ویسے ھی کہہ رھے ھو؟،، میں نے پوچھا۔

یاشکا نے خوشی سے سر ھلادیا اور پھر سننے لگا۔ خاموش ٹڈے پھر چڑچڑانے لگے۔

''دھوکے باز کہیں کا!،، آخرکار لڑکی کی آواز آئی اور میں نے محسوس کیا کہ ھرنی ڈاکئے کے پھندے میں آچکی ھے۔

''جلدی کرو، ژوژونا، میں چلا، ژوژونا!،، یاشکا نے پرمسرت لہجے میں کہا۔ وہ اپنی آواز پر ورنہ لڑکی کے نام پر مست ھو رھا تھا۔

میری سمجھ میں آیا کہ اب مجھے چل دینا چاھئے اور میں یاشکا سے رخصت ھونے لگا۔ اپنے کان دوسری طرف لگائے رکھ کر یاشکا مجھ سے اصرار کررھا تھا کہ میں رات بھر ٹھہر جاؤں لیکن میں نے انکار کر دیا کیونکہ اول تو مجھے جلدی تھی، دوسرے یہ میرے اپنے اقربا کی توھین ھوتی جن سے میں نہیں ملا

تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر یہاں رات کو ٹھہر گیا تو سارا شکار خاک میں مل جائے گا کیونکہ پھر دو دن تو سنبھلتے سنبھلتے لگیں گے۔

پگڈنڈی سے سڑک پر آتے ہوئے میں نے پھر لڑکی کی آواز سنی۔ اب وہ زیادہ صاف تھی۔

"... کس کا ہے یہ بتا دو۔ تب آؤنگی،، اس نے چلا کر کہا۔

"... پہلے آجاؤ، تب بتاؤنگا۔ ژوژونا، ژوژونا!،،

یہ التجا اگست کی گرم فضا میں آخری بار گونجی اور میں ہلکی سی افسردگی بلکہ صاف یہ ہے رشک محسوس کرتا ہوا گاؤں کی خالی سڑک پر آ گیا۔

میں نے سوچا کم از کم ہتھ ٹوٹے کی روایات نہیں ختم ہورہی ہیں۔ میں آدھ گھنٹے میں بہت آگے جاچکا تھا اور تب سے وہاں نہیں گیا۔ بہرحال امید کرتا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح اپنے لوگوں سے ملنے وہاں جاؤنگا چاہے اسی لئے کیوں نہ ہو کہ یہ معلوم کروں کہ آخرکار یاشکا کے ژوژونا پر اس طرح شور کرنے کا نتیجہ کیا ہوا۔

* * *

میں ہتھ ٹوٹے کے آخری کارنامے کے بارے میں آپ کو اس طرح بتا ہی دوں جس طرح وہ میرے سر میں بھرا ہوا ہے۔

ہتھ ٹوٹا جنگ کے خاتمے تک مزے میں زندہ رہا، محاذ سے اپنے بیٹے کی واپسی دیکھی اور آخر تک

اچھی زندگی گذاری ۔ لیکن کوئی ایک سال پہلے اس کی موت کا وقت آگیا اور اس بار واقعی آیا ۔

اس دن بھی وہ حسب معمول اپنے گھر کے برآمدے میں لیٹا اپنے صحن کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں اس کا گھوڑا چر رہا تھا ۔ اس وقت مصطفے گھوڑے پر سوار اس کے پاس آیا ۔ وہ گھوڑے سے اتر کر برآمدے میں آ گیا ۔ اس کے لئے کرسی آگئی اور وہ ہتھ ٹوٹے کے برابر بیٹھ گیا ۔ حسب معمول وہ ماضی کو یاد کرنے لگے ۔ ہتھ ٹوٹا ایک لمحے کے لئے گم رہ جاتا یا اونگھ جاتا لیکن ہر مرتبہ چونکنے کے بعد وہ بات کو وہیں سے جاری کر دیتا جہاں اس نے چھوڑی تھی ۔

''ہاں، تو تم سچ مچ ہم لوگوں کو چھوڑ رہے ہو ؟،، مصطفے نے اپنے دوست اور مدمقابل کو تیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے پوچھا ۔

''سچ مچ،، ہتھ ٹوٹے نے جواب دیا ''اب میں دوسری دنیا کے گھوڑے دوسری دنیا کے دریاؤں میں نہلاؤں گا...،،

''ہم سب کو وہیں جانا ہے،، مصطفے نے آہ بھر کر اخلاق سے کہا ''لیکن میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ تم ہی پہل کروگے...،،

''ارے، تو تم گھڑ دوڑوں میں بھی نہیں سوچتے تھے کہ میں اول ہونگا،، ہتھ ٹوٹے نے یہ بات اتنی صاف کہی کہ ان رشتے داروں نے جو اس کے قریب اس کی دیکھ بھال کررہے تھے سن لی اور ہلکے سے ہنسے بھی، البتہ انہوں نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی

ہنسی چھپائی کیونکہ مرتے ہوئے آدمی کے قریب خواہ مرنے والا ہتھ ٹوٹتا ہی کیوں نہ ہو ہنسنا مناسب نہ تھا۔

مصطفے کو اس کی بات ناگوار ہوئی لیکن مرنے والے سے دلیلیں ملانا بداخلاقی ہوتی۔ پھر بھی اگر مرنے والا زندہ آدمی پر ہنستا ہے تو یہ خاص طور سے ناگواری کا باعث ہوتا ہے کیونکہ اس کا یہ مطلب ہوا کہ زندہ آدمی اس سے زیادہ بری یا افسوسناک حالت میں ہے بلکہ اس سے بدتر۔

بحث مباحثہ کرنا واقعی بداخلاقی ہوتی لیکن کچھ تو کہا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مصطفے نے کہا:

''اب تم اس راستے پر جا ہی رہے ہو تو میں تمھیں کچھ نہ کچھ بتا ہی دوں،، اس نے ہتھ ٹوٹے پر جھک کر کہا۔

''اگر ضروری ہے تو ضرور کہو،، ہتھ ٹوٹے نے جواب دیا لیکن وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ اس کی آنکھیں اپنے صحن کی طرف تھیں جہاں اس کا گھوڑا چر رہا تھا۔ جو کچھ وقت اس کے پاس باقی رہ گیا تھا اس میں اپنے گھوڑے ہی کو دیکھنا اس کے لئے دلچسپ تھا۔

''ناراض نہ ہونا، بھائی ہتھ ٹوٹے، پچھلی بار میں نے ہی پنچائتی فارم کو ٹیلیفون کر کے لوگوں کو بتایا تھا کہ تم گذر گئے،، مصطفے نے کہا جیسے اس کو یہ افسوس ہو کہ اب اس وقت کی طرح حالات اس کو یہ اجازت نہیں دیتے کہ وہ پھر اس جھوٹی افواہ کو پھیلا سکے۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ بات اچھی طرح

سمجھ لی جائے کہ اپنی اس حرکت پر اس کو سچے دوست کی حیثیت سے افسوس ھے۔

''تم نے یہ کیسے کیا تھا جب لوگ تم سے روسی بول رہے تھے؟،، ھتھ ٹوٹٹے نے حیرت سے کہا اور اس کی طرف دیکھا۔

مصطفے روسی زبان نہیں جانتا تھا اور اپنی انتظامی قابلیت کے باوجود ایسا ان پڑھ تھا کہ اس کو خود اپنے حروف تہجی ایجاد کرنے پڑے تھے یا خود اپنی علامتوں والی زبان استعمال کرنی پڑتی تھی جس کی مدد سے وہ اپنے تمام مقروضوں کے نام نوٹ رکھتا تھا اور بہت ھی پیچیدہ اور تہہ بہ تہہ لین دین کا حساب بھی۔ اسی لئے ھتھ ٹوٹٹے کو قدرتی طور پر یہ سن کر تعجب ھوا کہ اس نے ٹیلی فون پر بات کی اور وہ بھی روسی میں۔

''شہر میں اپنے بھتیجے کے ذریعہ، میں اس کے پاس کھڑا تھا،، مصطفے نے وضاحت کی ''چونکہ تم کو صحت یاب کیا جاچکا تھا اس لئے میں نے سوچا کہ مذاق ھو جائے اور اس کے بغیر موٹر ٹرک کون بھیجتا،، مصطفے نے اپنی بات میں اس زمانے کی مشکلات کو یاد کرتے ھوئے اضافہ کیا۔

کہتے ھیں کہ ھتھ ٹوٹٹے نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دیر تک چپ رھا۔ پھر اس نے آھستہ آھستہ کھولیں اور مصطفے کی طرف دیکھے بغیر کہا :

''اب مجھے پتہ چلا کہ تم مجھ سے اچھے گھڑسوار ھو۔،،

''معلوم تو یہی ھوتا ھے،، مصطفے نے خاکساری

سے تسلیم کر لیا۔ اور ان لوگوں کی طرف دیکھا جو مرنے والے کے قریب اس کی خدمت کر رہے تھے۔

لیکن یہاں پہنچ کر قریبی اعزہ سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ پھوٹ کر رونے لگے کیونکہ زندگی میں پہلی بار ھتھ ٹوٹٹے نے اپنی ھارمانی تھی اور یہ بات موت سے زیادہ مشابہہ تھی بمقابلہ اس موت کے جو قریب تھی۔

ھتھ ٹوٹٹے نے ان کو خاموش کیا اور گھوڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''پانی پلاؤ، گھوڑے پیاسے ھیں۔''

ایک لڑکی بالٹیاں لیکر پانی لینے چلی۔ لڑکی چشمے کا پانی لیکر آئی اور بالٹیوں کو بیچ صحن میں رکھدیا۔ ھتھ ٹوٹٹے کا گھوڑا ایک بالٹی کے قریب آ کر پانی پینے لگا لیکن مصطفے کا گھوڑا سر موڑ کر اپنی لگام کھینچنے لگا۔ لڑکی نے اس کی باگ کھولی اور اس کو پکڑے اس وقت تک کھڑی رہی جب تک اس نے پانی نہیں پیا۔ گھوڑے گردنیں بڑھا کر خاموشی سے پانی پی رہے تھے اور ھتھ ٹوٹٹا ان کو خوشی سے دیکھ رہا تھا اور اس کے گلے کا کنٹھ اس طرح حرکت کر رہا تھا جیسے وہ خود پانی پی رہا ہو۔

''مصطفے،، آخرکار اس نے اپنے دوست کی طرف گھومتے ہوئے کہا ''اب میں مانتا ھوں کہ تم گھوڑوں کے بارے میں مجھ سے بہتر جانکاری رکھتے تھے لیکن تم یہ تو جانتے ہو کہ مجھے گھوڑوں سے محبت تھی اور ان کے بارے میں میں بھی کچھ نہ کچھ سمجھتا تھا۔''

''ارے، کیسے، یہ کون نہیں جانتا!،، مصطفے نے بڑی فراخدلی سے اونچی آواز میں کہا اور برآمدے میں موجود لوگوں پر نظر ڈالی۔

''میں چند دن میں مر جاؤنگا،، ھتھ ٹوٹٹے نے اپنی بات جاری رکھی ''میرا جنازہ اس جگہ رکھا جائیگا جہاں اب خالی بالٹیاں رکھی ھیں۔ جب رونا پیٹنا ختم ھو جائے تو میرے لئے ایک کام کرنا...،،

''کیا کرنا ھے؟،، مصطفے نے پوچھا اور اقربا کو ھش کی آواز سے خاموش رھنے کے لئے کہتے ھوئے جو پھر سسکیاں بھرنے کی کوشش کررھے تھے وہ ھتھ ٹوٹٹے پر جھک گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ھتھ ٹوٹٹا اپنی آخری وصیت کرنےوالا ھے۔

''میں تم سے یہ التجا کرتا ھوں کہ تم اپنے گھوڑے پر سوار ھوکر میرے جنازے پر سے تین بار کود جانا۔ تابوت کا ڈھکن بند ھونے سے پہلے میں چاھتا ھوں کہ اپنے اوپر گھوڑے کی سانس سن سکوں۔ تم یہ کروگے نا؟،،

''کرونگا، اگر ھمارے رسم و رواج کے لحاظ سے یہ گناہ نہیں ھے،، مصطفے نے وعدہ کیا۔

''میرے خیال میں ایسا نہیں ھے،، ھتھ ٹوٹٹے نے زیادہ آھستہ سے کہا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ یا تو سو گیا تھا یا کچھ سوچ رھا تھا۔

مصطفے اٹھا اور خاموشی کے ساتھ برآمدے سے نیچے اتر گیا۔ وہ مرنےوالے کی آخری تمنا کے بارے میں سوچتا ھوا چلا گیا۔

اس شام کو مصطفے نے اسی غرض سے گاؤں کے سارے بڑے بوڑھوں کو جمع کیا اور سب کی خاطر

مدارات کرکے ہتھ ٹوٹٹے کی درخواست کے بارے میں بتایا۔ بزرگوں نے آپس میں مشورہ کرکے اپنا فیصلہ سنایا:

''اگر مرنےوالے کی یہی تمنا ہے تو کودو کیونکہ اب تو تم سب سے اچھے گھڑسوار ہو۔''

''اس کو تو ہتھ ٹوٹٹے نے خود مانا ہے''، مصطفے نے اضافہ کیا۔

''اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کیونکہ گھوڑا گوشت نہیں کھاتا اور اس کی سانس صاف ہوتی ہے''، انہوں نے یہ حکم لگایا۔

کہتے ہیں کہ اسی رات ہتھ ٹوٹٹے کو بزرگوں کے فیصلے کا پتہ چل گیا اور وہ خوش ہوا۔ دو دن بعد اس کا انتقال ہوگیا۔

پڑوسی گاؤں کو پھر ہرکارے بھیجے گئے جیسا کہ جنگ کے زمانے میں کیا گیا تھا۔ بعض لوگوں نے اس کی موت کی خبر پر یقین ہی نہیں کیا اور اس رشتےدار نے جو پچھلی بار بچھڑی لیکر آیا تھا یہ تک کہا کہ اس کے بدن میں چھڑی کا نوکیلا حصہ کچوکر یہ دیکھ لیا جائے کہ آیا وہ واقعی مر گیا ہے یا پچھلی مرتبہ کی طرح خواہمخواہ کا درد سر پیدا کر رہا ہے۔

''کچوکا لگانے کی ضرورت نہیں ہے''، ہرکارے نے کہا ''کیونکہ اس کے اوپر سے گھڑسوار مصطفے کودیگا۔ مرنےوالے نے زندگی میں یہی کہا تھا۔''

''اچھا، تب جانا ٹھیک رہےگا''، رشتےدار نے اطمینان سے کہا ''کیونکہ زندہ ہتھ ٹوٹٹا اپنے اوپر سے کسی کو کودنے کی اجازت نہ دیتا۔''

کہا جاتا ہے کہ ہتھ ٹوٹے کی تجہیزوتکفین میں اس بار زیادہ لوگ جمع ہوئے بمقابلہ پہلے کے جب اس کی موت میں کسی کو شبہ نہ تھا۔ بہت سے لوگ تو اس کے جنازے پر سے چھلانگ ہی دیکھنے کے لئے آگئے تھے۔ سبھوں کو معلوم تھا کہ دونوں دوستوں میں کتنی لاگ ڈاٹ رہتی تھی۔ لوگ کہنے لگے کہ ہتھ ٹوٹے نے مردہ حالت میں بھی معاملے کو یونہی نہیں چھوڑا۔

بعد میں بعض لوگ یہ کہنے لگے کہ انہوں نے خود دیکھا ہے کہ مصطفے اپنے صحن میں مشق کر رہا تھا۔ اس نے اسٹول پر طشت رکھا تھا اور اس کے اوپر سے گھوڑا کدا رہا تھا۔ لیکن مصطفے نے اس طیش کے ساتھ جو خود ہتھ ٹوٹے کو زیب دیتا تھا اس سے انکار کیا کہ وہ اسٹول اور طشت کے ذریعہ مشق کررہا تھا۔ اس نے کہا کہ اس کا گھوڑا تو بےساختہ پھاٹک کے پار چھلانگ لگا جاتا ہے، اس طرح کہ اگر ہتھ ٹوٹا چھلانگوں کے دوران اپنا مشہور ھاتھ بھی اونچا کرلے تو اس کے گھوڑے کو چھونے سے قاصر رھیگا۔

ھاں، تو موت کے چوتھے دن بعد جب سب لوگ اپنے رشتےدار اور ھم‌وطن کو آخری بار الوداع کہہ چکے تو مصطفے جنازے کے قریب کھڑے ھوکر اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ وہ غمگین اور ساتھ ھی بےچین بھی تھا۔

جب اس کی باری آئی تو اس نے ایک چھوٹی سی تقریر کر ڈالی جو ماتمی عظمت سے بھرپور تھی۔

اس نے شعبان لاربا ملقب بہ ھتھ ٹوٹنا کی زندگی پیش کی، ایک گھوڑے سے لیکر دوسرے گھوڑے تک، اس کی آخری تمنا تک۔ مختصر طور پر اس نے نوجوانوں کی اطلاع کے لئے، جیسا کہ اس نے کہا، اڑائے ہوئے گھوڑے کا کارنامہ بیان کیا جب ھتھ ٹوٹنے نے پہاڑی ڈھلوان سے گھوڑے پر سوار چھلانگ لگانے سے باک نہیں کی تھی اور برسبیل تذکرہ یہ بھی سمجھا دیا کہ اگر وہ ڈرتا تو اس کا انجام اور بھی برا ہوتا۔ مصطفےٰ نے کہا کہ اس کی یاد وہ اس لئے نہیں دلا رہا ہے کہ وہ ھتھ ٹوٹنے کے کارنامے کی تحقیر کرنا چاھتا ہے بلکہ اس لئے کہ نوجوان ایک بار پھر جری فیصلوں کی برتری کے بارے میں یقین حاصل کریں۔

اور یہاں پہنچ کر اس نے مرحوم کی خواہش اور خود اپنی خواہش کے مطابق زوردار آواز میں حاضر بزرگوں کو مخاطب کیا اور پھر پوچھا کہ جنازے کے اوپر کودنے میں کوئی گناہ تو نہیں ہے۔

”گناہ نہیں ہے،“ بزرگوں نے کہا ”کیونکہ گھوڑا گوشت نہیں کھاتا اور اس کی سانس صاف ہوتی ہے۔“

اس کے بعد مصطفےٰ اسپ‌بند کے پاس گیا اور وہاں سے اپنا گھوڑا کھولا، اس پر اچک کر بیٹھ گیا، اپنا چابک لہرایا اور مجمع کے بیچ میں بنی ہوئی گذرگاہ سے جنازے کی طرف جھپٹا۔

اس دوران میں جب وہ اسپ‌بند تک گیا تھا جنازے کی دوسری طرف سے تمام چیزوں اور لوگوں

کو ھٹا دیا گیا تھا تاکہ گھوڑا ان پر نہ کود پڑے۔ کسی نے یہ تجویز کی کہ مرحوم کو شامیانے سے ڈھک دیا جائے تاکہ گھوڑے کے کھروں کی مٹی اس کے جنازے پر نہ گرے۔ لیکن ایک بوڑھے نے کہا کہ اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ھے کیونکہ مرحوم کو تو بہر حال مٹی میں ھی ملنا ھے۔

بیان کیا جاتا ھے کہ مصطفے کا گھوڑا جست وخیز کرتا ھوا جنازے تک گیا اور اچانک کسی ستون کی طرح کھڑا ھوگیا۔ مصطفے نے اس کو ڈانٹا اور دونوں پہلوؤں پر چابک رسید کیا۔ گھوڑے نے صرف منہ موڑ لیا، دانت نکالے لیکن چھلانگ مارنے پر کسی طرح تیار نہ ھوا۔

مصطفے نے اس کو موڑا اور دوڑا کر واپس لے گیا اور نہ جانے کیوں کاٹھی کے تسموں کو اچھی طرح جانچا اور پھر عقاب کی طرح جنازے کی طرف جھپٹا۔ لیکن گھوڑا پھر ٹھٹھک گیا اور مصطفے نے نہ جانے کتنے چابک اس کے رسید کئے لیکن اس نے چھلانگ نہ لگانی تھی نہ لگائی اور پچھلے پیروں پر کھڑا ھو گیا۔

کشیدہ خاموشی کے دوران صرف چابک کے سڑکنے اور مصطفے کی زوردار سانس چلنے کی آوازیں آرھی تھیں۔

پھر کسی بوڑھے نے چپکے سے کہا:

''مجھے لگتا ھے کہ مردے کے اوپر سے گھوڑا نہیں کودیگا۔،،

''ھاں، بات تو ٹھیک ھے،، ایک بوڑھے کو اور یاد آگیا ''اچھا کتا کبھی اپنے مالک کا ھاتھ نہیں کاٹتا اور اچھا گھوڑا مردے پر سے چھلانگ نہیں مارتا۔،،

''مصطفے اتر آؤ گھوڑے سے،، کسی نے چلا کر کہا ''ھتھ ٹوٹے نے یہ ثابت کر دیا ھے کہ وہ گھوڑوں کے بارے میں تم سے زیادہ جانتا تھا۔،،

مصطفے نے اپنا گھوڑا گھمایا اور مجمع کو پھاڑتا ھوا خاموشی سے صحن کے باھر نکل گیا۔ اس وقت ماتم پرسی کے لئے آنے والوں میں ایک زور کا قہقہہ پھوٹ پڑا، ایسا قہقہہ جو جنازے میں تو جانے دیجئے کسی شادی بیاہ کی محفل میں بھی مشکل سے سننے کو ملے گا۔

یہ قہقہہ اتنا زوردار تھا کہ جب دیہی سوویت کے سکریٹری نے اس کو اپنے دفتر میں سنا تو اس کے ھاتھ سے ربر کی مہر گر گئی اور اس نے حیرت سے کہا:

''قسم کھاتا ھوں، غالباً آخری لمحے ھتھ ٹوٹا اچک کر اپنے کفن سے باھر نکل کھڑا ھوا!،،

ھتھ ٹوٹے کو ھنسی خوشی کی فضا میں دفن کیا گیا۔ مرنے کے بعد اس کا یہ مذاق تقریباً سارے ابخازیہ میں پھیل گیا۔ شام کو بہرحال مصطفے کو فاتحے کی تقریب میں اصرار کرکے لایا گیا کیونکہ مردے کے اوپر سے چھلانگ لگانا اگر گناہ نہیں تھا تو مردے کے خلاف کسی طرح کا میل رکھنا ضرور گناہ تھا۔

جب ھمارے علاقے میں کوئی بوڑھا مرتا ھے تو اس کی فاتحہ دھوم دھام سے ھوتی ھے۔ لوگ شراب پی کر ایک دوسرے کو دلچسپ قصے، کہانیاں سناتے ھیں۔ رواج کے مطابق بہت پینا اور گانا منع ھے۔ اگر کوئی شراب پی کر گانے لگتا ھے تو اس کو فوراً روک دیا جاتا ھے اور وہ شرمندہ ھوکر چپ ھو جاتا ھے۔

میرے خیال میں جب کوئی بوڑھا مرتا ہے تو اس کی فاتحے کی دعوت میں چہل پہل اور کھانے پینے سے متعلق رواج بالکل مناسب سمجھے جاتے ہیں۔ آدمی نے اپنی زندگی کا سفر پورا کرلیا اور اگر وہ بڑھاپے میں اپنی مدت پوری کرکے مرا تو زندوں کو قسمت پر اس کی فتح کا جشن منانا چاہئے۔

اور رسوم کی شان و شوکت کو اگر حماقت کی حد تک نہ پہنچایا جائے تو بھلا بات ہی کیا ہوئی۔ یہ رسم کہتی ہے کہ کوئی بہت ہی زبردست بات ہوئی ہے یعنی آدمی مرگیا اور اگر یہ آدمی اچھا ہوا تو رسم کو بہت سے لوگ منائیں گے اور یاد رکھیں گے۔ اور ہتھ ٹوٹے سے زیادہ کون اس یاد کا مستحق ہے جس نے ساری زندگی اس دھرتی کی اپنی زندہ‌دلی اور محنت سے زیبائش کی۔ اور پچھلے دس سال کے دوران، کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنی قبر تک بنالی اور اس کو ثمرآور بنایا اور اس سے شفتالو کی اچھی فصلیں حاصل کیں۔

آپ کو اس سے تو ضرور اتفاق ہوگا کہ ہر ایک اپنی قبر سے شفتالو کی فصلیں نہیں حاصل کرتا۔ بہت سے کوشش کرتے ہیں لیکن ان میں وہ پرواز خیال اور جرأت کہاں جو ہتھ ٹوٹے میں تھی۔

اور زمین اس کے لئے ہنس کے پروں کی طرح نرم ہوگی اور اس کو ہونا بھی چاہئے کیونکہ اس کے لئے جو جگہ منتخب کی گئی تھی وہ اچھی اور خشک تھی۔ چنانچہ وہ خود اپنی زندگی میں اس کا ذکر بڑے شوق سے کرتا تھا۔

ایدوارد شیم

جب ایدوارد شیم (سال پیدائش ۱۹۳۰ء) نے لینن گراد کے طرزتعمیر کے انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لیا تھا اس وقت ان کو خیال بھی نہ تھا کہ وہ ادیب بنیں گے۔ انسٹی ٹیوٹ کی تعلیم ختم کرنے کے بعد انھوں نے ایک طویل سفر کیا اور اس سے اپنی پہلی کہانیاں لائے جو ۱۹۵۱ء میں شایع ہوئیں۔ اس وقت نوجوان مصنف کی کہانیوں کے تقریباً دس مجموعے ہیں۔

جیسا کہ ادیب موصوف نے خود کہا ہے، ان کی زیادہ‌تر کہانیوں کا جنم کسی نہ کسی سفر کے بعد، نئے اور نمایاں تاثرات سے دولت‌مند بننے کے بعد ہی ہوا ہے۔ اگرچہ مصنف کا خود یہ کہنا ہے کہ ان کی کہانیاں محض کرداروں کے خاکے ہیں اور زندگی کی مکمل تصویر نہیں پیش کرتی ہیں، پھر بھی ان کے کردار بڑی گہرائی اور وسعت رکھتے ہیں۔ شیم کے ہیروؤں کی زندگی میں بڑی جان ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ اپنے زمانے سے مربوط ہوتے ہیں۔ کہانی کے آخر میں ان سے جدائی شاق گزرتی ہے۔

آدھا گھر

چھوٹا سا شہر گرم سمندر کے ساحل پر واقع ہے ۔ اس کی مرکزی سڑک چوڑی اور صاف ستھری ہے اور لوہے کے ستونوں‌والے لیمپوں، پھولوں کے تختوں اور ہرنوں کے مجسموں سے آراستہ ہے جن پر المونیم کا رنگ چڑھا ہوا ہے ۔

بغلی سڑکیں پہاڑ پر جاتی ہیں ۔ وہاں مکان ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں ۔ نہ تو پھولوں کے تختے ہیں اور نہ سبزے کے قطعات ۔ سڑک کے ٹیڑھے میڑھے، گردآلود بلوط کے درخت ایسے لگتے ہیں جیسے ربر کی چادر کو کاٹ کر بنائے گئے ہوں ۔

ایسی ہی ایک سڑک کے سرے پر ایک پرانا گھر نظر آتا ہے جس کی چھت لوہے کی ہے ۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کو دو حصوں میں کاٹ دیا گیا ہے ۔ گھر کا آدھا حصہ نیلا ہے اور دوسرا بھورا جس پر نمی کے دھبے ہیں ۔ چھت کے ڈھلوان حصے بھی مختلف رنگوں کے ہیں، حتی کہ چمنی کے پائپ بھی

ایک سے نہیں ہیں۔ داہنا پائپ دھوئیں کے رنگ کا اور بایاں سفیدی کیا ہوا۔

گھر کے صاف ستھرے نصف حصے میں ایک بوڑھی عورت رہتی ہے جسکا نام کارپوونا ہے۔ جاڑے اور گرمی دونوں میں وہ بنا ہوا سیاہ سویٹر، زرد رومال اور ربر کے تلوں‌والے مضبوط اور اونچے جوتے پہنتی ہے۔ اگرچہ اس کی عمر ساٹھ برس ہو گئی ہے، لیکن اب بھی وہ ہشاش‌بشاش رہتی ہے، سیدھی چلتی ہے اور جب سڑک سے پہاڑ پر چڑھنے لگتی ہے تو اس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ وہ نہ تو کہیں ٹھہرتی ہے اور نہ اس کی سانس پھولتی ہے، صرف آنکھوں کے نیچے جھریوں میں پسینے کے قطرے چمکنے لگتے ہیں۔

کارپوونا کو پنشن ملتی ہے لیکن وہ اب بھی کام کرتی ہے۔ اپنے باغ کے انگور اور خرمے بیچتی ہے اور گرمیوں میں اپنے کمرے کرائے پر اٹھاتی ہے۔

اس کے گھر کے قریب ہی سیاحوں کا مرکز ہے جو اس کے لئے بہت اچھا ہے۔ تقریباً تمام سیاحوں کے پاس جانے سے پہلے تین چار دن فاضل ہوتے ہیں لیکن مرکز میں رہنے کے لئے ان کے پروانوں کی مدت ختم ہو جاتی ہے اور ان سے خیمے خالی کرنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ تب سیاح کارپوونا کے یہاں آجاتے ہیں۔

اس کے کمروں میں بھی لوہے کے جال‌دار پلنگ ہیں جو سوتی فلالین کے کمبلوں سے ڈھکے ہیں، چھوٹی میزوں پر شیشے کی صراحی میں پانی اور راکھدان ہیں — سب اسی طرح جیسے سیاحوں کے مرکز میں۔ بس کرایہ مختلف ہے۔

کارپوونا عام طور پر اپنے کرایہ داروں کو پلنگ، ستون سے لگا ہوا ہاتھ منہ دھونے کا طشت، اجابت‌خانہ جس میں لٹکن‌دار قفل لگا ہے، دکھاتی ہے اور کہتی ہے "اوپر صاف کاغذ اور نیچے گندے۔ پاخانہ استعمال کرنے کے بعد اس کو بند کر دیجئے تاکہ غیرلوگ اس کو نہ استعمال کر سکیں۔" وہ نہ تو کسی سے پاسپورٹ مانگتی ہے اور نہ کسی کا خاندانی نام وغیرہ پوچھتی ہے۔ سیزن میں اس کے یہاں بہت سے لوگ آتے ہیں، بھلا سب کے بارے میں اندراج کہاں تک کرے۔

اپنے حصے کی پہلی منزل اس نے مردوں کے لئے رکھی ہے اور دوسری عورتوں کے لئے۔ اکثر شادی‌شدہ جوڑے آتے ہیں اور اس سے علحدہ کمرے کی فرمائش کرتے ہیں۔ کارپوونا روکھے‌پن سے ان کو الگ کر دیتی ہے اور اس پر نگاہ رکھتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے کمروں میں زیادہ دیر تک نہ رہیں۔

مرد ہمیشہ پرسکون ہوتے ہیں۔ ان کے مطالبات بھی کم ہوتے ہیں اور وہ شاذ ہی ناراض ہوتے ہیں۔ صبح سمندر میں نہانے جلد چلے جاتے ہیں اور صرف رات کو سونے کے لئے واپس آتے ہیں۔ اگر تھوڑی سی پی لیتے ہیں تو کبھی کوئی گیت چھیڑ دیتے ہیں۔

عورتوں، خصوصاً نوجوان لڑکیوں کے لئے بڑا جھنجھٹ کرنا پڑتا ہے۔ کبھی وہ برتن مانگ رہی ہیں تو کبھی کپڑے دھونے کے لئے طشت کی ضرورت ہوتی ہے یا استری کی۔ اگر کمبل کا غلاف نہ ہو

تو ناراض ہو جاتی ہیں۔ اکثر کمروں میں دھپ دھپ دوڑتی ہیں۔ اسی لئے کارپوونا نیچے نہیں اوپر کی منزل کی گزرگاہ میں سوتی ہے۔ یہاں سے نگرانی آسان ہے۔ رات کو اگر کوئی رفع حاجت کے لئے نکلتا ہے تو جاگ پڑتی ہے اور اس کی واپسی کا انتظار کرتی ہے اور پوچھتی ہے ''دروازے کی کنڈی لگالی؟،، اور اس وقت تک نہیں سوتی جب تک پھر خاموشی نہیں چھا جاتی۔

لڑکیاں بےوقوفی اور لاپروائی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ نہ تو کچھ جانتی ہیں اور نہ کچھ کر سکتی ہیں اور کارپوونا انہیں عقل سے کام لینا سکھاتی ہیں۔

''ایودوکیا کارپوونا، ذرا استری گرم کر دو۔ میرے چنٹ‌دار اسکرٹ میں شکنیں آ گئی ہیں۔،،

''شاید، اس سے مجھے مطلب نہیں،، کارپوونا فوراً جواب دیتی ''لیکن میرے پاس چنٹ‌دار اسکرٹ انتالیس سال سے ہے اور ایک بار بھی بھلا اس پر استری ہوئی ہو۔ اس کو تہہ کرکے موزے میں رکھ دیتی ہوں، پھر شکنیں نہیں پڑتیں۔،،

''ایودوکیا کارپوونا، یہاں موچی کہاں ہے؟ جوتے کا تلا لگوانا ہے۔،،

''شاید، اس سے مجھے مطلب نہیں،، پھر کارپوونا کہتی ''میں نے جنگ کے زمانے سے اپنے جوتے کی مرمت نہیں کرائی ہے۔ دراصل چمڑے کے تلے کا جوتا نہ لینا چاہئے بلکہ ربر کے تلے کا۔ وہ بالکل نہیں گھستا۔ موزوں کو پھٹنے سے بچانے کے لئے جوتے کے اندر بھی تلا رکھنا چاہئے۔،،

کارپوونا کے باغ کے انگور کھٹے اور چھوٹے ہوتے ہیں۔ لیکن لڑکیاں کاہلی میں صبح صبح بازار نہیں جاتیں اور جو کچھ گھر میں مل جاتا ہے وہی خرید لیتی ہیں۔ کارپوونا ایک روبل زیادہ ہی لیتی ہے لیکن پیسے پانے کے بعد یہ بھی کہہ دیتی ہے:

''شاید، اس سے مجھے مطلب نہیں لیکن تم بہت زیادہ خرچ کرتی ہو۔ میں تو کچھ بھی نہیں خرچ کرتی۔ کچھ ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

خزاں میں بارش شروع ہو جاتی ہے اور سیاحت کا مرکز آئندہ سیزن تک کے لئے بند ہو جاتا ہے۔ خیمے تنہا کھڑے بھیگتے رہتے ہیں اور زنگ آلود دھبوں سے ڈھک جاتے ہیں، دروازوں پر سرخ نعرے افسردگی کے ساتھ لٹکے رہتے ہیں اور ان سے دودھ جیسے آنسو ٹپکتے ہیں۔ وہ آدھا گھر بھی جس میں کارپوونا رہتی ہیں خالی ہو جاتا ہے۔

آخری پھل بکنے کے بعد، سڑتے ہوئے خرموں کا مربہ تیار کرکے مرتبانوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ کارپوونا کمروں میں جاتی ہے جن سے سگرٹ کی راکھ اور سینٹ کی مہک آتی ہے۔

وہ پلنگوں پر سے کمبل اور گدے اتار کر ان کو اسٹور میں چھپا دیتی ہے، شیشے کی صراحیاں اتار کر فرش پر رکھتی ہے تاکہ کسی اتفاقی حادثے سے ٹوٹ نہ جائیں۔

یہ پرانا گھر نیچے بیٹھ رہا ہے، ایک پہلو سے جھک گیا ہے۔ دیواروں کی لکڑی اور فرش کے لٹھے

چرچراتے ہیں اور اٹاری سے کھڑکھڑاتی اور سرسراتی ہوئی آوازیں آتی ہیں۔

کارپوونا ان آوازوں کو سن کر اس طرح کانپ جاتی ہے جیسے وہ درد میں مبتلا ہو۔ اس میں مکان کی خراب‌حالی دیکھنے کی تاب نہیں ہے۔ وہ ہر دراڑ کو بند کرنے، ہر دھبے کو رنگنے کی کوشش کرتی ہے۔ صبح کو وہ جھڑنےوالا چونا صاف کرتی ہے لیکن دوسرے دن پھر پلنگ کی جالیوں، چھوٹی میزوں اور فرش پر وہ چھوٹی چھوٹی سفید پتیوں اور باریک غبار کی صورت میں بکھرا ہوتا ہے۔

گھر کو ابھی بچایا جا سکتا تھا اگر پڑوسی نہ ہوتے۔ گھر کا دوسرا نصف تو انہیں کا ہے اور وہ اس کی مرمت کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ کارپوونا اکثر ان سے ناراض بھی ہو گئی لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اور اب تو اس کو ایسا لگتا ہے کہ پڑوسی یہ جان بوجھکر کر رہے ہیں — چاہتے ہیں کہ ان کی جائےرہائش کے ساتھ اس کا گھر بھی تباہ ہو جائے۔ کارپوونا یہ صاف دیکھتی ہے کہ گھر کیسی جدوجہد کر رہا ہے۔ اس کا گندہ اور غلیظ آدھا حصہ بارونق اور صاف ستھرے نصف سے چمٹ گیا اور اس کو توڑ پھوڑ کر، بربادی کو پہنچا کر زمین پر لا رہا ہے۔ اسی وجہ سے فرش چرچراتا ہے...

بڑھاپے میں کارپوونا کو یہ ساز نہ آیا۔

تیس سال گزرے اس کے شوہر نے جو جنگل کا نگہبان تھا یہ چوبی گھر اپنے دوست کی شرکت سے بنایا تھا۔ ابتدا میں دونوں خاندان اچھی طرح رہتے

تھے - پھر جنگ شروع ہو گئی اور پہلے ہی مہینوں میں کارپوونا کا شوہر لاپتہ ہو گیا، صرف محاذ سے ایک، ہی خط آسکا- پھر جلد ہی کٹھن جاڑوں کے موسم میں کارپوونا کی اکلوتی بیٹی بھی چل بسی-

کارپوونا تن تنہا رہ گئی اور واقعی زندگی اس کے لئے پتھر کی طرح جامد اور ساکت ہو گئی - بیٹی کو دفن کرنے کے بعد تو کارپوونا کام بھی نہ کر سکی- باغ اور باڑی سب کی حالت خراب گئی، گھر بھی خستہ حال ہوگیا - پھر دشوار سال آئے، بھوک اور خطرے کے سال - ان کو کیسے جھیلا گیا، یہ خود کارپوونا کی سمجھ میں نہیں آتا -

چاروں طرف دوسرے لوگ بھی کچھ کم مصیبت‌زدہ نہ تھے، کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس پر جنگ نے چوٹ نہ کی ہو - لیکن کارپوونا کو لگتا جیسے اس پر دوسروں کی بہ‌نسبت زیادہ مصیبتیں ٹوٹی ہیں اور اس کا جیسا غم و رنج اور کسی کو نہیں ملا ہے -

گھر کے دوسرے حصے میں نئے پڑوسی آن بسے تھے - کارپوونا ان سے بالکل ناواقف تھی لیکن نہ‌جانے کیوں اس کو یقین کہ تھا وہ بہت ہی الول جلول، غیر سنجیدہ لوگ ہیں اور اپنی رہائش‌گہ کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ان کو آسانی سے مل گئی ہے -

روز روز کے جھگڑے لڑائی کی وجہ سے پڑوسی بھی کارپوونا کو پسند نہیں کرتے تھے اور اس کو ''کنجوس'' کہتے تھے -

''ہماری کنجوس نے پھر روٹیاں سوکھنے کو باہر رکھی ہیں...''

کارپوونا نے ان کی بات سن لی اور سوچنے لگی کہ غالباً وہ نہیں جانتے کہ بھوک کیا چیز ہوتی ہے، انھوں نے کبھی آخری عزیز انسان کو دفن نہیں کیا ہے۔

اس نے سوکھی روٹیاں جمع کیں اور ان کو گھر کے اندر لے آئی۔

کوٹھری میں دلیا کی پوٹلیاں، مرتبان، پیکٹ اور تیل کی بوتلیں رکھی تھیں۔ ان سب اچھی چیزوں کو خراب ہونے سے بچانا مشکل تھا لیکن وہ کوشش کرتی تھی۔

وہ اپنے کو کنجوس نہیں سمجھتی تھی، بالکل نہیں۔

خزاں میں جب سیاحوں کا مرکز بند ہو گیا اور کارپوونا کو بھی قیام کرنےوالوں کا انتظار نہیں رہا تو ایک دن اس کے گھر پر دستک ہوئی۔

ایک جوڑا برساتی میں کھڑا تھا اور دونوں کے کاندھوں پر سفری تھیلے تھے۔ وہ کمرہ چاہتے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ میاں بیوی ہیں۔

کارپوونا اپنی عادت کے مطابق کہنا چاہتی تھی کہ ایک ساتھ رہنا ممکن نہیں اور ان کو الگ الگ جگہوں پر بھیجنا چاہتی تھی لیکن اس کو فوراً یاد آگیا کہ دونوں منزلیں خالی ہیں اور ان کو رہنے کے لئے دو کمرے دینا ٹھیک نہ ہوگا۔ دونوں کو ساتھ ہی رکھنا پڑا۔

''ڈیڑھ روبل فی بستر،، اس نے ناراضگی سے کہا۔

یہ کرایہ شرمناک تھا کیونکہ عام طور پر کارپوونا کو ایک روبل ملتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ ان آنے والوں سے ناراض تھی، واقعی وہ قصوروار تھے، انھوں نے رائج قواعد کو توڑا تھا۔

انھوں نے بحث‌مباحثہ اور مول تول نہیں کیا۔ یہ بات بھی کارپوونا کو کھل گئی۔ وہ ان کو باغ میں لے گئی۔ منہ ھاتھ دھونے کی جگہ اور پاخانہ دکھایا اور پریشانی میں لٹکتے ہوئے قفل کے بارے میں کہنا بھول گئی جس کی وجہ سے بعد میں پورے دن بےچین رہی۔

مسافر نوجوان تھے اور واقعی بےوقوف بھی۔ ان کو رہنے سہنے کا سلیقہ ھی نہ تھا۔

شوہر صبح کو باغ میں دوڑتا اور کسرت کرتا۔ وہ پستہ‌قد تھا، کچھ مرغ سے مشابہ اور اسکے سر کے بال مرغ کے چونڈے کی طرح کھڑے تھے۔ اگر باہر بارش ھوتی اور ٹٹیوں پر پھیلی ہوئی ننگی انگور کی بیلوں سے پانی کی بوندیں ٹپکتی ھوتیں تو بھی وہ ضد کے ساتھ باغ کے راستے پر دوڑتا اور پھر آدھے گھنٹے تک وہ دستےدار اسپرنگوں کو کھینچتا رہتا۔ اتنی قوت لگانے سے اس کا چہرہ سرخ ھو جاتا اور بالکل بچوں جیسا دکھائی دینے لگتا۔

''وولودیا،، اس کی بیوی کھڑکی سے چلائی ''ارے، میرا تولیہ کہاں ھے، جانتے ھو؟ غالباً اب گھاٹ پر پھر بھول آئے؟،،

وولودیا کی بیوی بھی چھوٹی سی تھی لیکن اونچی ایڑی کا جوتا اور تنگ لباس پہنتی تھی اس لئے شوھر سے زیادہ اونچی لگتی تھی۔ وہ بھی کسرت کرتی تھی، لیکن صرف کمرے کے اندر۔ اس کے اچھلنے کودنے اور فرش کے تختوں کے چرچرانے کی آواز سنائی دیتی تھی۔

وہ کپڑے پہنتے اور سمندر کی طرف روانہ ھو جاتے۔ کارپوونا کو معلوم تھا کہ سمندر کے کنارے سردی اور ویرانی ھے۔ دوکانوں کو لکڑیاں لگا کر جڑ دیا گیا ھے، وہ تختے جن پر لوگ سمندر کے کنارے لیٹ کر دھوپ کھاتے تھے ڈھیروں میں جمع کرکے موم جاموں سے ڈھک دئے گئے ھیں۔ ھوا کاغذوں کو ادھر ادھر اڑاتی ھے اور پانی کو جوھڑوں میں دھکیل دیتی ھے۔ ساحل تک آنےوالی لہریں اتنی میلی ھوتی ھیں کہ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ایسا سفید اور صاف جھاگ کہاں سے لائیں۔

لیکن اس کے باوجود کرایہ‌دار نہاتے تھے، بھیگے، سردی سے ٹھٹھرے لیکن نہ‌جانے کیوں خوش خوش لوٹتے، ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے۔ وہ ھمیشہ اس طرح مسکراتے تھے جیسے وہ کوئی نہ کوئی ایسی بات جانتے ھیں جو بہت اھم ھے اور دوسرے لوگ اسکو نہیں جانتے تھے۔

''بھوکا ھوں،، اپنا روئیں‌دار تولیہ کھڑکی کے اندر پھینکتے ھوئے وولودیا چلایا ''اسٹیشن کے رستوراں چلیں؟،،

''شاید، مجھے اس سے مطلب نہیں،، کارپوونا نے کہا ''بس میں رستوراں نہیں جاتی۔ وہ مارگرین میں

18—190

پکاتے ہیں اور پیسے تو قیامت کے وصول کرتے ہیں۔"

کارپوونا ان کا کمرہ ٹھیک ٹھاک کرتی تھی۔ اس نے دیکھا کہ وہ امیر نہیں ہیں۔ ان کے پاس سامان بہت کم ہے۔ وولودیا کے پاس ایک سوٹ اور آستین جلا ہوا جیکٹ تھا اور بیوی کے پاس نیچے پہننے والی قمیص تک نہ تھی۔ وہ رات کو بچوں والی بنیائن پہنتی تھی۔ کارپوونا کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایسی حالت میں پیسہ بے سمجھے بوجھے اور بیکار خرچ کرنا کیسے ممکن ہے۔

ایک دن کمرہ صاف کرتے ہوئے اس نے میز پر پھیلے ہوئے کاغذوں، نصابی کتابوں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کے درمیان گول لپٹی ہوئی شکل میں تیس روبل کے نوٹ دیکھے۔ غالباً کرایہ‌دار ان کو چھپا کر رکھنا بھول گئے تھے۔

کارپوونا پیسے کبھی کھلے نہیں رکھتی، وہ چاہے جتنے کم کیوں نہ ہوں۔ یہ اس کو خوفناک معلوم ہوا، جیسے سوکھی روٹیوں کو بارش میں رکھ دیا جائے۔ اس وقت بے احتیاطی سے لپٹے ہوئے ان دس دس روبل کے نوٹوں نے تو اس کو تقریباً بدحواس کر دیا۔

اس نے احتیاط سے ان کو اٹھا کر دیکھا اور پھر میز کے دوسرے سرے پر رکھ کر ان کو پلاسٹر سے بنے ہوئے ایک مجسمے کے نیچے دبا دیا۔ اس طرح زیادہ حفاظت ہوتی تھی۔

فرش صاف کرتے ہوئے اس نے اس مجسمے کو پھر دیکھا اور جاتے جاتے نوٹوں کو ایک بار پھر اٹھا کر رکھا۔

کرایہ‌دار رات کو دیر سے لوٹے۔ کارپوونا گزرگاہ میں بستر پر جا چکی تھی اور ان پر ناراض نہیں ہوئی، صرف خوابیدہ حالت میں اتنا پوچھ لیا کہ آیا انھوں نے دروازے کی کنڈی لگا لی ہے۔

دوسرے دن جب وہ کمرے میں پھر گئی تو دیکھتی کیا ہے کہ نوٹ پھر پہلے کی طرح وہیں رکھے ہیں۔

نہ تو وولودیا کو اور نہ اس کی بیوی کو ان کے بارے میں یاد آیا تھا۔

اس بات نے کارپوونا کو ایسے مخمصے میں ڈال دیا کہ اس نے کمرے کی صفائی نہیں کی اور دروازہ آہستہ سے بند کرکے نیچے اتر گئی، اس گھر کے کسی کام میں لگنے کی کوشش کی۔ مٹی کے تیل کا چولھا جلایا تاکہ کھانا تیار کرے، آلو چھیلنے لگی۔ لیکن اوپر کمرے میں جو پیسے پڑے تھے برابر اس کو یاد آتے رہے، ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس کے سامنے ہی پڑے ہیں۔

"ایسا کیوں ہے؟"، اس نے سوچا "بھلا اس لڑکے اور چھوکری کو پیسے ادھر ادھر پھینکنے کی اجازت کس نے دی ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ پیسے کی قدر نہیں جانتے۔ وہ اس کا تصور نہیں رکھتے کہ قحط کے زمانے میں روٹی کے ٹکڑے کی کیا اہمیت ہے۔ اگر اس دھرتی پر کوئی ایسا حق ہوتا بھی کہ بےدردی سے پیسہ پھینکا جائے تو یہ لڑکا اور چھوکری اس کے مستحق نہ ہوتے..."

مٹی کے تیل کا چولھا دھواں دینے لگا، خالی برتن آگ پر جل اٹھا تھا۔ کارپوونا وہیں کھڑی غیرشعوری

طور پر باورچی‌خانے کی چھری اپنی ھتھیلی پر تول رھی تھی۔

پھر اس نے سوچا کہ کرایہ‌داروں کے کمرے کی صفائی تو نہیں ھوئی ھے اور اس کا مطلب یہ ھوا کہ کہا جا سکتا کہ وھاں کوئی گیا ھی نہیں۔

اس نے چھری خالی برتن میں ڈالی، ھاتھ صاف کئے اور زینے پر چڑھنے لگی۔

اگرچہ کارپوونا جانتی تھی کہ گھر میں کوئی اور نہیں ھے پھر بھی وہ پنجوں پر چل رھی تھی اور ڈرتی تھی کہ کہیں دروازہ نہ چرچرائے۔

لیکن دروازہ بےآواز کھل گیا۔

میز سے پلاسٹر کا وہ چھوٹا مجسمہ اٹھانا مشکل ھو گیا، وہ بالکل چپک گیا تھا۔ کارپوونا نے پہلے بہت چپکے سے اس کو ھلایا اور پھر اس کو تیزی سے اٹھا کر نوٹ دبوچ لئے۔

اسی وقت باغ میں آوازیں گونجیں، ایسا لگا جیسے صحن کے چوبی دروازے کے کھلنے کی آواز آئی۔ کارپوونا اچھل گئی اور کھڑکی کے پاس آگئی ...

کوئی لڑکے راستے پر جا رھے تھے اور ان میں سے کسی نے چھڑی سے باڑ کو کھٹکھٹایا تھا۔

کارپوونا ان کو دیکھتی رھی، یہاں تک کہ وہ اوجھل ھو گئے۔ پھر وہ کمرے سے نکلی لیکن یہ کوشش کرکے فرش پر چونے کی جو پتیاں جھڑ کر گری تھیں ان پر پیر نہ پڑے۔

سارے دن وہ کان لگائے رھی کہ کرایہ‌دار آ رھے ھیں یا نہیں۔ ان کے انتظار کے دوران اس نے تصور

کیا کہ کیسے وہ پریشان ہوں گے، پیسے تلاش کریں گے اور پھر ایک دوسرے پر خفا ہوں گے۔ ارے، ڈھونڈھنے دو! یہ سبق ہوگا ان کے لئے...

اس کے لئے یہ دن بہت ھی طویل اور نوع بنوع ہو گیا۔ کبھی بارش ہونے لگی تو کبھی بادلوں کے درمیان شفاف تقریباً صبح جیسا سورج نکل آیا اور اس نے بھیگی اور بھاپ نکلتی زمین کو روشن کر دیا۔ یہ سمجھنا ناممکن ہو گیا کہ کیا بجا ہے۔

کارپوونا نے کئی بار راستے پر پھر آوازیں سنیں۔ وہ چوکنا ہو گئی لیکن یہ اجنبی راہگیروں کی بات‌چیت کی آوازیں نکلیں۔ بلاسوچے اس کے دماغ میں یہ خیال کوندا ''گھر کے ارد گرد کتنے لوگ چلتے پھرتے ھیں اور میں نے نہیں دیکھا...،،

اندھیرا چھا گیا لیکن کرایہ‌دار نہ آئے۔ کارپوونا گزرگاہ میں لیٹ گئی، بستر پر۔ دیوار کے پار آھستہ آھستہ چوہے کی طرح ھوا کیکر کی شاخوں کے درمیان گھس کر سوکھی ٹہنیوں کو چھو رہی تھی۔ ٹڈے یکے بعد دیگرے چڑچڑا رہے تھے... ''چڑچڑ... چڑچڑ... چڑچڑ...،، یہ یکساں آوازیں کسی چیز سے مشابہہ تھیں، لیکن کارپوونا کو یہ یاد نہ آیا کہ کس سے ملتی تھیں... پھر پہاڑ پر کراھتی آواز میں سیار رویا۔ ''پہرے کے لئے کتا رکھنا چاھئے،، کارپوونا نے سوچا۔

کتے کے بارے میں یہ خیال اس کو یکدم معمولی، روزمرہ کی فکروں کی طرف واپس لایا۔ باغ میں پتیاں جمع کرکے ان کو جلانے کا وقت آ گیا تھا، کیا

اچھا ہوتا کہ وہاں سیب کے کچھ درحت لگا دئے جاتے... اپنے حصے کی چھت کو رنگ دینا چاہئے ورنہ وہ بالکل زنگ آلود ہو کر ٹپکنے لگے گی...

اور اس طرح کے روزمرہ کے کاموں کے خیال سے کارپوونا کو تسکین ہوئی۔ انھوں نے کچھ ایسا کر دیا جیسے کوئی خاص بات نہیں ہوئی ہے۔ زندگی اپنے ڈھرے سے نہیں ہٹی ہے اور پہلے کی طرح جاری وساری ہے۔ اور جب پھر کارپوونا نے کرایہ‌داروں کے بارے میں سوچا تو سوائے غصے کے اور کوئی احساس نہیں باقی رہ گیا تھا بالکل ویسا ہی جیسا کہ وہ پڑوسیوں کے لئے رکھتی تھی۔ اگر واقعی ان کو یہ پیسے نہ دئے جائیں بلکہ اپنے پاس رکھ لئے جائیں تو کوئی گناہ نہ ہوگا۔ بیوقوف لوگوں کو سبق دینا چاہئے تا کہ وہ یہ تو جان جائیں کہ زندگی کیا ہوتی ہے...

وہ غیرمتوقع طور پر بےخبر سو گئی۔

وہ جاگی اس طرح کہ کرایہ‌دار اپنے کمرے میں چپکے باتیں کر رہے تھے۔ دروازے کی دراڑوں سے روشنی کی دھاریاں چھن کر آ رہی تھی اور کبھی ایک یا دوسری دھاری غائب ہو جاتی تھی۔ وولودیا ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ٹہل رہا تھا۔

''اب مجھے یاد آیا،، بیوی نے کہا ''یاد ہے، ساحل پر تھیلا جھاڑا تھا... وہ وہیں رہ گئے۔ تولیہ گنوا دیا، جیکٹ جلا دی، پیسے کھو دئے۔ ارے، ہم بدقسمت بھلکڑ...،،

''واقعی، افسوس کی بات ہے،، وولودیا نے کہا ''ایک ایک پیسہ کر کے جمع کیا۔ شہر میں اس وقت

خراب موسم ہوگا۔ وہاں بالکل جانے کو دل نہیں چاہتا۔ لیکن اب کیا کیا جائے۔ تم ہنکو نہیں، بہرحال دیر ہو چکی ہے۔ ،،

''میں ہنکتی نہیں ہوں... میں محض...،،

''اور محض کی بھی ضرورت نہیں۔ کل اسٹیشن جا کر ٹکٹ بدلوا لونگا۔ ،،

کمرے کی روشنی بجھ گئی۔ وولودیا ننگے پیر کونے میں ٹپک رہا تھا جہاں سوئچ تھا۔ کارپوونا نے بےساختہ سوچا کہ وولودیا اندھیرے میں گرے ہوئے چونے پر پیر رکھے گا اور پھر گندے پیروں بستر پر لیٹ جائیگا...

کرایہ‌داروں نے ذرا کھسر پھسر کی، پھر چپ ہو گئے۔ اور کارپوونا آنکھیں کھولے پڑی رہی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسے ایسی بےفکر ہوکر سوسکی کہ اس کو کرایہ‌داروں کے آنے کا پتہ نہ چلا اور اس نے یہ تک نہیں پوچھا کہ آیا سڑک‌والا دروازہ بند ہے یا نہیں۔ یہ پھر کچھ غیرمعمولی اور اس سے بالکل جدا بات تھی۔

جس طرح کچھ گھنٹے پہلے اس کو ایک فضول سے خیال نے مطمئن کر دیا تھا اسی طرح اب ایک نئے مجہول تصور نے اس کو پریشان کر دیا۔ نہیں، سب کچھ اسی طرح نہیں ہو رہا ہے جیسے ہونا چاہئے... زندگی میں کچھ نہ کچھ ہوا ہے، حتی کہ کرایہ‌داروں کی رات‌والی بات‌چیت بھی وہ نہیں تھی جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔

پتہ نہیں اس کی سمجھ میں یہ کیوں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرایہ‌داروں کے پاس سیدھے سے جا کر ان کو پیسے واپس دے دے۔ مذاق نشانے پر نہیں بیٹھا، سبق نہیں دیا جا سکا۔

صبح کے وقت وہ وولودیا کو دیکھتی رہی اور یہ کوشش کرتی رہی کہ وہ کیا محسوس کر رہا ہے۔ لیکن وولودیا اطمینان سے باغ میں دوڑتا رہا، اس نے پھر اپنے اسپرنگ کھینچے اور اس کا چہرہ طفلانہ اور گلابی رنگ کا ہو گیا۔

دن میں بیوی نے چیزیں ٹھیک سے بند کرنا شروع کیں۔

"جا رہے ہو؟" کارپوونا نے بے تعلقی سے پوچھا "سچ مچ، شاید اس سے مجھے مطلب نہیں... لیکن موسم اچھا اور گرم ہے... اور ٹھہر جاتے؟"

"جانا ضروری ہے" لڑکی نے مختصر سا جواب دیا۔ اس کی آواز میں نہ تو غصہ تھا اور نہ تلخی اور اس نے شکایت بھی نہیں کی...

وولودیا ریلوے اسٹیشن سے لوٹ کر آیا اور ٹکٹ میز پر پھینکتے ہوئے بولا:

"ساڑھے سات بجے... اور جب تک چلو نہا آئیں نا؟ آخری بار!"

اور پھر انہوں نے اپنے سفری تھیلے الجھ کر تولئے اور نہانے‌والی ٹوپیاں نکالیں اور گھاٹ کو چل دئے۔

چیزیں پھیلی رہ گئی تھیں اور کمرہ بھی مقفل نہیں کیا۔ **ان** کو یہ گمان تک نہیں ہوا کہ کوئی

کمرے میں آ کر کچھ لے جا سکتا ہے... کارپوونا نوٹ لائی اور ان کو سفری تھیلے کی جیب میں ٹھونس دیا۔ جیب بند ہونےوالی نہ تھی لیکن کارپوونا نے اس بات کی طرف توجہ نہ کی۔

کرایہ دار دیر تک نہاتے رہے۔ غالباً آخری بار خوب دل بھرکر نہانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پانچ بجے، پھر چھہ — لیکن وہ نہ لوٹے۔

گھر سے اسٹیشن کافی فاصلے پر تھا۔ پہاڑ سے اترنا اور پھر پورے شہر سے گزر کر وہاں پہنچنا ہوتا تھا۔ کم سے کم ایک گھنٹہ تو چاہئے۔ کارپوونا نے راہ کی طرف دیکھا اور پھر دروازے کی طرف۔ ارے، کیسے ہیں یہ لوگ... اب ٹرین کے لئے دیر ہو جائےگی اور ٹکٹ بیکار جائیں گے...

بارش شروع ہو گئی۔ سفید لہریں فضا کو چیر رہی تھیں اور ان کی چادر کے پیچھے پہاڑ، دیواروں کی چھتیں، ریڈیو کے مینار کی سرخ روشنیاں سب چھپ گئیں۔ اس لڑکے اور چھوکری کے پاس نہ تو چھتریاں ہیں اور نہ برساتیاں... کارپوونا ناراض ہو گئی اور افسوس کرنے لگی، اس کے دل پر ایک دھند سی چھا گئی۔

آخرکار وہ برساتی میں دکھائی دئے۔ جھکے، آدھے کپڑے پہنے، کوٹ سر پر پڑے ہوئے جو پانی سے چمک رہے تھے اور سیاہ بھی ہو گئے تھے۔

”تیاری میں مدد دوں؟،، کارپوونا نے پوچھا۔

”نہیں، ہم خود...،،

جلدی جلدی انھوں نے اپنی چیزیں سفری تھیلوں میں بھریں ۔ یہ تک نہیں دیکھا کہ سب کچھ ٹھیک ھے یا نہیں ۔ ٹھیک ساڑھے چھہ بجے وہ روانہ ھو گئے ۔ ٹرین کی روانگی میں ابھی ایک گھنٹہ تھا لیکن کارپوونا کو یقین نہ تھا کہ آیا ان کو دیر ھو جائے گی یا وہ آخری منٹ میں ٹرین پکڑ سکیں گے ؟ ارے، بیوقوف کہیں کے ...

وہ فوراً گدے اٹھا لینا چاھتی تھی اس لئے اوپر گئی ۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ پلنگ پر بیٹھ گئی، دیر تک اندھیرے میں بیٹھی رھی اور دھیمی پڑتی ھوئی بارش کی آواز سنتی رھی ۔

اس نے اپنے سامنے یہ تصویر کھینچی ۔ وہ لڑکا اور لڑکی اسٹیشن پہنچے بھیگے، تھکے ھوئے لیکن پہلے کی طرح بےغم اور ایک دوسرے کی طرف اس طرح دیکھتے ھوئے جیسے وہ کوئی اھم اور خاص بات جانتے ھیں ...

وہ کچھ بھی نہیں جانتے ۔ انھوں نے زندگی میں کچھ بھی نہیں جھیلا ھے ۔ غالباً ان پر ابھی کوئی مصیبت نہیں آئی ھے ۔ وہ روٹی کے ٹکڑے کی قدر نہیں کرتے ۔ وہ لوگوں کو نہ تو شبہ کی نظر سے دیکھتے ھیں اور نہ رات کو دروازہ چرچرانے پر کانپ اٹھتے ھیں ۔ کیا ھوا، ممکن ھے کہ یہ بھی اچھی بات ھو ... شاید ان پر خفا نہ ھونا چاھئے؟

پھر کھڑکی کے پار کوئی ٹڈا چرچرایا ''چرچر ... چرچر ... چرچر ...'' جیسے کوئی ملیشیاوالا اپنی گھٹی گھٹی سیٹی بجاتا ھے ۔

بارش تھم گئی اور سناٹے میں پرانے گھر کی کھرکھراہٹ اور سرسراہٹ پھر صاف سنائی دینے لگی۔

سر کے اوپر لٹھے چرچرائے، چرچرانے کی آواز اٹاری تک پھیل کر جامد ہو گئی۔ جیسے کسی کے پیروں تلے فرش کے لٹھے کراہ اٹھے ہوں۔ چونے کا باریک سا چھلکا جو اندھیرے میں زیادہ سفید لگتا تھا پلنگ پر کاربوونا کے پاس ہی گرا اور اس نے اس کو جھاڑ کر الگ نہیں کیا۔

واسیلی بیلوف

جس طرح ایوان تورگینیف نے اپنے زمانے میں قارئین کو اپنے وطن صوبہ اورلوف سے متعارف کرایا تھا اسی طرح واسیلی بیلوف روسی شمال (وولوگدا صوبہ) سے جہاں وہ رہتے اور کام کرتے ہیں لوگوں کو روشناس کیا ہے۔ بیلوف ۱۹۳۲ء میں جنگلوں میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ پہلے بڑھئی اور مشینوں کی مرمت اور دیکھبھال کرنے والے کام کرتے رہے پھر اضلاعی اخبار میں کام کرنے لگے اور نوجوان کمیونسٹ لیگ کی اضلاعی کمیٹی کے سکریٹری ہو گئے۔ چند سال بعد ماسکو کے گورکی نامی ادبی انسٹی ٹیوٹ میں ان کو داخلہ مل گیا۔ ۱۹۶۱ء میں ان کی چھوٹی سی تصنیف "میرا جنگلی گاؤں" سے ان کی سوانح حیات کے نئے ادبی باب کی ابتدا ہوئی۔ اس زمانے سے مصنف کی ہر کتاب سے بڑی دلچسپی لے جا رہی ہے۔ بیلوف کی مختصر اور طویل کہانیوں کے ہیرو

قارئین کو اپنی سادگی اور قلبی فیاضی سے موہ لیتے ہیں۔ یہ ہمارے ہی زمانے کے زندہ اور حقیقی کردار ہوتے ہیں جن میں اکثریت کسانوں کی ہے۔ ''بیلوف کی کتابوں میں حرارت ہے،، تنقید کرتے ہوئے کہا گیا ہے ''یہ حرارت بنیادی اور سودمند ہے، اس میں زندگی اور نیکی کی حرارت ہے۔،،

دریا کے موڑ

میں کیسے ہوں تمہاری قصوروار؟
کیوں بنی میں ایسی گنہ گار؟
کیا کھا گئی اناج کے سارے کوٹھے؟
پہن ڈالے صندوقوں کے سارے کپڑے؟
یا کنجیاں گنوائیں میں نے؟
گڑبڑ کیا سونے چاندی کا حساب؟

(ایک پرانے لوک گیت سے)

جون میں ایوان دانیلووچ گرینینکو کو لکڑی خریدنے کے لئے شمال روانہ کیا گیا۔ جب اودیسا کے وسیع اور گرم میدان گزر گئے اور ٹرین کھٹ پٹ کرتی سیاہ مٹی کے علاقے میں اسٹیشنوں کے درمیان دوڑنے لگی تو گرینینکو کے دل کی ہلچل اچانک مدھم پڑ گئی اور جب وہ ماسکو سے وولوگدا چلا تو اس کو اور زیادہ ذہنی سکون وچین محسوس ہوا۔ واقعی خنک اور سرسبز شمالی موسم گرما نے مسلسل فکروں کی آگ

بجھا کر ان کی جگہ آہستہ رو اور افسردہ خیالات کی ہلکی ہلکی آنچ کو دے دی۔

محض راستے کی بیکاری کی وجہ سے اس کے ذہن میں خیالات اور ہلکی سی بےچینی نہیں پیدا ہو رہی تھی۔ بہت دن ہوئے جنگ کے زمانے میں جب گرینکو بیس سال کا نوجوان تھا وہ ساری گرمیوں بھر شمالی مقامات پر کام کر چکا تھا۔ وہ فوج کے لئے سوکھی گھاس کاٹ کر تیار کرتا تھا اور اب اس کے ذہن میں اپنے سپاہیانہ شباب کی یادیں ابھر رہی تھیں۔

صبح کو، سفید رات ختم ہونے پر جو کل کی بارش اور جنگلی گیلاس سے مہک رہی تھی، وہ ماسکو کی ٹرین سے اسٹیمر میں منتقل ہوگیا۔ اس دو پہیوں والے پرانے اسٹیمر میں دو سرد اور صاف ستھرے عرشے اور برف جیسی سفید کپتان کی کیبن تھی اور نیلی فضا میں اس کا پرچم پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اسٹیمر گودی میں دیر تک کھڑا رہا۔ وہ بائیں طرف کافی جھکا ہوا تھا کسی بوڑھے اور طاقتور کاشتکار کی طرح جس کا ایک شانہ دوسرے سے اونچا ہو۔ وہ دور تک پھیلے ہوئے پانی میں آرام سے کھڑا تھا جیسے وہ پانی کی چمکیلی سطح سے چپکا ہو، صرف کہیں اندر سے مشین کی سوئی سوئی سی آواز آرہی تھی۔ ملاح لڑکا بالٹی کے ذریعہ دریا سے پانی کھینچ کر نیچےوالے فرش کو تر کر رہا تھا۔ بالٹیاں نکالنے کے دوران اس نے اپنی ٹوپی ٹھیک کی اور خزانچی لڑکی سے جو اسٹیمر سے اترنےوالے تیرتے تختے پر کھڑی تھی چلا کر کہا:

''اے، نک چپٹی۔''

''نک‌چڑھی''، ایسی بن گئی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں اور گرینینکو نے بزرگوں کی طرح مسکراتے ہوئے دیکھا کہ وہ عمداً لاپروائی برتتے ہوئے صفائی کرنےوالی چاچی سے باتیں کرنے لگی۔ ابھی بہت سویرا ہی تھا مگر ایک لڑکا ننگے پیر سائیکل پر گودی کو پہنچ گیا تھا اور اس کا جیسا دوسرا لٹھوں سے بنے ہوئے بیڑے پر مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عورت دریا کے کنارے سے گزری اور اسٹیمر پر نظر ڈالتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھ گئی۔ مسافر تقریباً نظر نہیں آرہے تھے۔ شاید، وہ ابھی تک اپنی کیبنوں میں سو رہے ہوں۔ اچانک اسٹیمر سے اترنےوالے تیرتے تختے کی کارنس کے نیچے سے لاؤڈاسپیکر کی زوردار آواز نکلی اور سارے دریا پر پھیل گئی۔ پھر آہستہ آہستہ ریڈیو سگنل کی آوازیں پانی پر تیرنے لگیں۔ لاؤڈاسپیکر پرانے ماڈل کا تھا بالکل ڈبہ جیسا، اور اس کے اوپر ابابیلوں کے گھونسلے اس طرح چپکے تھے کہ وہ شہد کا چھتہ معلوم ہونے لگا تھا۔ شمالی ابابیلیں ٹھیک اس پر بیٹھی تھیں۔ قومی ترانے کی آوازیں ان کو ذرا بھی پریشان نہیں کر رہی تھیں۔ چڑیوں اور موسیقی کے اس اتصال پر گرینینکو مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے سوچا کہ ان ابابیلوں کی زندگی کتنی خوشگوار ہے۔ وہ موسیقی اور دنیا بھر کی خبروں سے ہم کنار ہیں۔

اسی وقت اسٹیمر دھاڑا اور ملاح لڑکے نے چستی اور صفائی سے اسٹیمر کی قنات کھول کر اس کو عرشے پر پھینک دیا اور خود بھی کود گیا۔ اس

دوران میں اس نے خزانچی لڑکی کو بھی چھیڑ دیا تھا۔ اس نے ناراض ہو کر چاچی کی لمبی جھاڑو اسٹیمر کی طرف زور سے ہلائی...

گرینینکو تنگ سیڑھیوں کے ذریعہ اوپر کے عرشے پر پہنچا جو خالی پڑا تھا۔ وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ چاروں طرف دودھیا نیلگوں آسمان، نیلا پانی اور سرسبز کنارا تھا جس پر بہت کم درخت نظر آ رہے تھے۔ وہ اسٹیمر کے تھوتھن میں پڑی ہوئی پٹریوں کی بنچ پر بیٹھ گیا جہاں ہوا جو نہ گرم تھی اور نہ سرد، پرچم کو لہرا رہی تھی۔ پھر ہوا کنارے سے گیلاس کی مہک اور مرغوں کی ککڑوں کوں ٹھیک اسی طرح لائی جیسے اس کے اودیسا صوبے کے پنچائتی فارم والے گھر میں ہوتا تھا۔ صرف وہاں گیلاس میں ایسی مہک نہیں تھی اور چیری مدتوں ہوئے پھول چکی تھی اور بہار کا احساس نہیں رہا تھا۔ یہاں یہ احساس پھر لوٹ آیا تھا اور گرینینکو کو اپنی بیوی ماروسیا یاد آ گئی۔ ارے، ماروسیا، ماروسیا... گرینینکو کو یاد آگیا کہ بہار کی بوائی کے زمانے میں اس نے بیوی کو اتنا ناراض کر دیا تھا کہ وہ رو پڑی تھی، اور جان بوجھکر ناراض کیا تھا۔ بات یہ تھی کہ ان کے بال بچے نہ تھے اور گرینینکو اکثر اس پر کڑھتا تھا۔ لیکن وہ اب بھی ماروسیا سے پہلے ہی کی طرح محبت کرتا تھا۔ بہار میں ایک بار گرینینکو نے شراب پی رکھی تھی اور اس نے آئینے میں اپنے کھچڑی بال دیکھے اور پھر کھڑکی سے اس کو پڑوسی کا لڑکا نظر آیا۔ چنانچہ وہ بیوی کو کچھ برا بھلا

کنہہ بیٹھا جس پر وہ چپکے چپکے روئی - گرینینکو کو اس کا یہ رونا اچھا لگا۔ ارے، ماروسیا، ماروسیا... سرکاری کام پر آتے وقت اس نے سردمہری سے جیسے وہ کوئی ذمےداری پوری کر رہا ہو، اپنی بیوی کی گداز کمر میں ہاتھ ڈال کر رکھائی سے اس کی سانولی کنپٹی کو بوسہ دیا تھا اور اب راستے میں اس کے بارے میں سب کچھ یاد کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے مقابلے اس کو زیادہ قابل رحم و افسوس خیال کرے لیکن بات کچھ بن نہیں رہی تھی۔

اسٹیمر ایک موڑ کے قریب آ گیا اور اس نے پھر اپنا بھونپو بجا دیا۔ کپتان نے بجرا گھسیٹنےوالی موٹرکشتی کی طرف جو ادھر آرہی تھی، اپنی کیبن سے جھنڈا لہرایا۔ یہ موڑ ایک اونچی پہاڑی کو اپنے آغوش میں لئے تھا جس کے اوپر سفید سروںوالا گرجا گھر تھا۔ اسٹیمر نے پہاڑی کا چکر لیا اور اب دریا سیدھا ہو گیا۔ ایک لمبا لٹھوں کا بیڑا اس کی طرف آرہا تھا جس پر کھینےوالوں کی جھونپڑیاں تھیں - وہاں رات کو اس گھاس پر جلائے ہوئے الاؤ جس کی نچلی تہہ مٹی کی تھی، اب ہلکا ہلکا دھواں دے رہے تھے اور بیڑا کھینےوالے پرسکون راستے سے فائدہ اٹھا کر جھونپڑیوں میں پڑے سورہے تھے، ان کے ننگے پیر جھونپڑیوں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔

گرینینکو عرشے پر دیر تک بیٹھا رہا پھر نیچے اترکر بوفے میں گیا اور وہاں تیز اور ٹھنڈی بیئر پی - نچلے عرشے پر لوگ ایک بکس پر دومینو

کھیل رہے تھے اور ملاح لڑکا اپنی دھاری‌دار قمیص کی مرمت میں لگا ہوا تھا۔

چھوٹی دو جگہوں‌والی کیبن میں ٹھیک روشن‌دان کے نیچے آنسوؤں کی طرح شفاف پانی کھل‌بل کر رہا تھا۔

''آہ، ماروسیا، ماروسیا ...،، چاہے بیئر کی وجہ سے ہو یا بے‌خواب رات کی وجہ سے گرینینکو سوفے پر ہی اونگھ گیا۔ اس کو اسٹیمر کے انجن کے شور کے درمیان شمالی دریا کی موہوم سی کھلبلاہٹ، مسافر عورتوں کی چیخ پکار اور بھونپو کی بیٹھی بیٹھی اور خمارآلود سی آواز سنائی دے رہی تھی۔

دریا لمبا اور دھوپ سے روشن تھا، لیکن اپنی خاموشی کی وجہ سے ذرا افسردہ کن بھی۔ موڑوں کی کثرت کے لحاظ سے وہ زندگی سے مشابہ تھا — طویل اور ماضی کو نہ دہرانے‌والی۔ گرینینکو احساس‌مسرت اور اسی ہلکی انجانی افسردگی کے ساتھ سو گیا۔

* * *

لیکن کہاں سے آ گئی یہ، کہاں سے اس افسردگی نے دل میں گھر کر لیا؟ جاگنے کے بعد وہ بڑی دیر تک لیٹا رہا۔ وہ لیمپ کے دھندلے شیڈ کو تکتا رہا اور اس نے جان‌بوجھ کر گھڑی نہیں دیکھی تاکہ وہ اس اذیت‌دہ لیکن پسندیدہ حالت میں رہ سکے جب انسان یہ نہیں جانتا کہ کیا وقت ہوا ہے، باہر صبح ہے کہ شام۔ گرینینکو نے خواب میں اپنے زمانے سے الگ ماضی کی بہت سی صورتیں دیکھی تھیں۔ ان صورتوں

کی ترتیب میں اب گڈمڈ ہونے لگی تھی جبکہ وہ سو نہیں رہا تھا اور اس کی یہ شدید خواہش تھی کہ وہ اپنی جگہ پر قائم رہیں، ادھر ادھر نہ ہٹیں اور گھل نہ جائیں۔
"ارے، ماروسیا، ماروسیا..."، لیکن اس نے خواب میں اس کو، ماروسیا کو، نہیں دیکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ تھی تو وہی لیکن اس کا ہیولا ضخیم اور وسیع تھا۔ اسی لئے اس کے خدوخال کے اندر دوسری عورت نظر آتی تھی، نہ کہ خود ماروسیا۔ یہ ہیولا اس قدر صاف تھا اور اس سے ایسی تلخی اور بےچینی کا اظہار ہو رہا تھا کہ گرینینکو بیداری کے بعد بھی چند منٹ تک اصلی ماروسیا کو یاد نہ کر سکا، اپنی بیوی کو جیسی کہ وہ تھی۔ آخرکار اس کو بیوی یاد آ گئی جیسی کہ وہ واقعی تھی اور خواب سے وابستہ واھمہ اس سے الگ ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر گرینینکو بےاختیار ہو گیا اور غم سے جل اٹھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ماروسیا نہیں بلکہ مدتوں قبل والی اور پہلی محبوبہ کھڑی تھی اور اب گرینینکو کو پتہ چلا کہ اس میں یہ تھکا دینےوالا اور انجانا غم کیسے ابھرا تھا۔ وہ تو صبح ھی کو دریا کی گودی پر بیدار ہو چکا تھا جب اس نے گیلاس کی تلخی‌آمیز میٹھی مہک اور دریائی پانی کی خنکی بھری مہک محسوس کی تھی۔ وہ مہکیں جو یہاں، شمال میں مدتوں پہلے جنگ کے دوران موسم گرما میں سبزہ زاروں پر بکھری تھیں...
گرینینکو نے منہ دھویا اور خاموشی سے عرشے پر چلا گیا، اس کا چہرہ کشیدہ تھا۔ وہ احتیاط سے قدم

رکھ رہا تھا جیسے وہ ان نہ واپس آنے والی چنگاریوں کو کھونے سے ڈر رہا ہو جنھوں نے خواب کی حالت میں اتنی واضح خوشی پیدا کی تھی۔

وہ اسٹیمر کو پہچان نہ سکا۔ اب دھوپ دوسری طرف سے آرہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اسٹیمر پیچھے کی طرف جا رہا ہے۔ ہر جگہ مجمع تھا۔ مرد، عورتیں اور بچے بکسوں، سیڑھیوں اور سوٹ کیسوں پر بیٹھے تھے۔ کہیں کوئی بچہ رو رہا تھا، کسی نے کوئی گیت چھیڑ رکھا تھا اور کوئی ہارمونیم بجا رہا تھا۔ ایک بنجارن چنٹ دار لہنگا پہنے، مجمع سے گھری بیٹھی تھی اور گھبرائے ہوئے نوجوان لڑکے کی قسمت کے بارے میں بتا رہی تھی: ''ارے، گبرو، تیرا ہاتھ تو سونے کا ہے، تیری بڑے مزیدار ملاقات ہوگی، دل و جان سے پیار کی باتیں ہونگی۔ ادھر لا سونا، کمی نہ کر، تیرا ستارہ بڑا روشن ہے، پیارے، چلتے پھرتے ملنے والوں سے بچنا۔'' کسی نے کوئی زوردار چٹکلا چھوڑا، زور کا قہقہہ پھوٹ پڑا، پھر اسٹیمر کا بھونپو گونجا، پھر دونوں طرف سرسبز کنارے اسٹیمر کے قریب آ گئے اور زوردار لہریں اسٹیمر کے پیچھے لڑھکنے لگیں۔

بوفے میں لوگوں کو ہلکے سے ٹھیلتا ہوا گرینینکو اسٹینڈ تک پہنچا۔ اس نے چیری کی رنگین مہک دار شراب کا ایک گلاس لیکر کھانے کا آرڈر دیا اور ایک جگہ پر جو ابھی خالی ہوئی تھی بیٹھ گیا۔ اس میز پر ایک بھاری بھرکم بوڑھا بیٹھا تھا

جو ذرا نشے میں تھا۔ اس کے خطوخال خاص طور سے شمالی تھے۔

''سمجھے نا، شوربہ کھایا، لیکن لگتا ہے جیسے وہ میرے پاس رکھا ہو،، اس نے ہنس کر کہا ''سوچتا ہوں کہ کچھ سرخ شراب ہی ہو جائے...،،

یہ بزرگ اپنی نیلی قمیص کے اوپر بھورا سوتی سوٹ پہنے تھا اور اس کے اونچے جوتوں سے تارپین کی بو آ رہی تھی۔ اوپر دیکھتی ہوئی صاف آنکھوں سے سمجھداری اور معصومیت کا اظہار ہوتا تھا اور ہونٹوں پر برابر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کی پھٹی پھٹی آلو جیسی ناک پر خوشگوار جھریاں تھیں۔

''کیا دور جا رہے ہیں آپ ؟،، گرینینکو نے پوچھ لیا۔

''کیا دور، صرف دو اسٹیشن اور بیکاری سے بہت اکتا گیا ہوں۔ آپ کہاں جا رہے ہیں، میں آپ کا نام اور خاندانی نام نہیں جانتا۔،،

''ایوان دانیلووچ،، گرینینکو نے جواب دیا۔

''اور میں بھی ایوان ہوں،، اس نے اپنے بڑے سے ہاتھ میں شراب کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا ''آؤ ٹکرائیں جام، ملاقات کے لئے، اچھی اشتہا کے لئے۔،،

گرینینکو کو فوراً ہی ہلکا سا نشہ ہو گیا۔ اس نے سادا سا کھانا کھایا اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اس کے اندر میل‌ملاپ کا طوفان زور مار رہا ہے، باتیں کرنے لگا:

''... کہتے ہو کہ جنگل کم رہ گیا۔ تمہارا جنگل تو ہماری جان کو آگیا ہے۔ ایک ایک ٹہنی

کے لئے پیسہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ لٹھے کے لئے پیسہ دینا، ریلوے کے ڈبے کے لئے پیسہ دینا اور پھر ٹریکٹر ڈرائیوروں کو بھی دینا۔"

گرینینکو کو اچانک تاؤ آ گیا۔ تاؤ اس پر آیا کہ پھر ڈھرے کی، روزمرہ کی باتیں شروع ہو گئیں اور اس کے خواب کی تفصیلات پھسل کر غائب ہونے لگیں۔ اس نے اپنے حافظے میں ان باتوں کو مستحکم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے جن سے اس میں ہیجان پیدا ہوا تھا، جو اس کے لئے بے حد عزیز تھیں، وہ بوڑھے کی باتیں سنتا رہا۔ بوڑھا بھی الفاظوں کو گول بولنےوالے لہجے میں جنگ کے زمانے کے اس موسم گرما کا ذکر کرتا رہا جو گرینینکو نے ان علاقوں میں گزارا تھا۔ یہ اسی طرح کی باتیں تھیں جو اس نے گول شمالی لہجے میں اس خاموش شمالی دیہات میں سنی تھیں جس پر گھاس کاٹنےوالے سپاہیوں نے شہد کی مکھیوں کی طرح دھاوا بولا تھا۔

"جانتا ہوں، بڑا خرچ ہے!" بوڑھے نے کہا "کاشکہ ہمارا جنگل تمھاری عمارتوں کے قریب پہنچ سکتا اور تمھارے یہاں کی گرمی ہمارے کھیتوں کو فائدہ پہنچا سکتی۔ سارا کام قدرت نے بےڈھنگےپن سے کیا ہے۔ ہاں میں،" بوڑھے نے سگرٹ کا کش لیا "ہاں میں، جب لڑائی پر گیا تو میں نے دیکھا کہ ان جگہوں پر لوگوں کی کیا حالت ہے جہاں جنگل نہیں ہیں۔ وہ اپنے گھروں کو گھاس اور گوبر سے گرم کرتے ہیں۔ ارے، ان کو کیا کہتے ہیں..."

"اپلے۔"

''ہاں، ہاں، یہی۔ تم نے خود بھی سپاہیوں میں کام کیا ہے؟''

''لڑا ہوں'' گرینیتکو نے ہاتھ ہلا کر کہا ''محاذجنگ تک گیا اور ان علاقوں میں آنا ہوا۔ آپ کے یہاں گھاس کاٹنے آئے تھے۔''

''اچھا'' بوڑھے نے پرخلوص خوشی سے کہا ''اور میں نے بھی جنگ بھگتی ہے، ٹھیک اس کی آگ سے گزرا ہوں، چار زخم اٹھائے۔ پتہ نہیں، کیسے زندہ بچا۔ لیکن ایوان دانیلووچ، اب میری زندگی اچھی خاصی ہے، بڑی بیٹی کی شادی کی تقریب میں شاجی رہا ہوں۔''

''ایک ہی بیٹی ہے کیا؟'' گرینیتکو نے پوچھا۔

''ایک کیسے، تین ہیں۔ دو میرے ساتھ جا رہی ہیں اور وہ بڑی کئی دن ہوئے جا چکی ہے۔ وہ اسی علاقے میں ماہرزراعت ہے۔''

بوفے میں شور ہونے لگا۔ بنجارن پھر آ گئی، ہارمونیم کی آواز اس شور میں ڈوب گئی۔ کھڑکیوں سے وہی سرسبز کنارے، لٹھوں کے بیڑے، بجرے کش اسٹیمر ایک موڑ سے دوسرے موڑ تک گزرتے نظر آ رہے تھے۔

''... اچھی لڑکیاں ہیں'' بوڑھے نے کہا ''سرخ بیریاں ہیں، لڑکیاں نہیں، پنچائتی فارم میں نوجوانوں کا سارا جتھا پاگل ہے ان کے پیچھے۔ نیک لڑکیاں ہیں، میرے لئے شکایت کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایوان دانیلووچ، ہم اوپر چلیں گے تو تم خود دیکھ لوگے، خدا کی قسم!''

بوڑھے نے تین روبل کا نوٹ نکالا اور پھر شراب خریدی۔ گرینینکو نے دیکھا کہ وہ بوفے والی سے اصرار کر رہا ہے اور اپنی سخت انگلی سے اس کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہہ رہا ہے ''ارے، کیا ہوا جی تم کو، ارے، کیا میں بدمست ہو گیا ہوں؟ میں کیا بدمست ہوں، بھلا یہ بھی کوئی بدمستی ہوئی؟،،

وہ دونوں اوپر چلے گئے۔

پہلے کی طرح ایک موڑ نے دوسرے کی جگہ لے لی، لٹھوں کے بیڑے سانپوں کی طرح لہرا رہے تھے، دریا کے اوپر خراماں خراماں تیرتے ہوئے بادل مرغولوں کی صورت میں نیلے آسمان پر نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے اس سنہری تاریکی کو ڈھک لیا تھا جو شام سے پہلے وسعتوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔

''بچیو، کہاں ہو میری بچیو؟،، بوڑھا شرارت آمیز لہجے میں چلایا۔ اس کو شراب نے بہت ہی زندہ دل بنا دیا تھا۔ وہ سوٹ کیسوں اور ٹوکریوں کے درمیان چل رہا تھا۔ ''وہ رہیں میری بچیاں، میری پیاریاں! زینوشکا!،،

''ارے، تم نہ جاؤ، آؤ یہاں بیٹھیں،، گرینینکو نے کہا اور بوڑھا تیار ہو گیا۔

ان دونوں نے آگ بجھانے والے ڈبے کے اوپر اپنا ٹھکانا بنا لیا اور گرینینکو نے سگرٹ پیتے ہوئے دونوں بہنوں پر نظر ڈالی اور پھر اس نے ٹھیک خواب کی طرح مسرت اور ناقابل فہم ہیجان محسوس کیا جو ذرا بھی مردانہ نہ تھا بلکہ ایک طفلانہ افسردگی سی تھی۔ اب وہاں، اسٹیمر کے سرے پر ایک اور ہارمونیم گونج رہا

تھا، وہ نہیں جو نچلے عرشے پر تھا، بلکہ دوسرا اور یہاں چوپائیاں نہیں بلکہ ایک لمبا گیت گایا جا رہا تھا جس سے گرینینکو ناواقف تھا۔ اس گیت کی دھن ان سے ضرور ملتی تھی جو گرینینکو نے مدتوں ہوئے ان اطراف میں سنی تھیں۔ اس کو محسوس کر کے اس کا ہیجان بڑھتا گیا۔ دونوں بہنیں ہارمونیم بجانےوالے نوجوان کے پیچھے کھڑی تھیں، وہ غالباً گا نہیں رہی تھیں، گرینینکو کو صرف ایک پہلو سے نظر آ رہی تھی۔ دونوں سفید، بھری بھری بالکل خوبصورت سانپ‌چھتریوں کی طرح تھیں۔ ان کے لباس ہلکے تھے اور وہ ایک دوسرے کو سہارا دے رہی تھیں۔ ملاح لڑکا چپکے سے ان کے قریب پہنچ گیا، غالباً ان کو بھی "نک‌چپٹی،، کا خطاب عطا کیا اور اپنی انگلیوں سے کوئی کرتب دکھایا۔

"زینوشکا!،، باپ نے ایک بیٹی کو پکارا "یہاں آؤ، ہمارے لئے گلاس لاؤ اور سموسوں‌والی ٹوکری بھی ادھر کھینچ لانا۔ ہاں یہ رہی، جیسی شراب ویسی ڈاٹ!،،

بوڑھا شراب کی بوتل کی مہر توڑنے لگا۔ گرینینکو نے گداز اور پستہ قد لڑکی پر نظر ڈالی اور اسکے سینے میں اچانک کوئی چیز ابل سی گئی۔ وہ ٹوکری کے ساتھ عرشے پر قریب سے قریب‌تر آتی گئی اور مدتوں پرانا، فراموش کردہ احساس، شیریں اور ہیجان‌آمیز مسرت اس کے قدموں کے ساتھ برابر ابھرتی گئی اور گرینینکو کی وہ جنگ کے زمانےوالی جوانی بالکل واپس آ گئی جب وہ بیس سالہ سپاہی تھا

اور اس کو گھاس کاٹنے والی دوپہر میں اسی طرح کی پیار بھری نگاہوں سے دیکھا گیا تھا، جب گناہ کی طرف رغبت دلانے والی سفید راتیں گھاس کے اونچے ڈھیروں پر پگھلتی معلوم ہوتی تھیں۔ اس نے آنکھیں ہٹا لیں۔ لیکن پھر دیکھنے لگا۔ یہ وہی آنکھیں، وہی بڑی محراب دار پلکیں تھیں۔ حتی کہ کان کی سفید لو اور گردن پر گرتی ہوئی بالوں کی لٹ ایسی انوکھی اور ہیجان آمیز تھی کہ گرینینکو کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا اور وہ جلدی سے تین گھونٹوں میں شراب چڑھا گیا۔

لڑکی آکر برابر کھڑی ہو گئی اور باپ کی قمیص کا بٹن لگاتے ہوئے مسکرائی اور بوڑھے نے اپنے لئے شراب اونڈیلتے ہوئے کہا:

''دانیلووچ، اب اس کی شادی کی باری ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ بیٹی غیر کا خزانہ ہوتی ہے۔ زینوشکا!،،

لیکن زینوشکا شرما کر بہن کے پاس، گیتوں اور شام کی گرم اور خوشگوار ہوا کے پاس بھاگ گئی تھی اور گرینینکو ایسا بدحواس ہوا کہ اس نے بوڑھے کی بات تقریباً نہیں سنی۔

''... ایک کے بعد ایک سب بھاگتی جا رہی ہیں۔ مقدس ماں! ہاں، بھائی دانیلووچ، زندگی اسی کا نام ہے۔ تمہارے ہے ایسی وراثت؟،،

گرینینکو نے دیر تک اس سوال کا جواب نہیں دیا پھر چونک کر کہا کہ نہیں، اس کے بچے نہیں ہیں۔ نئے دریائی موڑ نے ایک دلکش میدان کا

انکشاف کیا، اسٹیمر کے بھونپو نے پڑوسی کی ھمدردانہ خاموشی کو توڑ دیا اور دونوں مردوں نے بوتل سے ھی منہ لگا کر شراب ختم کر دی۔

''لڑکیاں، لڑکیاں...،، بوڑھے نے ھوشمندی سے سر ھلایا ''لڑکیاں، دانیلووچ، یہ بھی اچھی بات ھے لیکن اگر ایک لڑکا گھر میں ھوتا تو مجھے کسی اور چیز کی ضرورت نہ تھی۔ مجھے یاد ھے جنگی کمیٹی نے طلب کر لیا اور میں اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گیا اور بیوی کو اس حالت میں چھوڑ گیا، اس کے پیر بھاری تھے نا! میں نے کہا ناستیا، دیکھ تو دو بیٹیاں جن چکی ھے، اگر اس بار تو نے بیٹا نہ دیا تو سارے گاؤں میں بدنامی ھوگی۔ پھر رخصت ھوا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس طرح اس کو بدحواسی کی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا...،،

کچھ لڑکوں کی آوازیں بھی لڑکیوں کے ساتھ شامل ھو گئیں۔ ان کی یہ سنگت بےھنگم اور بھدی تھی۔ دراصل لڑکے گاتے ھوئے شرما رھے تھے۔ وہ مذاق میں اپنی آواز کی وہ نزاکت چھپا رھے تھے جو مردوں کےلئے زیبا نہیں ھے۔ بہت سی عورتیں جو اپنی گٹھریوں پر بیٹھی تھیں خاموش اور غمگین سی ھو گئیں اور ایسا لگ رھا تھا کہ اسٹیمر نے بھی اپنی گرم سانسوں کو دبا دیا ھے۔

اسی طرح زمین خاموش اور عورتیں غمگین ھوئی تھیں، جب سپاھی، دن بھر کی کاٹی ھوئی گھاس کے گدے بنا کر کسی گھر سے ایک ھارمونیم لائے تھے جو اپنے مالک سے محروم ھو چکا تھا اور گاؤں میں

انھوں نے گیت گائے تھے۔ تبھی ایک گیت کے دوران گرینینکو اپنی پہلی اور آخری محبت سے ہم کنار ہوا تھا۔ یہ ملاقات گھاس کے باڑے میں ہوئی تھی جب وہ تقریباً لڑکا تھا، جب سفید رات اتنی روشن تھی کہ ناستیا نے صاف طور پر دیکھا تھا کہ شرم کا رنگ کتنی تیزی کے ساتھ اس کے سبزہ‌آغاز گالوں پر پھیل گیا تھا۔ بہت دیر بعد وہ گھر میں تین ننھی بیٹیوں کو سلاکر اس کے پاس سائبان میں آئی تھی جب بہت دیر تک مرغ بانگ دیتے رہے تھے۔ اس دوران میں شرم جاتی رہی تھی اور اس کی جگہ ہمت، فخر اور مردانہ اعتماد نے لےلی تھی جو بعد میں محاذجنگ پر کام آئے...

گرینینکو بوڑھے کی آواز سنکر چونک پڑا اور اپنے آپ میں واپس آ گیا۔

"... مجھے یاد ہے کوشبا میں ہمارا دستہ منظم کیا گیا لیکن وولخوف کے قریب جرمنوں نے ایسے زور کا دھکا دیا کہ ہمارے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ چنانچہ پھر ہماری تنظیم کی گئی۔ مجھے یاد ہے ہم ننگے کھیتوں پر جا رہے تھے پورے دستے میں سے تین باقی رہ گئے تھے۔ مقدس ماں! کیا نہیں ہوا، کیا نہیں دیکھا! پھر دوسری بار اور تیسری بار زخمی ہوا۔ جنوب مغربی محاذ جنگ پر پہنچ گیا۔ کمانڈر کے زمین‌دوز مرکز میں طلبی ہوئی۔ "کیا نام ہے؟" میں نے بتایا "گروموف"۔ دیکھتا کیا ہوں۔ میرا خط ہے۔ کھول کر پڑھا۔ پھر لڑکی پیدا ہوئی۔ اس ناخوشگوار واقعے پر سردھنا اور لڑائی پر روانہ ہو گیا۔

اگر لڑکی پیدا ہوئی تو لڑکی ہی سہی، کیا کیا جائے۔ وہاں پھر میں زخمی ہوا۔ اسپتال میں مجھے ہوش آیا۔ یہ اورال کے بہت پیچھے تھا۔ اسپتال میں مجھے اچھا کھانا پانی ملا، آرام سے لیٹا رہا اور پھر محاذ پر واپس گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ اب وہ حالت نہیں رہی ہے۔ اگر جنگل بڑھا ہے تو کلہاڑیوں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت جرمن ٹھنڈے پڑ چکے تھے اور ہمارے لوگ باوقار ہو گئے تھے۔ پہلے کی طرح نہیں تھا کہ دھاوا کرتے وقت اماں کو پکارتے یا اول فول بکتے۔ اب لڑائی ایسی نہیں رہی تھی اور خوراک بھی اچھی ہو گئی تھی، سنتے ہو نا دانیلووچ؟''

گرینینکو کا دل سچ مچ منہ میں آگیا، ٹھہر گیا اور پھر پسلیوں کو گودنے لگا۔ اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے اپنا چہرہ دبا لیا اور اپنے گالوں پر ان کو پھیرنے لگا۔

''کیا کہا تم نے، بیوی کا نام ناستیا تھا؟''

''ناستیا۔''

بوڑھا اپنی سگرٹ نہ جلا سکا۔ دیاسلائی نہ لے سکا، تیلی اس کی سخت انگلیوں میں ٹوٹ کر رہ گئی۔

''اور گاؤں کون سا ہے تمھارا؟''

''دانیلووچ، گاؤں کا نام رودنیچکی۔''

''رودنیچکی، رودنیچکی...'' بھلا گرینینکو اس پرسکون رودنیچکی کو بھول سکتا تھا، بھلا وہ سرخ بیری کی جھاڑیوں سے بھرے باغیچے والے گھر کو فراموش کر سکتا تھا۔ ''وہ، وہی ہے، رودنیچکی کی ناستیا۔''

ساتھی کے الفاظ گرینینکو کی کنپٹیوں پر سخت ہتھوڑوں کی طرح پڑ رہے تھے۔

''... ہاں تو، میں کیا کہہ رہا تھا؟ ہاں، عورت اور جنگ کے بارے میں۔ میں لڑتا لڑتا کارپیتھیا تک پہنچ گیا۔ پھر زخمی ہو گیا۔ میرے جسم پر کوئی ثابت جگہ نہیں ہے۔ پہلے بیوی کے پاس سے خط آئے اور پھر بند جو ہوئے تو نہ آئے۔ ایک بار خط آیا تو بڑی بیٹی نے لکھا تھا، اپنی ٹیڑھی میڑھی لکھاوٹ میں، اسکول کی کاپی کے کاغذ پر۔ اسکو دیکھ کر میرا دل اچھل گیا۔ سوچا، معاملہ کیا ہے؟ خط میں لکھا تھا 'پاپا، جلدی گھر آجاؤ، ہم تمہارے منتظر ہیں' اور ماں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں تھا۔''

''کیا کہتے ہو، نہیں لکھا؟'' گرینینکو نے ناراضگی سے سگرٹ کا ٹکڑا دریا میں پھینک دیا اور ہتھیلیوں سے سر دبا لیا۔

''کاشکہ ایک لفظ لکھا ہوتا! اچھا، میں لڑائی چھوڑ کر اپنے علاقے لوٹا۔ گھر تک گھوڑا گاڑی سے چالیس کلومیٹر کا راستہ رہ گیا تھا۔ چائے خانے گیا۔''

گرینینکو نے آنکھیں بھینچ کر بند کر لی تھیں اور بے حس و حرکت بیٹھا، خاموشی سے سن رہا تھا، اس کے پپوٹے سے دب کر آنکھ کی جھریوں پر ایک چمکتا ہوا قطرہ آگیا تھا اور کھال کے نیچے عضلات میں تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے سامنے پھر آنکھیں چمک اٹھیں، ویسے ہی جیسی اسٹیمر پر اس لڑکی کی تھیں اور گیلاس کی مہک بھی اسی طرح روح

20•

میں سرایت کر گئی، ہر طرف الفاظ کو گول بولنےوالا شمالی لہجہ گونج گیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں، سورج اور دریا کی تیز نیلاہٹ نے اس کو خیرہ کر دیا اور پھر اسٹیمر کے بھونپو نے ایک نئے موڑ کا اعلان کرتے ہوئے ایک سکنڈ کےلئے اس کے پڑوسی کی آواز کو ڈبو دیا۔

"... ہاں تو میں چائےخانے چلا گیا۔ دیکھتا کیا ہوں، ساشا میرا پڑوسی وہاں بیٹھا ہے، اس کی بکواس سے سارا ہال گونج رہا ہے، وہ بھی زندہ بچ گیا تھا اور مجھ سے پہلے گھر لوٹ آیا تھا لیکن بالکل صحیح سلامت نہیں، پیر کٹ گیا تھا۔ ہاں یاد ہے مجھے، ہم نے کچھ پی تو وہ اور زیادہ شور کرنے لگا، اپنی قمیص نوچنے لگا۔ میں نے کہا 'ساشا، تجھے کیا ہوا، تو زندہ لوٹا، بہرحال زندہ تو رہنا ہی ہے۔، وہ بولا 'چپ رہو، گروہوف، سارے گاؤں میں تم اور میں لنگڑالولا رہ گیا ہوں، اور میں نے اسے بتایا کہ میں بھی بالکل چھلنی ہوں۔، سوراخ ہی سوراخ، سارا جسم زخموں کے نشانوں سے بھرا پڑا ہے، بہرحال اب وہ سب واپس آنے کا نہیں۔ ارے، سر تو سلامت بچ گیا۔ میں نے پوچھا کہ گاؤں میں لوگ کس طرح ہیں؟ اس نے جواب دیا 'وانیا، ساری عورتیں بالکل عورتوں کی طرح، جن کے مرد مارے گئے یا جن کے زندہ بھی ہیں چھنال ہو گئیں۔، میں بولا 'ارے، ساشا، تو ناحق یہ کہتا ہے، بھائی، جہاں جھونپڑی ہوگی وہاں جھینگر ضرور ہوں گے۔ اگر سارے مرد، سوائے تیرے مار ڈالے گئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ساری عورتیں سوائے

تیری عورت کے اچھی ہیں ۔، اور وہ چلایا 'ارے، تو گروموف، سوچتا ہے کہ تیری عورت میری عورت سے زیادہ اچھی ہے؟ کہتے ہیں کہ وہ بھی سپاہی سے پھنس گئی اور وہ بھی خالی خولی نہیں، جاؤ، گھر جا کر نیا پھل دیکھو ۔، میرا کلیجہ منہ کو آ گیا، جیسے کسی نے ابلتا ہوا پانی میرے اوپر ڈال دیا ہو۔ میں نے پوچھا کہ سپاہی کہاں سے آ گئے۔ محاذجنگ تو ہمارے یہاں نہ تھا۔ 'اور گھاس، ساشا چلایا 'توپخانے کے لئے دو گرمیوں میں کس نے کاٹی؟، مجھے چاہئے تھا کہ میں سیدھا ساشا کے ساتھ گاؤں چلا جاتا۔ اس کے پاس گھوڑا گاڑی تھی لیکن میری شامت جو آئی تو پینے لگا۔ سوچا کہ جہاں ٹکڑے ہوں گے وہاں خیرات بھی ہوگی۔ اتنی پی کہ سارا ضلع گونج گیا، جتنا بھی پیسہ اور مال‌غنیمت کی گھڑیاں اپنے پاس تھیں سبھی تو دو دن میں بیٹھ کر پی ڈالیں۔ ساشا نے تو اپنے گھوڑے پر کوڑا سڑکایا اور چلا گیا اور میں بدمست رہا۔ بیکار ہی تو یہ کیا۔ کوئی آفت تو نہ آجاتی اگر میں ساشا کے ساتھ اسی وقت گاؤں چلا گیا ہوتا۔ ظاہر ہے ساشا گھر گیا اور بتایا کہ گروموف گھر آ رہا ہے، اس نے خوب مزے اڑائے ہیں... تیسرے دن جب مجھے ہوش آیا تو گاؤں پہنچا۔ سوچا کہ نبٹ لونگا عورت سے ۔ میں تو جنگ سے پہلے اس 'قوم، کی رگ رگ سے واقف ہو گیا تھا۔ اچھا، جو ہوا سو ہوا۔ زندہ تو رہنا ہی ہے، ہمارے بھائی بھی غیرجگہوں پر کوئی پاکدامن نہیں رہے ہیں، انھوں نے بھی گلچھرے اڑائے ہیں، سوچا کہ

اب بیٹیوں کو پالنے کی ضرورت ہے، اس بیوقوف عورت کی پیٹی سے ذرا گرد جھاڑ دونگا اور پھر زندہ رہنا ہے - ارے، میں چوکھٹ تک پہنچ گیا، دل کے اندر بہت ہی زور کا درد اٹھا، کوئی مجھ سے ملنے نہیں آیا، دروازہ کھلا تھا اور گھر میں سناٹا تھا۔ بڑی بیٹی دوڑ کر آئی، میرے پیروں سے لپٹ گئی، وہ ایسی چھوٹی سی تھی اور چیخ کر رونے لگی۔ میں نے اس کو گود میں اٹھا لیا اور جھونپڑی کے اندر گھسا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ لوگ تو بہت سے ہیں لیکن سب چپ اور ملیشیا کا ایک سپاھی میز کے قریب بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے -میں نے کہا 'عورتو، بھلا سپاھی کا سواگت اس بری طرح کرتے ہیں؟ میری ناستیا کہاں ہے؟' ناستیا نے کونے سے آکر میرے گلے میں ھاتھ ڈال دئے - میں نے اس کو ذرا جھٹک دیا اور کہا کہ ٹھہر بعد کو بات کرینگے، لوگوں کی موجودگی کے بغیر - عورتیں اور پڑوسی جو وھاں تھے وہ تو چلے گئے لیکن ملیشیاوالا نہیں ھٹا- میں نے کہا 'ارے، اچھے نوجوان، تو میرے گھر میں کیا بھول گیا ہے؟ رفوچکر ہو جاؤ یہاں سے- میں نے لڑائی میں ایسے بہت دیکھے ہیں-، اس نے میری طرف دیکھا اور وہ بھی چلا گیا- اب وہ اور ھماری بیٹیاں رہ گئیں- میری ناستیا میری طرف دیکھتی رھی، دیکھتی رھی- وہ آنکھیں مجھے یاد ہیں، ٹھیک ایسی تھیں جیسی اب زینوشکا کی ہیں، بڑی بڑی اور خمارآلود... اچھا، میں نے کہا 'سماوار کیوں نہیں گرم کرتی ، دوکان کو کیوں نہیں دوڑتی؟ شاید، میں خود ھی سماوار چالو

کرونگا، اس کے لئے چھپٹیاں کاٹونگا؟، وہ دھڑ سے
میرے پیروں پر گرپڑی ۔ میں نے کہا 'اٹھ، بیوقوف
کہیں کی، میں کوئی خدا تو نہیں ہوں ۔ ، پیٹی
کھول لی، سوچا کہ چوتڑ پر دو ایک رسید کرونگا
اور پھر سماوار گرم کرنے دونگا ۔ بولا 'ارے، پتھر
کی طرح جم کیوں گئی؟، 'ایوان، معاف کر دے،
یہ کہہ کر پھر دھڑ سے میرے پیروں پر آ رہی ۔
میں نے کہا 'بچہ کہاں ہے، دکھا ۔ ، بولی 'وہ
رہی میری بے حیائی بنچ پر، میں اس کی صورت نہیں
دیکھنا چاہتی اور تم کو بھی نہ دیکھنے دونگی، میں
نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہے ۔ ، اس نے چیتھڑوں پر
تھوک دیا ۔ دیکھا بچہ مرا پڑا تھا ۔ میں نے کہا
'ارے، چڑیل تو نے یہ کیا کیا، احمق کہیں کی کیا
کر بیٹھی؟ جنگ سے پہلے میں نے تجھے یہی سکھایا
تھا کہ جیتی جان کا گلا گھونٹ دے؟، سوچا کیسی
بیوقوف ہے یہ، ارے، وہ کسی کا بھی تھا، بہر حال
زندہ جان تھا ۔ میں نے کہا 'ساری زندگی ہم دونوں یہ
انتظار کرتے رہے کہ تو بیٹا جنے اور تو نے اس
کو... ارے، ایک مرد گھر میں پلتا بڑھتا، بیٹیوں
کے لئے بھی دل بہلانے کا سامان ہو جاتا، میں بھی
خوش ہوتا اور تو... ارے، میں نے ذرا تیری گرد
جھاڑ دی ہوتی اور بات ختم ہو جاتی ۔ اور اب...
میں ایک ننھی ننھی بچیوں کا تیرے بغیر کیا کرونگا ۔
نہ کپڑے سینا، نہ دھونا تو بھی مفت کی روٹی اڑائے گی ۔
اسی لئے میں نے اپنا خون بہایا؟، یقین ماننا، دانیلووچ،

میں بنچ پر بیٹھ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ ساری لڑائی جھیلی، نہیں رویا لیکن وہاں رو پڑا...''

''بچہ اچھا تھا؟،، گرینینکو نے ہونٹ کاٹتے ہوئے بہنوں کی طرف دیکھا۔

''موٹا تازہ، بڑے بڑے ہاتھ، پیر اور چوڑی ہڈی‌والا۔ ایسے پڑا تھا جیسے زندہ ہو۔ میں بنچ پر بیٹھا رہا، بچیوں کو گود میں بٹھالیا اور ایک لفظ نہ بولا۔ بس یہی سوچتا رہا اس پگلی نے کیسا اچھا بچہ مار ڈالا۔،،

بوڑھے نے آنکھیں بھینچیں اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہا ''بیٹیو، میری بیٹیو کہاں ہو؟،، بیٹیوں کو دیکھ کر پھر اس کے پورے جھریوں‌دار چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے بڑے بڑے ہاتھ کہاں رکھے۔ چنانچہ ان کو جیبوں میں ڈالکر سگرٹ ڈھونڈھنے لگا۔

''دانیلووچ، ہاں، دانیلووچ؟ ایک اور بوتل ہو جائے نا؟ زینوشکا!،،

... اسٹیمر کا بھونپو پھر بھاری آواز میں گونجا۔ اس کی آواز ہلکی سی خرخراہٹ کے ساتھ شام کے ٹھنڈے ہوتے ہوئے دریا پر پھیل گئی۔ کنارے پر بچوں کے جلائے ہوئے الاؤں سے ہلکی ہلکی جلن کی سہک آ رہی تھی، ہارمونیم کے مدھم سا پھر چھڑ گئے تھے۔ ملاح لڑکا اسٹیمر کے راستے پر پیر پٹکتا کپتان کی کیبن کے پیچھے غائب ہوگیا۔ دونوں

بہنوں نے ٹوکریوں کو ٹھیک ٹھاک کیا اور سویٹر پہن لئے۔

''اچھا، تو پھر کیا ہوا؟،، گرینینکو نے آہستہ سے پوچھا۔

''پھر، پھر کیا ہوا؟ پھر کچھ نہیں، اطمینان سے رہنے لگے۔ لڑکیوں کی دیکھ بھال میں لگ گیا۔ ان کے بڑے ہونے تک بڑی مشقت کرنی پڑی۔ رنڈوا بچوں کا باپ نہیں ہوتا بلکہ خود پوری طرح یتیم ہوتا ہے۔ بیٹیو، زینوشکا! دیکھنا نیچے میرا برساتی کوٹ ہے، اس کو بھولنا نہیں! میری ناستیا کو آٹھ سال کی سزا جھیلنا پڑی لیکن بعد میں ہمارے یہاں نہ آئی۔ دوسرے صوبے میں اپنی بہن کے یہاں چلی گئی۔ پہلے تو میں نے شادی نہیں کی۔ عورتوں سے مجھے ایسی نفرت سی ہو گئی۔ خود کپڑے دھوتا، چولھا جلاتا، عورتوں کا سب کام اچھی طرح کر لیتا، البتہ سموسے تیار کرنا کسی طرح نہ سیکھ پایا، ہر طرح سے ناکامیابی ہوئی۔ پھر بڑی بیٹی جوان ہو گئی، دوسری بھی اچھی خاصی مضبوط ہو گئیں۔ دیکھو تو کیسی ہیں یہ میری بیٹیاں! میں ان کے لئے کسی چیز سے ہاتھ نہیں روکتا، ہر ایک کے پاس چھہ چھہ جوڑے کپڑے ہیں۔ سگرٹ نہیں خریدتا تھا، تمباکو پر ہی گزر کر لیتا تھا لیکن لڑکیوں کو کپڑے اچھے پہناتا تھا۔ دانیلووچ! میں اچھی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں!،،

بوڑھے نے ایک پرانا گیت چھیڑ دیا۔ اسٹیمر کے بھونپو کی طرح اس کی آواز میں بھی خرخراہٹ

تھی۔ وہ گاتے ہوئے جلدی سے کھڑا ہو گیا ''اچھا، دانیلووچ، وقت ہو گیا، جلد ہی میرا اسٹیشن آ رہا ہے۔ بیٹیاں میری بڑی اچھی ہیں۔ بیٹیو، زینوشکا!،،

گرینینکو بھی کھڑا ہو گیا۔

''اچھا تو وہ ابھی زندہ ہے نا؟،، اس نے بوڑھے سے پوچھ لیا۔

''جوان، مجھے یہ پتہ نہیں۔ خط نہیں آتے اور میں کہاں لکھوں؟ اور کیوں۔ اب تو زندگی کی شام آن پہنچی۔ صرف یہی لڑکیاں دل کی راحت ہیں، بس ان کی شادیوں میں ناچنے کی تمنا ہے۔،،

اس نے گہری سانس لی اور ٹوپی پہن لی۔

اسٹیمر ایک چھوٹے سے صاف ستھرے اسٹیشن کے قریب آ رہا تھا۔ اب بالکل شام ہو چکی تھی۔ گہرا سرخ سورج اگلے موڑ کے پیچھے غروب ہو گیا۔ ہارمونیم کی آواز آخری بار گونج کر خاموش ہو گئی، بہت سے لوگ اپنی چیزیں ٹھیک ٹھاک کرنے لگے۔ دور دوسرے کنارے پر گھاس کاٹنےوالی مشین کی آواز آ رہی تھی، گیلاس کے پھولوں، دریائی پانی اور دور جلتے ہوئے الاؤں کی مہک اسی طرح آ رہی تھی۔ بڑی بہن زینا برساتی کے لئے نیچے بھاگ کر گئی اور اس کو لاکر پیار کے ساتھ باپ کے کشادہ شانوں پر ڈال دیا۔ گرینینکو نے نہیں سنا کہ لڑکیاں کس پیار سے باپ کے اوپر ہنس رہی تھیں اور اس کا کوٹ پکڑ کر اسے اسٹیمر سے اترنےوالے راستے کی طرف کھینچ رہی تھیں۔ گرینینکو نے بڑی لڑکی زینا کو دیکھا اور وہ پرانا درد، اس کی سپاہیانہ جوانی کا درد اور

محبت اس کی آنکھوں پر چھا گئے۔ اس پر شدید کرب طاری تھا، مرد کا دلی کرب۔ دونوں بہنوں کو اس نے سر کے اشارے سے رخصتی سلام کیا۔ اس نے دانت بھینچ کر اپنے ہمسفر کا چوڑا، گٹھوں سے بھرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ سوچا ''کہہ دوں یا نہ کہوں؟ کہنا بھی ممکن ہے۔ وہ بھلا آدمی ہے، ناراض نہ ہوگا۔ وہ سب سمجھتا ہے۔ کہہ دینا چاہئے۔ لیکن کیوں؟،، گرینینکو نے سخت اور چوڑا ہاتھ چھوڑ دیا۔ بھلا اس کے سوکھے ہوئے زخم کو کیوں کریدا جائے، اس آخری زخم کو جو زندگی نے اس شخص کو جنگ کے بعد پہنچایا تھا؟

ملاح لڑکے نے کنارے کی طرف باندھنے والا رسا پھینکا اور چپکے سے ایک بہن کے چٹکی بھر لی، لڑکی نے اس کے ہاتھ پر ایک ہلکا سا تھپڑ رسید کیا اسٹیمر سے اترنے والے تختے پر آگے بڑھ گئی۔ زینا بھی اسٹیمر سے اتر گئی۔ گرینینکو نے ایک بار پھر اس کی سفید گدی پر نظر ڈالی اور اپنی بےچینی کو دبا کر دو بارہ وہ گٹھوں بھرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہمسفر نے اس مصافحے کے جواب میں سکون کے ساتھ کہا:

''ارے، تم، دانیلووچ مجھ سے ناحق ڈرتے ہو... دیکھو میں نے فوراً تو نہیں لیکن تم کو پہچان لیا تھا۔ تم کافی دلچسپ آدمی ہو، بالکل میری طرح کھلی ہتیلی ہو، کچھ چھپا نہیں سکتے۔ تم کو گرینینکو کہتے ہیں نا؟ یوکرینی نام ہے؟،،

''گرینینکو،، ایوان دانیلووچ نے حیرت سے کہا ''تمھیں کیسے معلوم ہوا؟،،

''ہمارے گاؤں والے سب کو جانتے ھیں۔ ان سب سپاھیوں کے خاندنی نام تک جانتے ھیں جو جنگ کے زمانے میں گھاس کاٹنے آئے تھے اور باپوں کے نام عورتوں نے یاد کر لئے تھے، ان میں ایک دانیلووچ ایوان بھی تھا۔ کاغذات میں مجھے تمھارا فوٹو ملا تھا، لڑکیاں اس کو ادھر ادھر کرتی رھیں، پھر کہیں کھو دیا۔ اس میں تم زیادہ جوان تھے، ھٹے کٹے نوجوان... اچھا تو اگر تم لٹھوں کا کاروبار جاری رکھوگے تو پھر ملاقات ھوگی، کچھ پئیں گے ایک ساتھ اور جنگ کے زمانے کو یاد کریں گے۔ ارے، جوان، کاشکہ جنگ پھر نہ ھو... میں تو ایسی دوسری جنگ کو نہ برداشت کر سکونگا...''

وہ باھر جانےوالے راستے پر ھو لیا۔ اس کے بھاری بھرکم جسم کے بوجھ تلے راستے کا پورا تختہ جھک گیا اور گرینینکو اسٹیمر کی باڑ کو مضبوطی سے تھامے اپنے ھاتھوں کو دیر تک وھاں سے الگ نہ کر سکا...

اسٹیمر کا بھونپو پھر دو بار بج کر خاموش ھوگیا ۔ے اس کو سفید شمالی رات کی خاموشی توڑنے کا ڈر ھو اور پھر چل پڑا۔ وہ بائیں طرف جھکا ھوا تھا اور خوش آھنگ آواز کے ساتھ نئے موڑ کی طرف بڑھ رھا تھا۔ دریا اونگھنے لگا۔ کناروں سے کہر اٹھ رھا تھا اور اس خوابیدہ کہر میں وہ گرم، بڑی اور نیلگوں لہریں چھپ گئیں جو انتھک ایک دوسرے سے ھم‌آغوش ھو کر سرسبز کناروں کے درمیان سے کسی دوردراز انجانے اور سرد سمندر کی طرف رواں دواں تھیں۔

اندری پلاتونوف

اندری پلاتونوف (۱۸۹۹ء — ۱۹۵۱ء) کا شمار سوویت ادب کی بڑی ہستیوں میں ہے۔ ہماری صدی کی تیسری دہائی میں ہی میکسم گورکی نے ان کو باجوہر اور دلچسپ مصنف کہا تھا۔ پلاتونوف کی سوانح حیات سوویت ادیبوں کی اس نسل کے لئے مثالی ہے جو اکتوبر انقلاب کے ساتھ ادب کے میدان میں آئے ہیں۔ ۱۹۱۹ء — ۲۱ کے دوران پلاتونوف خانہ‌جنگی میں سرخ فوج کے دستوں میں شامل ہوکر مختلف محاذوں پر لڑتے رہے۔ اسکے بعد انھوں نے تعلیم حاصل کی اور برقیات کے انجنیر بن گئے۔ انھوں نے دلدلی زمینیں خشک کیں، نہریں اور بجلی گھر تعمیر کئے۔ ۱۹۴۱ء — ۴۵ کی حب‌وطنی کی جنگ میں بھی وہ محاذ سے نہیں ہٹے اور فوجی نامہ‌نگار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

سوویت ادب میں اندری پلاتونوف ان پہلے مصنفوں میں سے تھے جنھوں نے وسط ایشیا کو اپنا

موضوع بنایا اور اس سے اپنی کئی کہانیاں اور ایک طویل کہانی ’’جان،، منسوب کیں۔ انکی زیر نظر کہانی ’’صحرا،، ہمیں دوردراز ماضی میں لے جاتی ھے جب ترکمان پڑوسی ایران کی سرزمین پر دھاوا بول کر ہزاروں قیدی اپنے ساتھ لے گئے۔ ۱۹۱۷ءمیں ترکستان میں سوویت اقتدار قائم ہونے پر سب کچھ بدل گیا۔ نیا زمانہ آیا۔ ایرانی لڑکی جمال کی تقدیر، جو پہلے کنیز تھی، غیرمتوقع اور حیرت انگیز طور پر کھل گئی۔

آجکل اندری پلاتونوف کی تصانیف کا ایک طرح سے دوسرا جنم ہورہا ھے۔ وہ بڑی تعداد میں شایع ہورہی ھیں، انکی بنیاد پر فلم بنائے جا رہے ھیں اور ان کو ٹیلی‌ویژن اور ریڈیو پر نشر کیا جاتا ھے۔ وہ غیرملکی زبانوں میں بھی شایع ہورہی ھیں۔ پلاتونوف کی ہر تصنیف انسان کے دل وشعور میں، عوام کی زندگی کی گہرائیوں میں سفر ھے۔ اور یہ کہانی ’’صحرا،، جو ہماری صدی کی چوتھی دھائی میں لکھی گئی تھی ابھی تک قارئین کو متاثر کرتی ھے۔ وہ ذاتی آزادی، انصاف اور اخوت کے جذبات کو مستحکم بناتی ھے۔

صحرا

(۱)

بہت پہلے کی بات ہے، رات کے وقت کوئی چالیس یا اس سے زیادہ گھڑسوار اطمینان کے ساتھ دریا کے بہاؤ کی سمت وادیٔ فیروزہ میں چلے جا رہے تھے۔ کوپیت‌داغ کے دھندلے پہاڑ پہرے‌داروں کی طرح درے کی خنک سمت ایران اور آزاد ترکمانوں کے ہموار علاقے کے درمیان کھڑے تھے۔ ایران کا یہ قدیم راستہ ہزار سال سے یا تو فاتحانہ یا روتے ہوئے اور مردہ‌دلوں کی رہ‌گذر رہا ہے۔ اور متذکرہ دور افتادہ رات میں گھڑسواروں کی قطار کے ساتھ چودہ ہستیاں پیدل چل رہی تھیں۔ وہ ایک ہی رسی میں بندھی تھیں۔ ان پیدل چلنےوالوں میں ۹ نوجوان عورتیں اور ایک چھوٹی لڑکی تھی۔ یہ لڑکی رسی سے بندھی نہ تھی اور تھکن سے پیچھے رہ گئی تھی۔ پیدل چلنےوالے دل‌وجان سے اس طرح تھک کر چور ہو چکے تھے کہ وہ اپنے وجود کو ہی نہیں محسوس کر رہے تھے اور مردوں کی طرح چل رہے تھے۔ چالیس گھڑسوار خوش

تھے اور بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے اس اطمینان کو برقرار رکھنا چاھتے تھے تاکہ اسی حالت میں اپنے وطن کو پہنچ سکیں جو پہاڑوں کے پیچھے تاریک ویرانے میں دور واقع تھا۔ ایک گھڑسوار مرچکا تھا۔ اسکو ایران میں کردوں نے مار دیا تھا۔ اور اب وہ اپنے گھوڑے کی کاٹھی سے بندھا، جو زندہ بچ گیا تھا، نیچے لٹکا ھوا چلا جا رہا تھا تاکہ اسکے خاندان کو اسکو دیکھنے اور اسکا ماتم کرنے کا امکان مل سکے۔

آدھی رات کو چاندنی نے وادی کو روشن کر دیا، وہ بلند پہاڑوں تک پھیل گئی اور اسکی روشنی سے دریا کی دھارا کی آواز بھی جیسے سنائی دینا بند ھوگئی۔ گھڑسواروں کا یہ دستہ ایک ایسے پرانے چنار کے سائے میں اتر پڑا جو آسمان سے باتیں کر رہا تھا اور صدیوں سے وھاں کھڑا تھا۔ سوار گھوڑوں سے اترے، گھوڑوں کو اونٹوں کی طرح بٹھا دیا گیا۔ قیدیوں کو لٹاکر سوار خود بھی ان کے برابر لیٹ گئے۔ ایرانی سرحد کے پہرے دار درے کے راستوں سے اب بھی تعاقب کے لئے آسکتے تھے، قریبی پہاڑوں پر اب بھی حفاظتی برج تھے جو ساحلی پتھروں اور مٹی سے تعمیر کئے گئے تھے۔

ان برجوں میں پہلے ایرانی گاؤں اور بازاروں میں عام طور سے خدمات پر مامور فوجی سپاھی رھتے تھے تاکہ وہ ترکمانوں کے چھاپوں سے راستے کی حفاظت کریں اور ایران کے اندرونی خطرات کے بارے میں پہلے سے آگاہ کر دیں۔ اسکا طریقہ یہ تھا کہ وہ ایک برج میں الاؤ جلا دیتے جسکے دھوئیں کو

دیکھ کر تمام دوسرے برج ملک کے اندر تک یکے
بعد دیگرے ایسے الاؤ روشن کر کے خطرے کی خبر
پھیلا دیتے تھے۔ سب سے خطرناک روسی سواروں کا
پہرےدار سرحدی گارد تھا جسکی چوکی کو یہ دستہ
پچھلی رات کتراکر نکل آیا تھا، پہاڑوں کا چکر
لگاکر۔ ترکمانوں کو اس خطرے کا پورا علم تھا
اور وہ اپنی بندوقیں سینے سے لگائے تھے تاکہ دشمن
کو دیکھتے ہی ہلاک کر دیں۔

یہ آخری دھاؤں کا کافی دیر والا زمانہ تھا۔
ایرانی قیدی جلدھی سوگئے اور نیند نے ان کے رنج و غم
کو بھی سلا دیا۔ صرف ایک کمسن عورت کا دماغ
بھی اسکے دل کے ساتھ تپ رہا تھا۔ اسکا نام زرین تاج
تھا اور اسکی عمر چودہ سال تھی۔ غم سے اسکا گلا
گھٹا جا رہا تھا اور وہ اندھیرے میں خراسان کی طرف
دیکھ رہی تھی جہاں سے اسکو پکڑ لایا گیا تھا۔
کبھی کبھی اسکو آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو
شاید پانی کے دھارے تھیں۔ وہ خیال کرتی کہ شاید
یہ اس ٹرین کی آوازیں ھیں جو ایران سے توران جارھی
ھے جسکو بچپن میں ایک بار زرین تاج نے دیکھا تھا
اور اسکو یاد تھا کہ اسکے بھاگتے ہوئے دھوئیں سے
کیسی تیز سیٹی کی آواز نکلتی تھی۔ ترکمان جو
چھاپے اور صحرائی زندگی کی غربت سے تھک گئے
تھے، ایک ھی آنکھ بند کرتے تھے تاکہ ذرا اونگھ
سکیں اور دوسری دیکھنے کے لئے کھلی رکھتے تھے۔
لیٹے ہوئے گھوڑوں نے اپنے منہ زمین تک بڑھا دئے
تھے اور زور زور سے سانسیں لے رہے تھے۔ وہ قریب

کی گھاس کو منہ نہیں لگا رہے تھے۔ زرین اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھی۔ رات کی ہوا ایران کی طرف سے درے سے گذر کر آرھی تھی۔ پھولوں کی مہک سی محسوس ہورھی تھی۔ کہیں دور اندھیرے پہاڑوں پر کوئی چڑیا چہکی اور پھر چپ ہو گئی۔ صرف دریا بہتا اور پتھروں کو گھستا رہا — اسی طرح جیسے سدا، اندھیرے اور اجالے میں ترکمانیہ کے میدانوں میں غلام کام کرتا ھے یا چائےخانے میں سماوار ھمیشہ گرم رھتا ھے۔

ایرانی عورت نے بوڑھے چنار پر نظر ڈالی — اس سے سات بڑے بڑے تنے اور ایک نازک سی شاخ اگ آئی تھی — سات بھائی اور ایک بہن۔ اس درخت کو گھیرے میں لینے کے لئے پورے قبیلے کے لوگوں کی ضرورت تھی اور اسکی چھال بیمار، جنگلی جانوروں کی چبائی ہوئی، جسکو مرتے ہوئے لوگوں کے ھاتھوں نے تھاما تھا اپنے اندر رس محفوظ کئے تھی اور دیکھنے میں زمین کی طرح گرم اور مہربان تھی۔ زرین‌تاج چنار کی ایک جڑ پر بیٹھ گئی جو گہرائیوں تک چلی گئی تھی، بالکل چنگل کی طرح۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ تنے میں اوپر پتھر اگ آئے تھے۔

غالباً یہی ھوگا کہ دریا نے اپنے بہاؤ کے دوران چنار کی جڑ پر پہاڑی پتھروں کی بمباری کر دی ھوگی۔ لیکن درخت نے اپنے جسم کے اندر وہ بڑے بڑے پتھر لےلئے اور ان کو اپنی متحمل جڑوں سے ڈھک دیا، زندہ رھا، مشکلات پر قابو پا لیا اور زیادہ بڑھ گیا۔ اس نے اپنے ساتھ ان کو بھی کچھ اوپر اٹھایا

جو اسکو مارنا چاہتے تھے۔ ”یہ درخت بھی تو غلام ھے، میری طرح!،، زرین‌تاج نے چنار کے بارے میں سوچا ”وہ پتھر کو اپنے اندر اس طرح رکھتا ھے جیسے میں اپنے دل کو، اپنے بچے کو۔ کاشکہ میرا غم میرے اندر اس طرح پرورش پائے کہ میں اسکو محسوس نہ کروں۔ ،، زرین‌تاج رو پڑی۔ وہ دو مہینے سے حاملہ تھی۔ یہ ایک گلہ‌بان کرد کا بچہ تھا، اسی لئے وہ کسی نہ کسی سے محبت کرنا چاہتی تھی۔ قریب لیٹے ہوئے ترکمان نے اسکو دونوں آنکھوں سے دیکھا اور خوش ھوا کہ اگر لڑکی رو سکتی ھے تو وہ جلدھی بیوی بننے کی عادی ھوجائےگی اور یاشماک (عورتوں کے سر کا رومال) پہن کر ترکمانیہ میں ھی اطمینان سے مریگی۔

چاند سیاہ پہاڑوں کے پیچھے چھپ گیا اور پھر سناٹا ھو گیا۔ ھوا نے زرین‌تاج کے چہرے کی اداسی دھو دی اور وہ پھر سب کے درمیان زمین پر لیٹ گئی۔

”گل اندام کو مدتوں ھوئے ایرساری قبیلے کے لوگ لے گئے،، ایرانی عورت دل ھی دل میں بڑبڑائی تاکہ وہ اپنے غم کا مقابلہ زیادہ سے زیادہ مصیبتیں اٹھانےوالیوں سے کرکے تسکین حاصل کر لے۔ ”فاطمہ دریا میں ڈوب مری اور میری پیاری، اچھی، خانم‌آغا، میں نے سنا، جعفربائیوں کے قبیلے میں، ساحل‌سمندر پر رھتی ھے، بچے پیدا کرتی ھے۔ میں بھی اس کے ساتھ رھوں‌گی نا؟!،،

زرین‌تاج سو گئی۔ اسکو اپنی ان سہیلیوں کو

یاد کرکے سکون ملا تھا جو اسی طرح کبھی پہلے اسی خنک، سرسبز گھاٹی سے گذری تھیں اور زندہ رہی تھیں۔

صبح ترکمان سوار قیدیوں کو کوپیت‌داغ کے پہاڑوں کے پار لے گئے۔ تب کچھ کرد اور ایرانی عورتیں اجنبی صحرا اور آسمان کو دیکھ کر جن کے رنگ اپنے وطن سے مختلف تھے اس غم سے رو پڑیں جو ان پر ٹوٹا تھا۔ لیکن زرین‌تاج نہیں روئی۔ پہاڑی دامن کے خراسانی سبزہ‌زار میں پلی بڑھی ہوئی اس عورت نے ترکمانیہ کی ویران دنیا کو حیرت سے دیکھا، یہ ترکمانی سپاٹ میدان اکتا دینےوالا تھا۔ اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر لوگ یہاں کیوں رہتے ھیں۔

ترکمانوں نے پہاڑ کے دامن کی خندقوں میں پورا دن گزارا تاکہ ان کردوں سے مڈبھیڑ نہ ھو جو روسی سرحد سے ھوکر سراغرسانی کےلئے کھلے ریگستان تک آجاتے تھے اور نہیں چاھتے تھے کہ ان کے وطن کے سرے پر ھی پہنچ کر ان کی فتح برباد ھو جائے۔

دوسری رات اور آدھا دن ترکمان اپنے جان‌لیوا ریگستان میں قیدیوں کو ھنکاتے رہے۔ پھر آباد ترکمانوں کے گاؤں میں رات کو آرام کرنے لگے، وہ قیدی عورتوں کے ساتھ لپٹ کر سوتے اور پھر آگے بڑھ جاتے۔ جلد ھی زرین تاج کو پتہ چل گیا کہ اسکا شوھر اور آقا عطا بابا، قبیلۂ تیکا کا ترکمان ھے جسکی عمر چالیس سال سے اوپر ھے۔ اسکے

داڑھی تھی اور اسکی آنکھیں یکساں دھندلی، انتھک اور ناخوش نظر آتی تھیں ۔ عطا بابا کبھی کبھی زرین تاج کو اپنے پاس بلاتا اور اس کے ساتھ ریت پر بسر کرنے کے لئے سب سے الگ ہو جاتا ۔

نیچے لیٹی ہوئی زرین نے سنا کہ کس طرح ریت خودبخود تھوڑی سی کھسکتی رہتی ہے ۔ عطا بابا کا گھوڑا قریب کھڑا منتظر رہتا اور دونوں کو دیکھتا ۔ محبت کے دوران زرین تاج اپنے ہاتھ اٹھا کر ریت آہستہ آہستہ نیچے گراتی، اپنے اوپر چھائی ہوئی بلندیوں کو دیکھتی اور بے تعلق باتیں سوچتی ۔ عطا کی محبت میں بدمزاجی اور روکھاپن تھا وہ اسکو ایک عام فرض کی طرح کرتا تھا لیکن وہ اسے بیکار ہلکان یا لطف اٹھانے کے لئے نہیں استعمال کرتا تھا ۔ ''میں اسکے ساتھ رہونگی!،، خاموشی سے زرین نے یہ دیکھ کر سوچا کہ یہ نہ تو کوئی مصیبت ہے اور نہ کوئی دلچسپ بات ۔ اسکو خود کوئی لطف نہیں آتا تھا، بس عطا بابا کا بوجھ تھا اور اسکی داڑھی ۔

(۲)

وطن میں آئے بارھویں رات تھی جب چھاپے کے قیدی ہنکا کر ایک چھوٹے سے خیمے میں لائے گئے جو تاگان نامی کنوئیں کے قریب تھا ۔ یہاں قبیلہ تیکے کے کانجین جرگے کے کچھ خاندان رہتے تھے ۔ یہاں عطا بابا کی چاروں بیویاں اسکا خیرمقدم

کرنے نکل آئیں۔ انکے چہروں پر خوشی کا ایک سا تاثر تھا۔ زرین تاج کی طرف تو کسی نے توجہ ہی نہ کی۔ عطا ایرانی عورت کو خیمے میں لے گیا اور حکم دیا کہ اسکو کھلا پلاکر خاندان کے ساتھ سونے کے لئے لٹا دیا جائے اور خود وہ اپنے اس عزیز کی لاش دینے چلا گیا جو چھاپے میں مارا گیا تھا۔ لاش راستے میں ہی سڑ گئی تھی اور لاش کی بو سونگھ کر اسکے گھوڑے نے پانی پینے کی جگہوں پر پانی کم پیا تھا۔

زرین تاج خیمے کے فرش پر بیٹھی تھی۔ وہ اس اجنبی ماحول میں بالکل کھو سی گئی تھی۔ وطن میں چھ برس کی عمر سے وہ اپنے مالک کے لئے پہاڑی جنگلوں سے جلانے کی لکڑی اور سوکھی ٹہنیاں چن کر لاتی تھی اور اسکو دو وقت کی روٹی مل جاتی تھی۔ وہاں زندگی ایک ڈھرے پر لگ گئی تھی اور جوانی کے سال بلایادوں اور نشانیوں کے گذر گئے تھے کیونکہ غم انگیز محنت میں یکسانیت پیدا ہوگئی تھی اور دل اسکو برداشت کرنے کا عادی ہوچکا تھا۔ اسکے لئے وقت وہی اچھا تھا جو تیزی سے گذر جائے، جہاں دن اپنی مصیبتوں کو مضبوط و مستحکم نہ کر سکیں۔

عطا بابا کی ایک بڑی بیوی نے زرین تاج سے کردی زبان میں پوچھا کہ وہ کس جرگے سے ہے اور خانہ بدوشوں کے کسی خیمے میں پیدا ہوئی تھی۔

''مجھے پتہ نہیں کہ کب میں پیدا ہوئی،، زرین تاج نے کہا ''میں مدتوں سے ہوں۔،،

اسکو واقعی ماں باپ نہیں یاد تھے اور اس نے کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا کہ کب سے اسکا اپنا وجود تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ ہمیشہ سے ایسا ہی رہا ہے۔

اچانک اس نے رونے کی آوازیں اور غصہ بھرا شور سنا۔ خیمے میں تین عورتیں آگئیں جو ننگے پیر تھیں اور رو پیٹ رہی تھیں۔ وہ ایرانی عورت کے اردگرد اکڑوں بیٹھ گئیں۔ پہلے تو وہ غم آمیز اور سمجھ میں نہ آنے والی زبان میں باتیں کرتی رہیں، پھر وہ رینگتی ہوئی زرین تاج تک آئیں اور اس کو دبوچ کر اپنے ناخنوں سے اسکا چہرہ اور دبلا پتلا جسم نوچنے لگیں۔ ایرانی عورت نے اپنے کو سکیڑ لیا اور اپنی مدافعت کے لئے گول سول ہوگئی۔ لیکن دل ہی دل میں اس نے محسوس کیا کہ ان عورتوں کا غصہ بہت ہی کمزور تھا اور اس نے بے خوف درد کو برداشت کرلیا۔ بعد میں عطا بابا آکر ذرا خاموش کھڑا رہا اور پھر بولا ''بس ہوچکا، وہ ابھی کمسن ہے اور تم پرانی رنڈیاں،، اور اس نے ان عورتوں کو نکال باھر کیا۔

وہ نکل گئیں اور پھر اپنے مقتول شوہر کے لئے رونے لگیں۔

رات کو عطا بابا قیدی عورت کے قریب سونے لیٹا اور جب صحرا گذری ہوئی دنیا کی طرح نمدے کے خیمے کے پیچھے سنسان ہو گیا تو مالک ایرانی عورت کے جسم سے لپٹ گیا جو بھوک، پیاس اور راستے کی تکالیف سے لٹ گیا تھا۔ بالکل سناٹا تھا،

صرف سونے والوں کی سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ کسی نے مردہ مٹی پر ہلکے سے قدم رکھے۔ ممکن ہے کوئی بچھو کہیں رینگ رہا ہو۔ زرین تاج لیٹی سوچ رہی تھی کہ شوہر ایک مزید محنت ہے اور اسکو برداشت کررہی تھی۔ لیکن جب عطا بابا کے جذبات نے شدت اختیار کی تو دو دوسری عورتوں میں حرکت ہوئی اور وہ گھٹنوں پر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پہلے تو وہ ہیجانی حالت میں کچھ کھسرپھسر کرتی رہیں اور پھر شوہر سے بولیں:

''عطا، عطا! تو اس پر رحم نہ کر، چیخنے دے اسکو۔''

''یاد ہے نا، ہمارے ساتھ کیا ہوا تھا۔ تو اسکا دلار کیوں کرتا ہے؟''

''اپاہج کر دے اسکو تاکہ وہ تیری عادی ہو جائے!''

''ارے تم، کیسے چلتی ہوئی ہو!''

زرین تاج نے انکی باتیں آخر تک نہیں سنیں۔ وہ اس مباشرے کے دوران ھی تھکن اور بے تعلقی کی وجہ سے سو گئی۔

(۳)

زرین تاج خانہ بدوشی کی زندگی گذارنے لگی۔ وہ اونٹنیوں اور بکریوں کو دوھتی، بھیڑوں کی گنتی کرتی اور صحرا کے کنوؤں سے سو سے دو سو مشکوں تک پانی لاتی۔ اس نے پھر کبھی چڑیاں

نہیں دیکھیں اور یہ بھی بھول گئی کہ ہوا کیسے درختوں کی پتیوں کے درمیان سرسراتی ہے۔ لیکن جوانی کا زمانہ آہستہ آہستہ گذرتا ہے۔ اسکا جسم ابھی زندگی کی اذیتیں برداشت کررہا تھا اور مسرتوں سے ابھی قطعی طور پر ناامید نہیں ہوا تھا۔

جب بھیڑیں گھاس کی کمی سے دبلی ہونے یا مرنے لگتیں تو عطا بابا خیمے اکھاڑنے، گھرگرہستی کو گٹھریوں میں باندھنے اور آگے غیرآباد جگہوں کی طرف روانہ ہونے کا حکم دیتا جہاں زمین زیادہ تازہ اور چھدری گھاس اچھوتی ہوتی۔ سارا چھوٹا سا جرگہ رہائش‌گاہ کو چھوڑکر تپتے ہوئے صحرا میں یکساں اور ویران وسعتوں کی طرف چل پڑتا۔ آگے بزرگ، مکھیاں اور سمجھدار لوگ گدھوں پر ہوتے، گدھے لپٹے ہوئے خیموں کے گٹھر اور بوڑھی عورتوں کو بھی لیجاتے اور پیچھے پیچھے بکھرا ہوا بھیڑوں کا گلہ ہوتا، زرین‌تاج اور اسی طرح کے غلام پیدل چلتے، وہ بھاری چاندی لادکر جو پرانے دوستوں نے شوہر کو بطور تحفہ دی تھی اور برتنوں میں کھانا بھی۔

ایرانی عورت کو اگر ریگستانی ٹیلوں سے گذرنا پڑتا تو انکی تپتی ہوئی زمین پر پیر پٹک پٹک کر خوش ہوتی۔ وہ دیکھتی کہ کس طرح ہوا کسی مدتوں پہلے سوکھے ہوئے پودے کو پریشان کرکے آگے دھکیلتی ہے جس نے شاید کوپیت‌داغ کی نیلگوں اور دھندلی وادی میں یا آمو دریا کے سرمئی کناروں پر جنم لیا تھا۔ لیکن

اکثر طویل صحراؤں اور انتہائی بنجر زمین سے گذرنا پڑتا جہاں سورج کی حرارت غلام کے دل کے غم کی طرح کبھی ٹھنڈی نہیں پڑتی، جہاں خدا کبھی اپنے گناہ گاروں کو رکھتا تھا لیکن گناہ گار مرگئے اور ہلکی شاخیں بھی سوکھ گئیں اور ہوا ان کو اپنے ساتھ اڑالے گئی۔

نئی جگہ پر ہمیشہ پرانی جگہ سے زیادہ مشکلات پیش آتیں۔ کنوؤں کو صاف کرنا اور بنانا پڑتا، چراگاہ بھی تیار کرنی ہوتی اور دور تک یہ تلاش کرنا پڑتا کہ رینگتی ہوئی ریت میں سکساؤل کی خاردار جھاڑیاں کہاں ہیں۔

وقت کے ساتھ زرین تاج اپنی دلچسپیوں اور خود اپنے بارے میں بھولتی گئی۔ جب عطا بابا پلاؤ کھاتا اور باقی جھوٹن اسکی دوسری عورتوں کو ملتا تو اسکو نہ تو بھوک پریشان کرتی اور نہ جلن۔ وہ ہمیشہ چپ رہتی اور جانوروں کے درمیان انکی دیکھ بھال میں لگی رہتی۔ وہ اپنی جان ھی کو بھول بیٹھی تھی تاکہ اسکو غم کا احساس نہ رہے۔

اکثر وہ صحرا میں تھک کر لیٹ جاتی۔ وہ خلا اور روشنی سے گھر جاتی وہ قدرتی ماحول پر نظر ڈالتی — سورج اور آسمان — اسکا دل متحیر ہو جاتا۔ ''بس یہی سب کچھ ہے!،، زرین تاج بڑبڑاتی۔ یہی اسکی قابل فہم زندگی اور عام دنیا ہے جو اسکی آنکھوں کے سامنے ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔

اس نے اپنا بدن ہاتھوں سے ٹٹولا، ہڈیاں اور نکل آئی تھیں، چمڑی تھکن سے سوکھ گئی تھی، کام کی زیادتی سے ہاتھوں کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ اسکی زندگی آہستہ آہستہ بجھ رہی تھی۔ چاند نکلتا تو آہستہ آہستہ ہے لیکن غروب تیزی سے ہوتا ہے۔

چند مہینوں بعد زرین تاج نے ایک بچی کو جنم دیا۔ عطا بابا اس اجنبی کی آمد سے خوش ہوا کیونکہ لڑکی تو آخر اسکی کنیز ہی بنے گی۔ اس نے اسکا نام جمال رکھا۔ زرین نے بچی کو اپنے سے چمٹا لیا۔ وہ سمجھ گئی کہ ابھی اسکی مصیبتوں کا خاتمہ نہیں ہوا ہے۔ جاڑے کا موسم تھا۔ صحرا میں بارش کا پانی کنوؤں میں بھر گیا اور گدھا ایسی غمگین آواز میں چیخا جیسے وہ اس دنیا میں بالکل یتیم رہ گیا ہے اور اب مارے غم کے بیمار پڑ گیا ہے۔

تھوڑے ہی عرصے میں زرین تاج کمزور پڑ گئی، اسکی صحت گر گئی۔ بچی اسکے پاس پڑی، اسکے گرم بدن سے حرارت پاتی رہی۔ خیمے میں نیچے سے ہوا سرسرا رہی تھی اور بارش کے شور سے صحرا گونج اٹھا تھا۔

عطا بابا زرین کے قریب کھڑا تھا اور اسکے آنسو اس نمدے پر ٹپک رہے تھے جس پر زرین پڑی تھی۔ اسکو رنج یہ تھا کہ اب وہ اسکے ساتھ ہم بستر نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ اتنی دبلی ہو گئی تھی اور اسکی بات نہیں سمجھتی تھی۔ وہ خود روز مینڈھے کی چربی اور گوشت اڑاتا تھا اور اس میں

شوق مباشرت کی طاقت خوب جمع ہوگئی تھی جو
اس پیاری عورت کو معاف کرنےوالی نہ تھی جو
بخار سے بھن رہی تھی اور بےہوش تھی۔ جب
تب وہ سنسان رات میں زرین‌تاج کے پاس سے بچی
کو ہٹا لیتا اور اپنی اکتا دینےوالی جان‌لیوا طاقت
سے اسکو لپٹا لیتا۔ لیکن وقت گذرتا گیا، جس طرح
پرشور ہوا ریگستان میں چلتی ہے اور بہار کی
چڑیوں کو سرسبز اور تر ملکوں کو لے جاتی
ہے۔ ایرانی عورت نے اپنے پر حرارت اور مریض
دماغ میں یہ تصور کیا کہ کہیں کوئی تنہا
درخت کھڑا ہے اور اسکی ٹہنی پر ایک چھوٹی،
ننھی منّی‌سی چڑیا بڑے غرور کے ساتھ اپنا گیت
الاپ رہی ہے۔ اس چڑیا کے پاس سے ہی اونٹوں
کا کارواں گذر رہا ہے۔ برابر ہی گھڑسوار جا
رہے ہیں اور توران میں ٹرین کی سیٹی بج رہی
ہے۔ لیکن وہ ننھی‌سی چڑیا زیادہ سمجھداری
اور سکون سے گا رہی ہے، تقریباً اپنے آپ۔ ابھی
یہ بات صاف نہیں ہے کہ کون‌سی طاقت فتح پائےگی
زندگی میں — چڑیاوالی یا کارواں اور شور کرتی
ہوئی ٹرین کی۔ زرین‌تاج چونک پڑی اور اس نے
زندہ رہنے کا فیصلہ کر لیا اس چڑیا کی طرح جو
خواب میں غائب ہوگئی تھی۔ وہ صحت‌مند ہو گئی۔
پھر بھی عطا بابا نے اسکو بچی کی وجہ سے محفوظ
رکھا اور چند دن کے لئے کام کرنے سے منع کردیا۔
دوسری بیویاں اسکو نمدے پر ہی کھانا
دیتیں لیکن ناراض ہوکر کہ وہ ہٹی کٹی ہوکر

بھی لیٹی ہے اور وہ جو بوڑھی اور بیمار ہیں
اکیلی عذاب جان محنت کرتی ہیں۔
زرین تاج خود ہی جلدی اٹھ کھڑی ہوئی۔
اسکو نہ تو کچھ سوچنا تھا اور نہ محسوس کرنا،
اسی لئے مستقل اور متواتر گھر گرہستی کی فکروں
کے لئے چلنا پھرنا اور رفتہ رفتہ اپنے دل کو مار
دینا اسکے لئے آسان تھا۔ وہ پھر پرسکون ہوگئی
جب اس نے جمال کو پیٹی سے پیٹھ پر باندھ کر
بکریوں کو دوھنا، ایندھن کے لئے لید اور مینگنیاں
جمع کرنا اور کنوؤں سے پانی لانا شروع کردیا۔
اگر وہ خوش قسمت بھی ہوتی تب بھی اسکو یہی
کام کرنے پڑتے کیونکہ خوشی کو برقرار رکھنے
کے لئے معمولی زندگی گذارنا ضروری ہے۔

جمال مدتوں تک ماں کی پیٹھ سے چمٹی رہی،
وہ اپنی پیدائش میں پیش آئے ہوئے خوف سے بالکل
گولا بن جاتی اور حیرت سے اپنے دل کی آواز سن کر
یہ انتظار کرتی کہ وہ کب رکے اور کب وہ سوئے۔
پھر جمال خود چلنے اور اپنے وجود کے بارے میں
سمجھنے لگی۔ ”یہ میں ہوں!“، اس نے حیرت سے
سوچا اور اپنی نرم ہڈیوں کو ٹٹولا جو آگے چل کر
مضبوط ہونےوالی تھیں۔

لیکن اب بھی بہت زمانے تک جمال ماں سے
الگ نہیں ہوئی اور اسکی نیچی جھکی ہوئی پیٹھ
کو سہلاتی رہی جو گرم اور بھیگی رہتی تھی اور
جہاں وہ اپنے کو گرم کرتی اور سوتی تھی۔
اسکو اپنی زندگی پسند تھی۔ وہ مٹی، گھاس، بھیڑوں

کی مینگنیاں، کوئلہ سب کچھ کھاتی، وہ ریگستان میں مرے ہوئے جانوروں کی ہڈیاں چوستی اگرچہ اسکے لئے ماں کا دودھ ہی کافی تھا۔ اس کا چھوٹا سا جسم ان چیزوں سے پھول گیا جو اسکے اور اسکی نشو و نما کے لئے مفید ثابت ہوئیں۔ نئی نئی بصارت کی وجہ سے اسکی آنکھوں میں تازگی تھی اور وہ ہر معمولی چیز کو توجہ اور غور سے دیکھتی تھی۔ اب وہ اپنے دل کی دھڑکن کی عادی ہوچکی تھی اور اسکو یہ ڈر نہیں رہا تھا کہ وہ رک جائےگی۔

(۴)

اسکا بچپن کافی طویل تھا۔ ہر روز سورج آسمان پر بڑی آب و تاب سے چمکتا، ہوا چلتی اور بند ہوتی، خاموش ریتیلی پہاڑیوں میں بچے کھیلتے اور روتے، پھر سورج سرخ، بہت بڑا اور بھاری ہوکر کہیں دور ڈوب جاتا اور ہلکا پھلکا چاند سورج کے روپہلے سائے کی طرح بوڑھی ہوتی ہوئی ماں کے مصیبت‌زدہ چہرے پر چمکتا جو ہمیشہ کام میں لگی رہتی۔ اونٹنیوں کو دوھتے ہوئے ماں چاند کو دیکھتی، اسکی حقیر اور مردنی چھائی ہوئی چاندنی کو۔ پھر زرین اپنے نمدے پر لیٹ جاتی اور اپنی بچی کا ذرا ہی دلار کرپاتی کہ نیند اسکو اپنے آغوش میں لے لیتی۔

بہار میں زرین‌تاج نے پہلی بار بیٹی کو چڑیاں دکھائیں جو ریگستان کے اوپر اونچی اڑکر

نہ جانے کہاں جارہی تھیں۔ چڑیاں چیخ کر کچھ کہہ رہی تھیں، وہ ضرور لوگوں کی شکایت کررہی تھیں۔ پھر وہ جلد ہی غائب ہوگئیں۔

''وہ کون ہیں؟،، جمال نے پوچھا۔

''وہ خوش قسمت ہیں،، ماں نے کہا ''وہ پہاڑوں کے پار اڑسکتی ہیں جہاں درختوں میں پتیاں ہوتی ہیں اور سورج بھی چاند کی طرح خنک ہوتا ہے۔''

جمال کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سب کیا ہے۔ وہ تو دریاؤں اور پتیوں کے لئے نہیں ہڑکتی تھی۔ اسکی پرورش تو یہیں، ریت کے ٹیلوں کے درمیان ہوئی تھی اور اس نے ہوا سے بھری ریگستان کی بلندیوں سے یہی دیکھا تھا کہ دھرتی ہر طرف ایک سی اور ویران ہے۔ ماں اکثر روتی اور بیٹی کو اپنے کلیجے سے لگا لیتی۔ اب ماں کے لئے بیٹی ہی دوردرازوالا دریا، فراموش کردہ پہاڑ، پھولدار پیڑ اور صحرا میں سائے کی حیثیت رکھتی تھی۔

''وہاں تمھارے لئے اچھا تھا، دریا اور پہاڑ کے پاس؟،، جمال نے پوچھا۔

''نہیں تو، وہاں بھی میرے لئے مصیبت تھی،، زرین تاج نے بتایا۔

''پھر تم کیوں سوچتی ہو اچھے دنوں کے بارے میں؟،،

''میں نہیں سوچتی لیکن مجھے ایسا لگتا ہے،، زرین تاج نے جواب دیا۔

چھوٹی جمال مخمصے میں پھنس گئی، اس نے ماں کی انگلی پکڑ کر اسکو مشورہ دیا:

”تم کو ایسا لگتا ہے... تم صرف مجھ سے محبت کرو۔ بس تم کو اچھا لگے گا۔ پہاڑوں اور دریاؤں کی کوئی ضرورت نہیں۔“

جمال کسی جگہ کو چھوڑتے ہوئے ان چیزوں سے دیر تک اور غمگین ہو کر رخصت ہوتی جو وہاں تنہائی کی حالت میں رہ جاتیں — ساکساؤل کی جھاڑیوں سے جن میں وہ کھیلتی، شیشے کے ٹکڑوں سے، سوکھی ہوئی گوھوں سے جو اسکے لئے بہنیں ہوتیں، کھائی ہوئی بھیڑوں کی ہڈیوں اور مختلف چیزوں سے جن کے نام وہ نہیں جانتی تھی، صرف ان کو دیکھ کر پہچان سکتی تھی۔ جمال کو یہ سوچ کر رنج ہوتا کہ یہ سب چیزیں اکیلی اکتا کر مر جائیں گی جب لوگ ان کے پاس سے نئے سفر کے لئے روانہ ہوں گے۔ لکڑی کے سخت ریشوں جیسی چھوٹے چھوٹے، سوکھے اور کڑے تنکوں والی گھاس ہی اونٹوں اور بھیڑوں کی خوراک تھی۔ لیکن گدھوں کو غالباً فراموش کردہ دنیا کا اچھا کھانا یاد آتا تھا اور وہ اسکی کمی محسوس کرکے اکثر چیخ اٹھتے تھے۔

خانہ بدوشی کی حالت میں جمال سب سے چھوٹے گدھے پر چلتی اور ریگستان اس کے لٹکے ہوئے پیروں کے ساتھ ساتھ چلتا۔ وہ گدھے کے بڑے سر کو دیکھتی جو اپنے کانوں کے درمیان جن میں ہوا بھرتی تھی گھوڑے کے سر سے بھی بڑا لگتا اور وہ سوچتی کہ گدھا کسی دیو کی باقیات میں سے ہے اور غم، کام اور کم کھانے کی وجہ سے اتنا چھوٹا ہو گیا ہے۔

(۵)

کافی عرصہ ہو گیا اور جمال اب بارہ سالہ دوشیزہ بن گئی۔ اسکا جسم گداز اور دلکش اور چہرہ حسین تھا۔ اس میں بالکل اس کے باپ جیسی محبت اور گرمجوشی تھی جسکو زرین تاج نہیں جانتی تھی۔ نہ تو غلامی کی غربت اور نہ غم و رنج جمال کو نمایاں، بالغ اور صاف ستھرا بننے سے روک سکے۔ اور اسکی غذا بھی دیکھتے میں عزیبوں جیسی اور ایک طرح کی نہ تھی۔ اس کو سورج کی روشنی، بہار کی ہوا، بارش کے پانی اور شبنم اور ریگستانوں کی حرارت نے مل کر پروان چڑھایا تھا۔ اسی لئے جمال نازک بدن تھی اور اسکی آنکھیں دلکش تھیں، ایسا لگتا تھا جیسے ان میں کوئی شعلہ فروزاں ہے۔

اسکے لئے منہ ھاتھ دھونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پانی بھیڑوں کے لئے ھی مشکل سے کافی ہوتا تھا اور جب جمال کھال کے چکٹے پن سے گھبرا جاتی تو وہ ایسی جگہ چلی جاتی جہاں ھوا تیز ھوتی تاکہ ھوا اور ریت اپنی رفتار و حرکت سے اسکو تازہ اور صاف ستھرا بنا دیں۔

ایک بار عطا بابا اپنے خیمے لیکر کسی بہت ھی ویران جگہ پر پہنچ گیا جہاں پورے دن کے سفر میں صرف سیاہ اور سخت مٹی ھی ملی۔ پھر اس نے ڈیرہ ڈالنے کا حکم دیا۔ ایسا افسردہ صحرا نہ تو جمال نے اور نہ زرین تاج نے دیکھا تھا۔ اسی لئے غالباً یہاں مدتوں سے کوئی نہیں آیا تھا

اور صحرا کے سرے پر اچھی گھاس بچ رہی تھی، اس نے اپنے کو ریگستان میں گرمی اور موت سے محفوظ رکھا تھا۔ صحرا کے درمیان میں نشیب تھا اور وہاں مٹیالی تاریکی میں ایک ٹوٹا پھوٹا پتھر کا برج کھڑا تھا۔ اس برج میں عطا بابا نے اپنے خاندان کو ٹھہرایا۔ زرین تاج اور خانہ بدوش جرگے کی دوسری عورتیں وہ کنواں صاف کرنے لگیں جو اس قدیم برج کے قریب ہی تھا۔ کسی کو بھی یہ پتہ نہ تھا کہ برج کس کا ہے اور پرانے زمانے میں یہاں کیا ہوتا تھا ــ لوگ عبادت کرتے تھے یا یہ کوئی قتل گاہ تھی۔

برج کی دیوار کا باھری حصہ آسمانی رنگ کے ٹائلوں سے اور چھوٹا گنبد نیلی سلوں سے آراستہ تھا اور گنبد کی سلوں پر ایک سنہرا سانپ لیٹا ہوا تھا۔

جمال اپنی سب ماؤں کے ساتھ کنویں پر کام کررھی تھی وہ جو بھیگی ہوئی ریت دور لے جاکر پھینک رہی تھی اسمیں اسکو کسی کی ھڈی ملی۔ ریگستان کے سرے پر ھلکے ھلکے سے چھوٹے پہاڑ نظر آرہے تھے جن پر سوتے ہوئے بادل جاڑوں کے موسم تک لیٹے سے نظر آتے تھے اور دوسری طرف، عطا بابا نے بتایا، آمودریا اور دولت مند شہر خیوا تھا۔ رات کو جمال برج کے نچلے حصے میں دیوار کے قریب لیٹی۔ وہ مٹیالی گھاٹیوں میں بچھوؤں کے چلنے کی آواز سنتی اور خیمے کے کھلے دروازے سے ایک تارے کو تکتی رہی جو اندھیرے میں کسی

خانہ بدوش کی طرح رواں دواں تھا۔ اس نے برج کے
دامن میں رینگتی ہوئی ریت کی غم زدہ آواز کو
پہچان لیا۔ زندگی کے رنج و خوشی اس کے دل سے
قریب ہو گئے لیکن جمال احتیاط کے ساتھ سانس لیتی
رہی اور اسکو زندگی کی اہمیت ناقابل فہم ہونے
پر حیرت تھی۔

عطا بابا اپنے نمدے سے اٹھا اور چپکے چپکے
زرین تاج کی طرف دوسری سوتی ہوئی بیویوں کو
پار کرکے آنے لگا۔ جمال نے وقت کا انتظار کیا
اور پھر ماں کو پکارا تاکہ وہ عطا کو ڈرا دے۔
لیکن ماں خاموش رہی اور عطا نے اسکو پا لیا۔
جمال نے کروٹ بدل لی اور اپنا چہرہ نیچے بچھے
ہوئے کپڑے میں چھپا لیا۔ وہ رنج سے سرد پڑ گئی۔
اسی وقت کوئی انجانا سیاہ سا آدمی برج کے اوپروالے
حصے سے نیچے آیا اور لیٹے ہوئے خاندان کے بیچ
میں رک گیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے صاحب
سلامت کی۔ جمال اس کے پاس گئی اور اسکے سلام
کا جواب دیا۔ آنیوالا شخص اجنبی تھا اور وہ کسی
سے بھی مشابہہ نہ تھا۔ وہ بڑا لیکن دبلا پتلا تھا
اور اسکا چہرہ کسی جانور کی طرح مہربان اور اچھا
تھا اور اسکی آنکھیں، اندھیرے کے باوجود، چھوٹی
جمال کو ایسے غم و رنج کے ساتھ گھور رہی تھیں
جیسے وہ واقعی مردہ ہو۔

زرین تاج نے اپنی بیٹی اور اس اجنبی کو
دیکھ کر ان سے کہا:

''بستر پر یہ ہمارا اپنا معاملہ ہے۔ تم یہاں

سے چلے جاؤ،، یہ کہہ کر وہ پھر اپنے مالک اور شوہر سے لپٹ گئی۔

جمال نے مہمان کا ھاتھ پکڑ لیا اور اپنی ماں کے لئے رونے لگی۔ بہرحال مہمان رونے والی کو دلا سا نہ دے سکا۔ اسے بیچ رات میں صحرا میں بھاگنا پڑا کیونکہ عطا بابا اچک کر اٹھا اور اسکا تعاقب کرنے لگا۔ جمال نے یہ دیکھا اور اپنی بے چاری ماں پر نظر ڈالی، وہ بھی مہمان کے پیچھے بھاگنے لگی۔

انکے بھاگنے کی آواز صحرا میں گونج رہی تھی۔ لیکن ھراس میں غصے سے زیادہ طاقت ھوتی ھے اور یہ انجانا مہمان خوابیدہ خیموں سے گذرتا ھوا کمزور عطا بابا کے پنجے سے نکل کر اندھیرے میں غائب ھوگیا۔ جمال اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ اسے پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں جارہی ھے۔ اس نے محسوس کیا اب اس کے تنہا رہنے کا وقت آگیا ھے۔ اسکا کوئی نہیں ھے۔ حتی کہ ماں بھی اس سے الگ ھوگئی ھے۔ وہ اپنے دل اور اپنی مجبوری میں بند ھو گئی ھے۔ جمال رات کی خنک زمین پر تنہائی میں خاموش لیٹ گئی۔ اس کے تلے زمین بھی خاموش تھی۔

عطا بابا تعاقب سے لوٹ پڑا۔ اب وہ ایران پر پچھلے چھاپے کے مقابلے میں کافی بوڑھا ھوگیا تھا اور پھول گیا تھا۔ اس نے جمال کو دیکھا، اس کے جوان اور قابل‌افسوس جسم کو۔ وہ اسکی روٹیاں کھا کر بڑی ھوئی تھی اور اب جوانی سے غمگین

ہوگئی تھی۔ عطا نے اسکو زمین سے اٹھا کر، اسکا
چھوٹا سا، بےبس جسم دبا لیا اور اسکو صحرا میں
دور لے گیا۔ جمال اپنے ناخنوں سے عطا بابا کا گلا
نوچتی رہی لیکن اگر اس وقت کوئی اسکا سر بھی دھڑ
سے جدا کر دیتا تو وہ لڑکی کو نہ چھوڑتا۔ اسی لئے
اس نے لڑکی کی اس حرکت پر درد نہیں محسوس کیا۔
وہ ہوس کے ساتھ گھاس اور اسکے بالوں کی مہک سے
لطف اٹھا رہا تھا۔

دوسرے دن جمال گھر نہیں لوٹی۔ وہ صحرا
میں دور چلی گئی۔ وہاں وہ خود ساختہ گیت
گاتی رہی۔ اب وہ زندہ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ صحرا
کے بعد نئی زمین شروع ہوگئی تھی جو ریت اور
اچھی مٹی سے ملی جلی تھی۔ یہاں گھاس گھنی
تھی اور بھیڑیں اسکو زیادہ زوروں سے کترتی تھیں۔

شام کو جب جمال جاگی تو ماں اسکو پا چکی
تھی۔ وہ اسکو جگا کر گھر لائی کیونکہ عطا بابا
نے اسکو فروخت کر دیا تھا اور اسکو نصف زر
مہر مل چکا تھا یعنی چار سو روسی روبل اور
مختلف قسم کے ساٹھ مویشی۔ جمال کا شمار
دوغلوں میں کیا گیا یعنی وہ خالص ترکمان نسل کی
نہ تھی اور اسکی قیمت کرد عورت کے حساب سے
لگائی گئی۔

اسکا منگیتر بوڑھا اداقرا بابا کے ساتھ قالین
پر بیٹھا ریگستان میں زندگی کے عام دھارے پر
رائےزنی کر رہا تھا۔ اس بارے میں کہ حسن قلی
اور آمودریا کے کنارے کیا ہورہا ہے، کہ بخارا

میں پھر غلاموں کا بازار کھل گیا ہے۔ اداقرا بڑا جانکار تھا لیکن اس نے کہا کہ اسکی سمجھ اب داڑھی میں گڈمڈ ہونے لگی ہے کیونکہ اسکی تسکین و تسلی کے لئے نوجوان بیوی کی کمی ہے۔

عطا بابا نے اس سے اتفاق کیا کہ تسکین کے بغیر کسی کے لئے بھی زندہ رہنا ممکن نہیں۔ آنسو نکلنے سے تو جان نکلنا ہی بہتر ہے۔

''لیکن ادا تو نے تو ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے قربان نیاز کے خیمے سے بیوی لی تھی،، عطا بولا ''وہ ابھی بوڑھی نہیں ہوئی اور اسکی صورت بھی اچھی ہے۔،،

''ہاں میں نے اسکو لیا تھا،، اداقرا نے تسلیم کیا ''لیکن ایک اور ہو جائے۔ میرے خاندان میں چھ بوڑھی بیویاں تھیں۔ ایک مرگئی۔ لیکن بھیڑوں نے میمنے دئے اور گدھیوں کے بھی بچے ہوئے ہیں۔ اب انکی دیکھ بھال کون کریگا؟ بڑی بیویاں بوڑھی ہوتی ہیں اور پھر مرجاتی ہیں۔ دو جوان بیویاں چاہئیں تاکہ وہ جلدی نہ مریں۔،،

''تم نوجوانوں کی قیمت کم لگاتے ہو،، عطا بابا نے کہا ''اور زر مہر بھی ایک بار میں نہیں ادا کرتے۔،،

''نہیں، زیادہ دیتا ہوں قیمت،، اداقرا نے اعتراض کرتے ہوئے کہا ''میں نے بہت سوچا کہ میں کس کو بیوی بناؤں۔ تین ایسی بوڑھیوں کو جو مدتوں سے میری عادی ہوچکی ہیں یا دو نوجوانوں کو۔ لیکن بوڑھیاں تو گوشت چبا نہیں پاتیں، بس

بہت سا نگل لیتی ہیں اور نوجوان کھاتی کم ہیں اور پریشان زیادہ ہوتی ہیں۔ میں نے جوان ہی بیویاں لینے کا فیصلہ کیا۔''

عطا بابا ہنسا تو اداقرا نے بھی ٹھٹھا مارا۔

''پریشان تو ہونگی تمھاری نئی بیویاں۔ بوڑھے، تیرے میں محبت کرنے کی سکت بھی رہ گئی ہے ان کے لئے؟''

''میری دو بیویاں ایسی ہیں جن سے میں نے کبھی تعلق نہیں رکھا'' مسکراتے ہوئے ادا نے کہا ''وہ میرے گھرانے میں تیس سال سے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا: 'بڑھیو! تمھاری محبت کہاں ہے، وہ کہاں چلی گئی...''

''تو پھر انھوں نے کیا کہا؟'' عطا نے مسکراکر پوچھا۔

''انھوں نے کہا کہ محبت آنسو اور پسینہ بن کر ریت میں چلی گئی۔ اور میں نے ان سے کہا: 'نہیں، بہتر ہوگا کہ میں جاکر اسکے بارے میں پرانے گدھوں اور کتوں سے پوچھوں!''

زرین تاج اور جمال برج کے دامن میں، خیمے کے در کے پاس بیٹھی یہ باتیں سن رہی تھیں۔ بوڑھی ہوتی ہوئی ایرانی عورت نے روتے ہوئے اپنی بیٹی کو کلیجے سے لگا لیا۔ جمال بھی ماں سے پیار کرنے لگی۔ رات کو جو کچھ ہوا تھا اسکی خفگی دور ہوگئی۔ اس کا بچکانہ دل ابھی باتوں کو جلد بھول جاتا تھا۔

''ماں، ھمارے یہاں اندھیرے سے مہمان آیا تھا۔ جب تم عطا کے ساتھ سورھی تھیں،، جمال نے کہا ''وہ صحرا میں بھاگ گیا۔ ،،

زرین تاج نے بتایا کہ دوسری عورتیں ریگستان کے اس تنہا مہمان کے بارے میں سن چکی ھیں۔ وہ دور، اس علاقے میں، جہاں جنگل اور جھیلیں ھیں، روسیوں کے ساتھ ملکر لڑرھا تھا۔ اسکو روسی ایک چھاپے میں لے گئے لیکن وہ ان کے ساتھ سے ریگستان میں بھاگ آیا اور اب فرار و خوف کی حالت میں رھتا ھے۔

''مطلب یہ کہ وہ جلدھی مرجائیگا۔ اسکے پاس شاید کچھ کھانے کو تو ھے نہیں!،، جمال نے قیاس آرائی کی۔

''وہ دو سال سے بھاگا ھوا ھے،، ماں نے کہا ''وہ مٹی سے برتن بنا کر خانہ بدوشوں کے راستے پر رکھ دیتا ھے جسکے لئے اسکو مردہ بھیڑیں دے دیتے ھیں اور برتن لے لیتے ھیں... ادا کہتا تھا کہ یہ مہمان گاؤں میں جا کر چائے خانے کے سماوار ٹھیک کرتا ھے اور دوسروں کے کپڑے سی کر اپنا پیٹ بھرتا ھے...،،

جمال سوچنے لگی۔ اسکو پراسرار زندگی، وسعتیں اور دوردراز کا وہ شور اپنی طرف کھینچ رھا تھا جو اسکو کئی بار سنائی دیا تھا جب وہ زمین سے اپنا کان لگا کر سوئی تھی۔ زرین تاج اٹھ کھڑی ھوئی کہ وہ اندر جا کر مہمان اور شوھر کو اور چائے دیدے لیکن اچانک اسکے سامنے اندھیرا چھا گیا

اور اسکی قوت سلب ہوگئی۔ وہ اس قالین تک نہیں پہنچ سکی جہاں اداقرا بیٹھا تھا اور وہ بے ڈھنگے پن سے مہمان کے قریب ڈھیر ہو گئی۔ بے رحم موت کی نمی اسکے ہونٹوں پر آ گئی۔ اداقرا اچھل پڑا اور ڈرکر چلا گیا اور عطا بابا نے بیوی کو پیر سے ٹھکرایا کہ وہ اسکی طرف سے اپنا بھیانک چہرہ موڑلے۔ زرین‌تاج نے خود ہی کروٹ لے لی اور خاموش ہوگئی۔ اس نے ایسی گرمی محسوس کی جو اسکی تھکی ہوئی ہڈیوں کو اور اندر تک جلا رہی تھی اور اسکے لئے وہ بیماری اور تھکن سب آسان ہوگئیں جو مدتوں سے اسمیں تناؤ پیدا کررہی تھیں، اسکو ٹہوکے دے رہی تھیں۔

(٦)

صبح کو خانہ‌بدوشوں کی خیمہ‌گاہ اکھڑ کر ویران ہوچکی تھی۔ عطا بابا نے رات ہی حکم دے دیا تھا کہ گلے کو ہنکا لے جایا جائے اور روزمرہ کے استعمال کی ساری چیزیں اور ملکیت وہیں چھوڑ دی جائے۔ جرگہ طاعون کی بیماری سے بھاگ رہا تھا جسمیں زرین‌تاج قدیم برج میں مبتلا ہو گئی تھی اور اب یہاں ایک صدی تک لوگ نہیں آئیں گے کیونکہ ریگستان کے لوگ افواہوں پر گذر کرتے ہیں اور ان کو مدتوں تک یہ یاد بھی رہتی ہیں۔ جمال ایک گھسے ہوئے قدمچے پر لیٹی تھی جہاں کبھی پتھر کا زینہ رہا ہوگا۔ اس نے اپنے کو برج

کے اوپری کمرے میں چھپا لیا تھا۔ وہاں فرش پر لکڑی کا چمچہ، روٹی کا ایک، ٹکڑا پڑا تھا اور تین غیرمکمل برتن بھی۔ غالباً یہیں اجنبی مہمان چھپ کر رہتا تھا اور وہ پھر ریگستان میں بھاگ گیا تھا۔

زینے پر ذرا اترکر جمال نے دیکھا کہ نیچے ماں کے قریب کیا ہورہا ہے۔ زرین تاج تن تنہا پتھریلے فرش پر پڑی تھی۔ اپنی دکھ بھری موت کے احساس سے وہ سیاہ اور پرسکون ہوگئی تھی۔ اسکو دور سے کھڑی ہوکر دیکھنے زلیخا آئی۔ یہ ایک اور ایرانی عورت تھی جسکو جوانی میں زرین تاج کے ساتھ ہی اغوا کیا گیا تھا۔ پھر ایک ایرانی قاسم اور دو دھقان مزدور آگار اور لالہ آگئے۔ انھوں نے اس پتھر کو چھوا جس پر مرتی ہوئی عورت پڑی تھی اور پھر اس طرح چلے گئے جیسے وہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہے ہوں۔ جمال ماں کے پاس آنے سے ڈر رہی تھی کیونکہ اسکو وہاں سے پکڑکر لے جانے کا امکان تھا۔ وہ اس وقت کا انتظار کر رہی تھی جب لوگ دور نکل جائیں گے۔

جب سب چلے گئے تو عطا بابا نے اپنی جائے رہائش کو افسوس کے ساتھ دیکھا کہ قالین، نمدے اور برتن ہاتھ سے جاتے رہے۔ اس نے زرین تاج سے دور کھڑے ہوکر اونچی آواز میں اپنی وہ بات کہی جو عام طور پر مرنے والے سے بوسوں کے درمیان چپکے سے کان میں کہی جاتی ہے تاکہ مرنے والا اس کو یاد رکھے اور موت کے بعد آسمان پر خدا تک پہنچائے۔

''مہربانی کرکے وہاں خدا سے کہنا، تیرے لئے تو یکساں ہے، تو مر رہی ہے نا۔ وہاں کہنا کہ میں دنیا میں اکیلا رہ گیا ہوں! بھیڑیں کم ہوگئی ہیں، وہ مررہی ہیں۔ میں اکیلا ہی ان کی دیکھ بھال کر لونگا۔ دوسرے لوگوں کو روح بن کر آسمان پر خدا کے ساتھ رہنے دیا جائے، جہاں تو رہےگی!،،

وہ چلا گیا، لیکن جلد ہی واپس آیا، اداقرا کے ساتھ تاکہ جمال کو ڈھونڈھ کر اپنے ساتھ لے جائے جس کے لئے زروسال میں ادائیگی ہوچکی تھی۔ اب جمال بھاگ کر نیچے آئی اور اپنی پوری قوت سے ماں کو چمٹا لیا۔ زرین‌تاج میں ابھی کچھ سانس باقی تھی، ابھی جان نہیں نکلی تھی۔

اداقرا اور عطا بابا دونوں ایسی دلھن کو جو طاعون سے بغل گیر تھی، اپنے ساتھ لےجانے سے ڈرگئے اور اپنے مشترکہ نقصان پر لعنت ملامت کرتے چلے گئے۔ ایک کو پورا زرمہر نہیں ملا تھا اور دوسرے نے جو کچھ ادا کیا تھا وہ رائگاں گیا تھا۔

''پیغمبر صاحب نے کہا ہے کہ موت لوگوں کے درمیان بڑی جدائی ہے،، اداقرا بولا ''اور میرے لئے وہ بھیڑوں سے جدائی بن گئی۔،،

(۷)

سب لوگ، گلہ اور کتے دور نکل گئے۔ صحرا بھی ترکمانی آسمان کی طرح خالی اور سنسان ہوگیا۔ جمال ان چیزوں سے گھر گرھستی بنانے لگی جو

یہاں چھوڑ دی گئی تھیں - اس نے چھ بھیڑوں کی صاف کی ہوئی راسیں پائیں جن میں سے کچھ ہی حصہ کھانے کے لئے استعمال ہوا تھا اور باقی موت سے بھاگتے ہوئے چھوڑدی گئی تھیں - جمال نے ماں کے لئے شوربہ بنا کر اسکو کھلایا - زرین تاج میں ابھی کچھ جان تھی - وہ بالکل زندہ ہونے سے ڈر رہی تھی کیونکہ پھر فوراً مرنا ممکن نہ ہوگا - شام کو جمال نے برج کی بلندی سے ریگستان پر نظر ڈالی - اسکو انتظار تھا کہ وہ مہمان آئیگا جو کہیں ریگستان میں بھاگ گیا ہے - لیکن کوئی نہیں آیا - صحرا میں وہ گھاس اڑ رہی تھی جو یہاں سے غائب ہوکر کہیں آگے ایسی جگہ جائےگی جہاں وہ جڑ پکڑکر اگ سکے -

سورج غروب ہوگیا اور پھر نکلا - وقت گذرتا گیا تاکہ ہر انسان اپنے دل میں ابلتے ہوئے کرب کا عادی بن جائے - زرین تاج ٹھیک ہوگئی، چلنے پھرنے اور پہلے کی طرح رہنے لگی -

جب ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں رہ گیا تو زرین تاج بیٹی کے ساتھ صحرا میں چل پڑی تاکہ وہ کاروانوں کے خراسانی راستے تک پہنچ جائیں - لیکن صرف آدھا صحرا طے کرکے زرین تاج زمین پر بیٹھ گئی - اس سے آگے نہیں چلا گیا -

''اماں، آؤ ہم تم مر رہیں،، جمال نے کہا - اس نے ماں کے برابر لیٹ کر صبر سے آنکھیں بند کرلیں -

''تم بھی آنکھیں بند کر لو اور مجھ کو نہ دیکھو!،، جمال نے التجا کی ''اس طرح ہم جلد مرجائیں گے۔ اب دیکھنے کو کیا رہ گیا ہے۔ کچھ نہیں۔ ہم سب دیکھ چکے ہیں...،،

جمال نے ماں کو لپٹا لیا اور محسوس کیا کہ وہ بالکل بوڑھی، سوکھی اور چھوٹی ہوگئی ہے — اس سے بھی چھوٹی۔ اس نے ماں کو حرکت دینے کی کوشش کی، وہ ھلکی تھی، سوکھی ٹہنی کی طرح۔

جمال کھڑی ہوگئی اور اس نے ماں کو اٹھا لیا۔ وہ اسکو لیکر صحرا میں جارھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ وہ کچھ ھی دیر کی مہمان ہے۔ شام تک جمال صحرا میں زرین تاج کو ریگستان کے سرے تک لائی اور ایک گرم نشیب میں اسکے ساتھ ھی رات کو لیٹی۔

صبح کو انھوں نے دیکھا کہ وھی اجنبی آدمی ان کے قریب بیٹھا ہے۔ اس نے ماں اور بیٹی دونوں سے صاحب سلامت کی اور اپنے تھیلے سے بھیڑ کے گوشت کا ایک ٹکڑا نکال کر ان کو دیا۔ جمال فوراً جان گئی کہ یہ وھی ریگستان والا مہمان ہے اور خوش ہوئی۔ مہمان ترکمان نہ تھا اگرچہ وہ ترکمانی زبان میں باتیں کرتا تھا۔ اس کا لباس بھورا تھا اور کافی پھٹا پرانا۔ اسکا جوان اور صاف چہرہ رنج و غربت کا عادی لگتا تھا۔

''تم کون ہو؟،، جمال نے اس سے پوچھا۔

''میں آسٹریائی ہوں، استیفان کاتیگروب،، آوارہ مہمان نے کہا ''اور تم؟،،

جمال نے آسٹریا والوں کے بارے میں کبھی بھی نہیں سنا تھا۔ اس نے صرف دوبار دیکھا تھا کہ لوگ کیسے مستقل آباد بستیوں میں رہتے ہیں۔ وہ ابھی تک اس بات سے ناواقف تھی کہ دنیا میں شہر، کتابیں، جنگ، جنگل اور جھیلیں بھی ہیں۔

جب جمال کاتیگروب کے ساتھ باتیں کررھی تھی اور کچھ کھا کر ہنس رہی تھی، زرین تاج جو اکیلی ریت پر لیٹی تھی خاموشی سے مر گئی۔

تھوڑی دیر بعد جب جمال نے ماں کو کچھ کھلانا چاھا اور پکارا تو ایرانی عورت نے جواب نہ دیا۔ جمال نے اسکے پاس جا کر اسکو ٹٹولا۔ اس نے اسکا لباس اٹھا کر اسکا سینہ دیکھا۔ وہاں دو سیاہ مردہ کیڑے سے چمٹے تھے جو سینے کے اندر تک اتر گئے تھے۔ یہ ان چھاتیوں کی باقیات تھیں جنھوں نے کبھی اس کو غذا پہنچائی تھی۔ ماں کی پسلیوں کی کھال سوکھ کر اندر گھس گئی تھی اور دل کا نشان بھی نہ تھا، اب وہ دھڑک نہیں رہا تھا۔ اسکا سارا سینہ اتنا چھوٹا سا تھا کہ اسمیں صرف کوئی تھوڑی اور سوکھی ھی چیز ھوسکتی تھی۔ بڑھیا کے لئے کبھی خوشی محسوس کرنے کی کوئی بات ھی نہیں ھوئی تھی، اسکی ساری قوت تو صرف کرب و درد برداشت کرنے کے لئے ھی تھی۔ یہ سینہ کچھ کر ھی نہیں سکتا تھا — نہ محبت، نہ نفرت اور اسکے اوپر سر جھکانا اور رونا بالکل بجا تھا۔ کنیز مرچکی تھی۔

کاتیگروب ایک طرف کھڑا دیکھ رہا تھا کہ بیٹی اپنی ماں کے مردہ جسم کو کیسے سہلا رہی ھے۔ وہ خیالات اور رنج میں ڈوب گیا۔ پھر جب جمال اپنی خوش قسمتی کے بارے میں ماں کے کان میں آسمان پر درخواست کرنے کے لئے کہہ چکی تو استیفان کاتیگروب مرنےوالی کے قریب گیا تاکہ اسکو اٹھاکر دفن کرنے کے لئے لے جائے۔ زرین تاج کے بدن سے نہ تو کوئی بو آرھی تھی اور نہ اسمیں کوئی حرارت تھی۔ کاتیگروب نے اسکی لاش کی اس طرح تحقیقات کی جیسی معدنیات کی ھوتی ھے۔ اسکا دل بھاری ھوگیا اور اس نے تلخی محسوس کی۔ وہ خود رو دیا اور دوسری طرف منہ کرلیا... کہیں اسکا وطن تھا، جنگ ھونے لگی، اس نے ھر چیز سے فرار اختیار کی اور مدتوں سے چھپا ھوا تھا اس ویرانے میں جسکی ھڈیاں مدتوں ھوئے راکھ ھو چکی تھیں اور راکھ ھوا میں منتشر ھو گئی تھی۔ وہ وی‌آنا کا ماھر بصریات تھا اور اب اسکو سراب ھی سراب دکھائی دیتے تھے جو روشنی ور زندگی کی بےثباتی میں غائب ھوجاتے تھے۔

کاتیگروب اپنے خیالات سے چونکا۔ اس کے سامنے جمال منتظر کھڑی تھی۔ اگرچہ وہ غم و اندوہ، بھوک اور غلامی میں پلی بڑھی تھی لیکن وہ جاندار، صاف ستھری اور متحمل تھی۔ کاتیگروب نے اسکو اپنے ھاتھوں میں اٹھا لیا اور اسکی سیاہ اور قابل‌اعتماد آنکھوں کو بوسہ دیا۔

رات کو کاتیگروب مرحوم زرین تاج کو صحرا کی حد سے باہر لے گیا اور وہاں اسکو ایک ریتیلا گڈھا کھود کر دفن کردیا۔ اوپر اس نے ریت کا ایک تودہ بنا دیا۔ لیکن اسکو ہوا جلدھی مٹا سکتی تھی، اسی لئے آسٹریائی سپاھی نے صحرا کی مستقل حد سے اس جگہ کی قدموں سے پیمائش کی۔ وہ نہیں چاھتا تھا کہ انسان کو موت کے بعد بھی فراموش کیا جائے۔ اس پیمائش کو اس نے اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا۔

جمال اسی جگہ سوگئی تھی جہاں اسکی ماں مری تھی۔ کاتیگروب نے اسکو جگایا اور اسکو صحرا کے بیچ میں واقع برج تک لایا تاکہ وہ وہاں رہ سکے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ترکمان یہاں جلدی نہ آئیں گے۔ جب یورپ میں ایک جنگ ختم ہوجائے گی تو ممکن ھے دوسری شروع ہو جائے اور اس وقت تک اسکی زندگی تنہائی میں تمام ہوچکی ہوگی۔

دوسرے دن کاتیگروب نے جمال کو برج میں تنہا چھوڑا اور اسکو وہ کھانا دے دیا جو اسکے تھیلے میں باقی رہ گیا تھا۔ وہ خود سو کلومیٹر کے فاصلے پر خیوا کے کاروانوں کے راستے کے لئے روانہ ہوگیا جہاں برقان کا کنواں تھا۔

وہاں وہ چھ دن تک رھا۔ ادھر سے سوداگروں کے دو کارواں گذرے۔ اسکے بعد پیدل چور اور مفرور تھے جو بحیرۂ کیسپین کے علاقے میں چھپنا چاھتے تھے۔ کاتیگروب ھر ایک کی ضرورت کے کام کرتا اور معاوضے میں بھیڑ کا گوشت، چاول، پیاز،

دیاسلائی اور شراب پاتا ۔ وہ جوتوں، راستے کی ضرورت کی چیزوں کی مرمت کرتا، بیمار اونٹوں اور گدھوں کے دوائیں لگاتا، کرتب اور تماشے دکھاتا اور کہانیاں سناتا ۔

عام طور پر وہ نویں یا دسویں دن جمال کے پاس کھانا اور محنت سے کمائے ہوئے پیسے لیکر لوٹتا ۔ ایک بار وہ بیمار گدھا لایا جسکو کارواں چھوڑ گیا تھا اور جمال نے اسکا علاج کرکے اسکو سدھایا ۔ دوسری بار کاتیگروب لڑکی کے لئے بحیرۂ ارال کی سیپیوں کا ہار لایا اور اسکے ہونٹوں کو چوما ۔ جمال اسکے جذبات کو رد نہیں کرتی تھی لیکن خود بےتعلق تھی ۔ وہ نہیں سمجھتی تھی کہ مرد سے کیوں محبت کی جائے ۔ وہ اپنی متوفی ماں اور اپنے قبیلے کی دوسری عورتوں کو یاد کرتی ۔ ان میں سے بہت سی شوہر کے مرنے پر اپنے رومال پانی سے بھگو لیتی تھیں تاکہ وہ خشک آنکھوں کے لئے آنسوؤں کی نمی پیدا کر سکیں ۔

(۸)

وہ ایک ساتھ چھ سال تک رہے ۔ مٹیالے برج کے سامنے پھیلا ہوا صحرا اب بھی پہلے کی طرح کسی آواز اور زندگی سے عاری تھا، جمال کی تقدیر کی طرح ویران ۔ استیفان کاتیگروب بھی پہلے کی طرح وقتاً فوقتاً کاروانوں کے راستے پر جاتا، لیکن کارواں غائب ہوگئے تھے ۔ اب شاذ ہی وہ آدھا تھیلا چاول یا بھیڑ کا گوشت کما پاتا ۔

ایک روپہلی رات میں، جب کاتیگروب نہ تھا جمال نے دور بندوقیں چلنے کی آواز سنی۔ اس نے خنجر، دیاسلائیاں اور کچھ چاول لئے اور گدھے پر بیٹھ کر اسی سمت روانہ ہوگئی جہاں سے بندوقوں کی آواز آرہی تھی۔ وہ ساری رات اور سارے دن شام تک چلتی رہی اور اسکو کوئی نہ ملا۔ گدھا بھی اس بے کنار گرم ریگستان میں تھک کر رک گیا۔ جمال نے اسکو آگے بڑھنے پر مجبور کیا تاکہ کسی آدمی سے اسکی مڈبھیڑ ہوجائے یا وہ کوئی کنواں تلاش کرلے۔

رات کو جمال کہیں پڑرہی اور صبح پھر اپنے گدھے کو لیکر آگے بڑھی۔ شام کو وہ ایک چھوٹے میدان تک پہنچ گئی جسکے قریب چرخی‌دار کنواں اور چھاگل تھا۔ جمال نے پانی بھرا۔ گدھے نے پانی پینا شروع کیا اور تین چھاگل پی گیا۔ خوب پانی پی کر گدھا مر گیا۔ جمال جانتی تھی کہ کل وہ بھی مرجائےگی۔ اسکو صرف یہ افسوس تھا کہ ماں دور لیٹی ہوگی۔

رات کو جمال پر غفلت کی حالت طاری ہوگئی اور یہ حالت برابر جاری رہی۔ وہ بھول گئی کہ وہ زندہ ہے اور بےسمجھے بوجھے عجیب حرکتیں کرنے لگی۔ کبھی اٹھتی اور چلنے لگتی، پھر لیٹ جاتی، پھر بھاگتی، مسکراتی، روتی اور ہر وقت اسکو بھولی بسری، تاریکی میں کھوئی ہوئی، دور کی چیخ جیسی باتیں یاد آتیں اور وہ انکی طرف ھاتھ بڑھاتی۔

رات کو اسے ایسا لگتا جیسے ہزاروں آدمی صحرا میں دوڑ رہے ہیں، بندوقوں اور چیخوں کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ وہ انکے پیچھے خنجر لے کر دوڑتی، یہاں تک کہ گرجاتی اور اپنی خراب حالی اور تنہائی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔

ایک بار وہ جاگی تو پرسکون تھی۔ خنکی تھی۔ چاند اسکے چہرے پر چمک رہا تھا اور اسکے اردگرد لوگ چپکے چپکے باتیں کررہے تھے۔ یہ تھے عطا بابا، اداقرا اور چار دوسرے لوگ جنکو وہ نہیں پہچانتی تھی۔ صحرا کے پار ریگستان میں گھوڑے چر رہے تھے جن پر کاٹھیاں کسی تھیں، چھوٹا سا الاؤ جل رہا تھا اور اس کے اوپر دیگچی میں پانی ابل رہا تھا۔

جمال اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کو دیکھ کر نہ کسی کو خوشی ہوئی اور نہ حیرت کہ وہ زندہ اور سلامت ہے۔ غالباً ان لوگوں کی اپنی مشترکہ فکریں تھیں۔ پھر بھی اداقرا نے جمال کو روٹی کا ایک ٹکڑا دیا۔ اس نے ان بندوقوں پر نظر ڈالی جو ہر ایک کے قریب پڑی ہوئی تھیں۔ ان لوگوں نے اس سے پوچھا کہ آیا اس نے سرخوں* کو کہیں دیکھا ہے یا نہیں۔ لیکن جمال کو یہ تک پتہ نہیں تھا کہ یہ کیا چیز ہے۔ پھر بھی عطا کو اس

---

*۱۹۱۷ء میں روس کے عظیم اکتوبر سوشلسٹ انقلاب کے بعد ترکستان میں سوویت اقتدار کے سارے حامیوں کو 'سرخ' کہا جاتا تھا۔

پر اعتبار نہ آیا۔ ''ارے، تو ہی کنوؤں میں زہر ملاتی ہے،، وہ چیخا۔

''نہیں،، جمال نے کہا۔

''جھوٹ بولتی ہے، جاسوس کہیں کی،، عطا نے اس کی بات کا یقین نہ مان کر کہا ''دوغلی حرامزادی، سبھی غلام سرخ ہیں!،،

''مجھے پینے کو دو،، جمال نے التجا کی ''دیگچی میں پانی بھاپ بن کر اڑا جا رہا ہے۔،،

''کل پینا،، عطا بابا نے کہا ''یہ پانی تیرے لئے کھاری ہے۔،،

وہ چائے پینے لگے اور دیگچی کا سارا پانی پی گئے۔ جمال نے انکی طرف سے پیٹھ موڑ لی اور غصے نے اسکی پیاس بجھا دی۔

صبح کے قریب سب سو گئے۔ صرف اداقرا گھوڑوں اور بندوقوں کی حفاظت کے لئے جاگتا رہا۔ لیکن یہ یاد کرکے کہ جمال تو اسکی زرخرید بیوی ہے، اداقرا اس کے قریب آکر لیٹ گیا۔ پھر جب اس نے اسکو اپنے دونوں ھاتھوں میں بھر کر زور سے لپٹایا تو جمال نے اسکی داڑھی پکڑ لی اور اپنا خنجر اسکے گلے میں گھونپ دیا۔

اداقرا چیخنے کے بجائے اپنے آخری الفاظ صرف مری ہوئی آواز میں کہہ سکا اور مر گیا۔

جمال نے مردے کو اپنے سے پرے ہٹایا اور کہنیوں پر اٹھ بیٹھی۔ باقی پانچوں آدمی سو رہے تھے۔ چاند صبح کے آسمان پر غروب ہورہا تھا۔ ہر طرف فراخ اور صاف ستھرا تھا۔ جمال نے فیصلہ

کیا کہ اگر اسکی ماں جو کنیز تھی مرچکی ہے تو
ان سب آزاد اور امیر لوگوں کو بھی اسی ریگستان
میں مرنا چاہئے۔

جمال اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بےدھڑک
گھوڑوں کے بندھن کھول دئے، سونےوالوں کی بندوقیں
لیکر یکجا باندھیں تاکہ وہ منتشر نہ ہوں اور ان
کو اپنے پاس زین پر آڑا کرکے رکھ لیا۔ پھر جمال
نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ریگستان میں سرپٹ
روانہ ہوگئی۔ صبح نے ریگستان کو تازہ کر دیا
اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ شبنم پی کر سیر
ہوگیا ہے۔ آزاد گھوڑے بھی، جو مدتوں سے پیاسے
تھے ان کے پیچھے چل پڑے۔ وہ زوروں سے دوڑ رہے
تھے کیونکہ انکا خیال تھا کہ ان کو پانی ملےگا۔

دو تین گھنٹے بعد اسکی مڈبھیڑ سرخ فوج کے
پھریدار سوار دستے سے ہوگئی جس نے اسکے ھتیار
لے لئے اور اس سے عطا بابا کے گروہ کے بارے میں
بتانے کو کہا۔

(۹)

اس واقعہ کے بعد وہ مدتوں یعنی دس سال تک
مٹیالے برج‌والے صحرا نہیں گئی۔ وہ اس سارے عرصے
عشق‌آباد اور تاشقند میں رہی جہاں اس نے زراعتی
کالج کی تعلیم سے فراغت حاصل کی۔

جمال تاجیئوا نے (یہ خاندانی نام اس نے اپنی
ماں کے نام سے لیا تھا) آسٹریائی جنگی قیدی کاتیگروب

کے بارے میں دریافت کرایا لیکن اسکی کوئی خبر نہ ملی۔

جمال کو یہ معلوم تھا کہ کہیں زاؤنگوسک نشیب کے قریب پرانے پودوں کا محفوظ پود گھر ہے اور وہاں صرف ایک آدمی اپنے دو کتوں کے ساتھ رہتا ہے۔ غالباً وہیں مٹیالا برج اور بڑا صحرا بھی تھا۔ لیکن اسکو وہاں جانے کا وقت نہیں ملتا تھا اور وہ سال بسال وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کرتی رہتی تھی۔

ایک بار رواں موسم بہار میں تاجیئوا کو یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ کہیں قراقوم کے قلب میں باغبانی پر تجربات کے لئے جگہ مقرر کرے۔ جمال تاجیئوا نے اپنا یورپی بلاؤز اور اسکرٹ اتار کر سیاہ لباس پہنا اور سر پر سفید باریک رومال باندھ کر صبح کو گھوڑے پر عشق آباد سے تن تنہا چل پڑی۔ اس کے پاس ریگستان کے دس کلومیٹر کا نقشہ تھا اور اس نے اسکے ذریعہ اندازہ لگایا کہ کہاں بڑا سا صحرا ہوگا۔ لیکن آگے چل کر وہ قدیم ریگستانی پودوں کے محفوظ پارک کی طرف چل پڑی۔ اسکو اس سے ماہر اور ریگستانی باشندے کی حیثیت سے دلچسپی تھی۔

پانچ دن کے اکتا دینے والے سفر کے بعد اس نے غیرمتوقع طور پر برج کا نیلا گنبد مع اسکے سنہرے سانپ کے اور اسکے گرد لافانی صحرا دیکھا۔

گھوڑے کی ٹاپیں سخت مٹی کی سلوں پر اس طرح گونج رہی تھیں جیسے وہ ہمیشہ جامد رہنے والی

سرزمین ہو - چاروں طرف اسی طرح افسردگی چھائی تھی جیسے وقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی اور خود جمال بھی وہ نوجوان اور غمگین لڑکی بن گئی جس نے شہر اور دریا نہیں دیکھے تھے، جو دنیا میں اس ہوا کے سوا اور کچھ نہیں جانتی تھی جو اس کے ویران دل کے اوپر سے گاتی ہوئی نکلتی تھی-

دو پہر کا وقت تھا، مئی کے سورج نے جمال کی ساری ریتیلی مٹیالی، بڑی، غم آمیز جنم بھومی کو اپنی روشنی سے چمکا رکھا تھا - وہ بھولے بسرے برج تک گئی جو کبھی غربت زدہ اور مرتے ہوئے لوگوں نے بنایا تھا - اس نے سوچا: صحرا بڑا ہے، اسکے قریب پرافراط میٹھے پانی والا کنواں ہے - میں یہاں آکر رہونگی، یہیں ہم باغ لگائیں گے، یہیں تو میرا غریب وطن ہے -

جمال برج کے اندر چلی گئی - پہلے کی طرح اب بھی نچلی منزل ویران اور خراب حال تھی - فرش کی سلوں پر کچھ کچلی ہوئی ہڈیاں بکھری تھیں اور کونے میں ایک انسانی ڈھانچہ پرانے چیتھڑا لباس سے ڈھکا تھا - اسکی ہڈیوں کو بےرحمی سے کچل دیا گیا تھا - جمال ڈھانچے پر جھک گئی - اسکی ہڈیاں مدتوں ہوئے سوکھ چکی تھیں، مڑی ہوئی کھوپڑی دیوار کو تک رہی تھی، کئی پسلیاں غائب تھیں اور سینہ کسی بڑے ہتوڑے کی ضرب سے ٹوٹا ہوا تھا -

لپٹے لپٹائے آسٹریائی جیکٹ میں اسکو جیب مل گئی - لیکن وہاں کوئی ایسے کاغذ یا نوٹ بک

نہ ملی جس سے وہ واقف ہو۔ بس باہر نکلنے والے راستے
پر کیمیائی پنسل سے جرمن زبان میں یہ لکھا تھا:
''تم میرے پاس آؤگی اور ہم ملیں گے، جمال!،،
''میں تمھارے پاس آگئی اور ہم مل لئے!،،
جمال کی واحد آواز نے گونجدار برج میں کہا جو
اپنی بلندی پر قائم تھا۔
برج سے نکل کر وہ چاروں صحرا میں گھومی
تاکہ وہ آئندہ باغبانی کے لئے آنکھوں سے دیکھ کر
کوئی منصوبہ بناسکے۔ کئی کلومیٹر کا فاصلہ طے
کرکے اس نے ایک طرف ریگستان میں خاردار تار
کا ایک گھیرا دیکھا اور ادھر چل پڑی۔ گھیرے
کے اندر نایاب گھاسیں اگی ہوئی تھیں اور کچھ
دور پر پہریدار کا چھوٹا سا گھر تھا۔ گھیرے
میں تین روسی صلیبیں انجانی قبروں پر لگی تھیں اور
معمولی اور قدرتی حالت میں ایک عمودی پتھر
نصب تھا۔ پتھر پر لاطینی حروف میں کھدا ہوا تھا
''بڑی جمال،،۔
جمال گھوڑے سے اتر پڑی اور خاردار تاروں
کے سامنے گھٹنوں پر جھک گئی۔ اس نے ایرانی رومال
سے اپنا چہرہ ڈھک لیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسکو
یہ کسی اور طرح سے کرنا چاہئے۔ اسکو اپنی ماں
کے یہ شکایت آمیز الفاظ یاد آئے جو اس نے کسی
کے بارے میں کہے تھے ''ارے یہ میرا غم کیسا
برا ہے، جو وہاں گیا، پھر واپس نہیں لوٹتا۔،،
اپنے چہرے سے رومال ہٹا کر اس نے ایک
قدیم زمانے کا پودا دیکھا جسکا تنا بھورا تھا جو

اسکی ماں کی قبر کے پتھر کے پاس اگا ہوا تھا۔ اس
نے اسکی تصویر دیکھی تھی اور اس سے پہچانتی
تھی اور نام اسکا بچپن کے حافظے نے یاد دلا دیا۔
لیکن وہ پودے کی اہمیت کو پہلے نہیں سمجھتی
تھی۔ اچھا تو وہ وہاں آگئی تھی جہاں آنا چاہتی
تھی — اور یہیں ان پودوں کا گھر بنا جو اس
دنیا سے غائب ہو رہے تھے۔

پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی آپ کا بہت شکرگذار ہوگا اگر آپ ہمیں اس کتاب، اس کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دے سکیں تو ہم ممنون ہوں گے۔

ہمارا پتہ: زوبوفسکی بلوار، نمبر ۲۱،
ماسکو، سوویت یونین۔
21, Zubovsky Boulevard, Moscow, USSR

دارالاشاعت ترقی سے شائع ہونے والی کتاب

شرف رشیدوف۔ فاتح (ناول)

"غیرملک قاری کے لئے سوویت ادب ایک کھڑکی ہے جس سے وہ ہماری زندگی، ہماری حیرت انگیز سوویت حقیقت کو دیکھ سکتا ہے" اس کتاب کے مصنف لکھتے ہیں۔ آپ ہیں مشہور ازبیک مصنف اور مدبر شرف رشیدوف۔

یہ کتاب آپ کو ازبیکستان کے اجتماعی فارموں کی سیر کرائےگی اور ناول کی ہیروئن سے متعارف کرےگی۔ یہ نوجوان ازبیک خاتون آئی قیز ہے جو جمود اور تعصبات کا بےجگری سے مقابلہ کرتی ہے۔ "جدوجہد محض مختلف نقطہ ہائے نظر کے درمیان تصادم نہیں ہے۔ انسان کا مقدر ناگزیر طور پر جدوجہد سے جڑا ہوا ہے اور محاذ کی لائن ہمارے دلوں سے گزرتی ہے"، مصنف لکھتے ہیں۔

اس ایڈیشن کے لئے پیش لفظ خاص طور پر لکھا گیا ہے۔

دارالاشاعت ترقی سے شائع ہونے والی کتاب

زلفیہ - نظموں کا انتخاب

زلفیہ (پیدائش ۱۹۱۵ء) سوویت مشرق کی نمایاں شاعرہ ہیں اور ازبیکستان کی قومی شاعرہ - وہ ممتاز سماجی کارکن بھی ہیں - ان کا نام نہ صرف سوویت یونین بلکہ اس کی سرحدوں سے دور دور بھی مشہور ہے -

زلفیہ امن کے مجاہدوں کی صف اول میں رہی ہیں - انھوں نے نیک مفاہمت کی غرض سے کئی مشرقی ملکوں کا سفر کیا ہے - ان کی شاعری محنت کش عورت اور ہمارے کرۂ ارض پر بسنے والی تمام قوموں میں دوستی کےلئے وقف ہے -

زلفیہ کی نظموں کا انتخاب پہلی بار اردو میں پیش کیا جارہا ہے - اس میں ان کی بہترین نظمیں شامل ہیں - یہ نظمیں ان کے مجموعوں ''میری فکر رسا،، اور ''آبشار،، سے چنی گئی ہیں جو ازبیک ریپبلک کا حمزہ نامی ریاستی اعزاز حاصل کر چکے ہیں - ان میں ہندستان کی بابت نظموں کا سلسلہ ہے جس پر زلفیہ کو نہرو انعام ملا ہے - انتخاب میں آپ زلفیہ کی تازہ ترین نظمیں بھی پڑھ سکتے ہیں -

کتاب کا دیباچہ مشہور سوویت شاعر کائیسین قلی ئیف نے لکھا ہے -